شریعت و طریقت
www.IslamicBooksLibrary.wordpress.com
حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ
مکتبۃ الحق

ایک ضروری گزارش

اس کتاب کو ای بک بنانے میں ہماری غرض صرف اتنی ہے کہ کوئی اللہ کا مخلص بندہ اس کو پڑھ کر ہدایت پا جائے اور ہمارے لئے مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔

جن پبلشرز حضرات کی کتاب کو بغیر اُنکی اجازت کے ہم نے یہ کیا ہے ان سے عاجزانہ گزارش ہے کہ اللہ کے لئے ہم کو معاف کر دیں، اللہ سے قوی امید ہے کہ انشاءاللہ قیامت میں آپ کو اس کا بدلہ آپ کی توقع سے زیادہ دیکر آپ کو خوش کر دے گا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجلہ خلفاء کرام کی پسندیدہ کتاب

اَشْرَفُ الطَّرِيقَةِ فِي الشَّرِيعَةِ وَالْحَقِيقَةِ

شریعت و طریقت

مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ

ترتیب: جناب مولانا محمد دین صاحب چشتی اشرفی مدظلہم

اپنی اصلاح کی فکر رکھنے والوں کے لئے ایک اہم دستور العمل
شریعت اور طریقت سے متعلق حضرت حکیم الامت کی
مجددانہ تعلیمات پر مشتمل شاہکار کتاب

مَکْتَبَۃُ الْحَقّ

ماڈرن ڈیری، جوگیشوری، ممبئی ۱۰۲

تفصیلات

نام کتاب	:	شریعت و طریقت
تالیف	:	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ
ترتیب	:	جناب مولانا محمد دین صاحب چشتی اشرفی مدظلہم
صفحات		۴۴۹
قیمت		
باہتمام		محمد ارشد قاسمی
ناشر		مکتبہ الحق ماڈرن ڈیری جوگیشوری ممبئی ۱۰۲

ملنے کے پتے

● دارالکتاب دیوبند ● سنٹرل کتاب گھر دیوبند

● مکتبہ نگار دیوبند

فہرست مضامین

تقریظات

اور

اکابر اہلسنت والجماعت کے تاثرات

(۱)

شیخ وقت حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس اللہ سرہ

(۲)

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ

(۳)

حضرۃ الشیخ حضرت مولانا خیر محمد صاحب۔ برد اللہ مضجعہٗ

(۴)

استاذ الشیوخ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی قدس سرہ

(۵)

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کیمل پوری طاب ثراہ

(۶)

حضرت علامہ محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر رحمۃ اللہ علیہ

(۷)

جناب ڈاکٹر سید محمد حسن صاحب ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

(۸)

جناب مولانا عبدالماجد دریا آبادی (صدق جدید لکھنؤ)

(۹)

جناب مولانا سید انظر شاہ صاحب کاشمیری (دارالعلوم دیوبند)

اکابر اہل سنت والجماعت کے تأثرات

①

از عالیجناب قدوۃ السالکین، عارف باللہ، جامع الشریعت والطریقت، بربان حقیقت و معرفت، مخدوم العلماء والفضلاء، شیخ المشائخ سیدنا و مرشدنا مولانا مفتی محمد حسن صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور، خلیفہ ارشد حضرت مجدد الملت حکیم الامت الشاہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ہدیہ مبارکہ اشرف الطریقت المعروف بہ شریعت و طریقت کے چند صفحات دیکھے۔ دل بہت خوش ہوا۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ کسی تعریف کا محتاج نہیں بلکہ اس کتاب پر تقریظ لکھنا سوء ادب ہے۔ اس کتاب کو تائید کی ضرورت نہیں۔ حق تعالیٰ قبول فرمائیں اور اہل اسلام کے لیے ذریعہ قرب فرمائیں اور آپ کے لیے ذریعہ قرب اور صدقہ جاریہ فرمائیں۔ یہ کتاب ہر گدی نشین سجادہ نشین تک پہنچ جائے تو اچھا۔ انشاء اللہ مفید ہوگی۔"

②

حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع نور اللہ مرقدہٗ

عزیز محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"آپ کی مرسلہ کتاب مجھے وصول ہوگئی تھی دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ مگر سرسری دیکھ سکا خیال تھا کہ ذرا تفصیلی مطالعہ کے بعد آپ کو خط لکھوں گا لیکن میں اسی تمام عرصہ میں کچھ پریشانیوں میں مبتلا رہا۔ میری بڑی لڑکی سخت بیمار تھی وہ ۲۰ شعبان [illegible] کو سات بچے چھوڑ کر انتقال کر گئی۔ ان حوادث کی وجہ سے معمولی ڈاک کا جواب بھی نہیں لکھ سکا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا

فرمائے کہ آپ نے حضرت کے مواعظ اور خاص مضامین کا عطر نکال کر رکھ دیا
اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین

۸/۲/۰۵

والسلام
محمد شفیع عفی عنہ

(۳)

از عالیجناب امام العارفین، قدوۃ السالکین، حامیٔ سنت ماحیٔ بدعت خلیفہ ارشد حضرت مجدد الملت التھانویؒ۔ سیدنا و مولانا خیر محمد صاحب جالندھری دام فیوضہم مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان، و حضرت مولانا محمد عبد اللہ صاحب مفتی خیر المدارس ملتان۔

"شریعت اور طریقت" علم تصوف میں بے نظیر کتاب ہے۔ اس کے تمام مضامین حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کی تصانیف اور ملفوظات سے ماخوذ ہیں۔ مولانا محمد دین صاحب نے اس مبارک کتاب میں پہلے شریعت، طریقت و معرفت ہر ایک کا باہمی فرق بتلا دیا ہے۔ اس کے پڑھنے سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے جو عام طور پر مشہور ہے کہ شریعت اور طریقت دو متضاد امر ہیں۔

اس کے بعد تصوف کی ضرورت (سلوک اور طریقت کی اقسام) وغیرہ بڑی تفصیل سے ذکر فرمائی ہے۔ تیسرے نمبر پر بیعت کی ضرورت اور اس کا ثبوت احادیث سے اور دلائل عقلیہ سے، شیخ کامل کی پہچان، شیخ اور مرید کے درمیان مناسبت اور صحبت شیخ کی ضرورت اور اس کا طریق بیان فرمایا ہے۔ یہ چوتھا حصہ کتاب کا نہایت اہم ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں تین ابواب ہیں۔ باب اول میں ریاضت و مجاہدہ کی حقیقت اور متعلقات کا ذکر ہے۔ باب دوم میں اخلاق حمیدہ کی تفصیل اور ان کے حاصل کرنے کے لیے عمدہ عمدہ طریق اور آسان تدابیر بیان فرمائی ہیں۔ تیسرے باب میں اخلاق ذمیمہ (کبر، حسد، عجب وغیرہ) کی حقیقت اور ان سے بچنے اور علاج کے طریق بیان کیے گئے ہیں۔ پانچویں حصے میں ثمرات اعمال اور اس کے متعلقات۔ چھٹے حصے میں ذرائع اعمال مفیدہ بالخصوص ذکر و شغل پوری تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد احوال و معارف و حقائق، اصطلاحات تصوف اور سب سے آخر میں بہت ہی ضروری

(۵)

تقریظ لطیف از عالیجناب عارف باللہ رہبر کامل، جامع الشریعت والطریقت خلیفہ ارشد مجدد الملت حکیم الامت التھانوی جناب مخدوم مولانا عبد الرحمٰن صاحب کیملپوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور حال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ہدیہ مشتہر کر پہنچا ماشاء اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آپ نے دین کا بہت بڑا کام کیا ہے۔ بہت سے متفرق یاقوت اور جواہر جمع فرمائے ہیں اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرماویں۔ بعض بعض مقامات سے میں نے اس مجموعۃ الجواہر کو دیکھا نہایت مفید پایا۔ احقر کے نزدیک کیا بلکہ ہر متدین انسان کے نزدیک یہ علمی ذخیرہ نہایت ہی مفید اور قابل قدر ہے۔ حضرت کے متوسلین پر خصوصیت کے ساتھ بڑا احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول اور مفید فرماویں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

دعاگو و دعاجو عبد الرحمٰن غفرلہ

از پہوڑی ۱۰ / رجب ۱۳۷۵ھ

(۶)

تقریظ لطیف از عالیجناب فخر کشمیر حضرت العلامہ مولانا محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر واد لیسندی (بعد الحمد والصلوٰۃ) میں نے کتاب اشرف الطریقت فی الشریعت والحقیقت (المعروف بہ شریعت اور طریقت) کا مطالعہ کیا۔ یہ کتاب واقعی سلوک کی معرفت وسلوک کے اصول و فروع کا ایک جامع و مدلل ذخیرہ ہے جس کے مطالعہ سے تزکیۂ نفس، تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ اگر میں اس موقع پر لم یحتمل عین الزمان بمثلہ درج کروں کہ اس جیسی کتاب زمانے کی نگاہوں میں نہیں آئی، کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ خداوند کریم اس کتاب کے فیوض و برکات کو مسلمانوں میں عموماً و خصوصاً شائع و ذائع فرما کر اس کے مرتب و ناشر کو جزائے خیر عطا فرماویں۔

محمد یوسف شاہ میر واعظ کشمیر

تقریظ دلپذیر از فاضل اجل، عالم بے بدل عالی جناب ڈاکٹر پیر محمد حسن صاحب
ایم-اے- پی-ایچ-ڈی (عربی) پرنسپل گورنمنٹ کالج مظفرگڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی کی ذات بابرکات اور ان کے علمی تبحر سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے جہاں اپنے روحانی فیض سے لوگوں کو دین مستقیم کی راہ دکھائی وہاں اپنی تصانیف سے بھی ہزاروں گمشدگان راہ کو حق پر قائم کر دیا۔ انھوں نے تصوف میں متعدد کتابیں لکھیں۔ مولوی محمد دین صاحب نے طالبان راہ طریقت کے لیے ان تمام مضامین کو جو حضرت مولانا کی مختلف تصانیف میں بکھرے پڑے تھے یکجا کر دیا ہے اور اس طرح قارئین کو متعدد کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ کتاب کی عبارت دراصل حضرت مولانا ہی کی عبارت ہے لیکن مولوی صاحب نے جہاں کہیں عبارت میں ربط قائم کرنے کے لیے اپنی طرف سے کچھ الفاظ بڑھا دیے ہیں جنھیں انھوں نے قوسین میں لکھ دیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کتاب کو حضرت مولانا ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے۔

اس کتاب کی ترتیب دینے میں مولوی صاحب کے پیش نظر دو غرضیں تھیں۔ ایک اپنے شیخ سے اظہار عقیدت اور دوسرے یہ کہ شائقین تصوف زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔ اس کتاب میں تصوف کے ہر پہلو کے بارے میں بحث کی گئی ہے شاید ہی تصوف کا کوئی ایسا مسئلہ ہو گا جس پر اس کتاب میں بحث نہ کی گئی ہو۔ آج تک جس قدر کتابیں عربی اور فارسی میں تصوف پر لکھی جا چکی ہیں ان میں بہت سے مسائل پر جن کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔ بحث نہیں کی گئی۔ مزید براں حضرت مولانا کی فن تصوف کی تصانیف اب بازار میں کمیاب ہو رہی تھیں جس سے یہ خطرہ تھا کہ تصوف کے وہ مسائل جن کی تشریح انھوں نے ان کتابوں میں کی ہے کہیں معرض خفا میں نہ چلے جائیں۔ چنانچہ مولوی محمد دین صاحب نے حضرت مولانا کے بیان کو بغرض افادہ عام اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ ان کا یہ قصد انتہائی قابل ستائش ہے اور وہ صاحب تحسین ہیں۔

مجھے امید ہے کہ شائقین تصوف بالعموم اور مولوی صاحب کے برادران طریقت بالخصوص اس کتاب کے مطالعہ سے بہرہ اندوز ہوں گے۔

[illegible] العبد الفقیر
محمد حسن غفرلہ ۸/۱۲/۱۹۷۵ء

تبصرہ

ماہنامہ "صدق جدید لکھنؤ" ۱۴ اگست ۱۹۵۹ء

حضرت تھانویؒ فن طریقت پر اتنا کچھ لکھ گئے ہیں کہ اس سے الماریوں کی الماریاں کتب خانوں کی بھری جا سکتی ہیں۔ ضرورت اس کی تھی کہ سلیم المذاق شاگردوں یا مسترشدوں میں سے کوئی ہزارہا صفحات کے اس ذخیرہ کو سمیٹ کر حسن ترتیب کے ساتھ چند سو صفحات کے اندر لے آئے۔ خوشی کی بات ہے اور مبارکباد کا مقام ہے کہ اس اہم فرض کو محمد دین صاحب بڑی خوش اسلوبی اور بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ پورا کر گزرے ہیں اور سارے ذخیرے کو پانسو صفحے کے اندر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ شریعت و طریقت، معرفت و بیعت کی حقیقت، ضرورت بیعت، شناخت شیخ، مناسبت شیخ و مرید، ضرورت صحبت شیخ، ریاضت و مجاہدہ، ایک طرف اخلاص، تواضع، توکل، خشوع، تفویض، تقویٰ وغیرہا، اور دوسری طرف رذائل (حرص، حسد، تکبر، حب جاہ، غصہ وغیرہا) کی تحقیق اور ان سب کا طریق کار، پھر طریق تحصیل، طریق علاج، مراقبات اذکار و اشغال کی تفصیل، اسی طرح تصوف اصطلاحی سے متعلق چھوٹی بڑی بیسیوں بحثیں اور پچاسوں اصطلاحات کی تعریفیں۔ غرض کہ یہ ایک متوسط ضخامت کی کتاب گویا تصوف کے سلسلہ میں معلومات اخلاق کا پورا خزانہ ہے جس سے ایک طرف تو واقفیت کامل حاصل ہوتی ہے، دوسری طرف شریعت اور طریقت کا تضاد نظر سے دور ہو جاتا ہے اور تیسری طرف طریقت ان دشواریوں کا مجموعہ نہیں رہ جاتی جو عوام نے اس کے لیے اپنی سمجھ رکھی ہیں۔

مرتب کا شمار مشاہیر اہل قلم میں نہیں اس کا نام بھی پہلی ہی بار سننے میں آیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ کام اتنا بڑا کر گئے ہیں کہ ان سے [illegible] کی زبان پر رشک آ جائے تو بجا ہے یہ کہیں ــــ کتاب تصوف کے منکر و معتقد دونوں کے مطالعہ کے قابل ہے۔

(عبد الماجد دریابادی)

تبصرہ

ماہنامہ **دار العلوم دیوبند** دسمبر ۱۹۵۲ء

احسان و سلوک کے چشمۂ صافی پر بدعات و رسومات کے ساتھ غلط فہمی اور بدگمانی کی ایک ایسی دبیز اور گرد آلود تہہ جم گئی ہے کہ صدیوں سے "احسانِ حنیف" کا یہ شعبہ بحث و تمحیص، مناظرہ و مجادلہ کا میدانِ کارزار بنا ہوا ہے۔ جاہل صوفیاء نے اس کو دین کا مخ اور مغز قرار دیا ہے اور اس کے مقابل تنگ نظر علماء نے طریقت کو سرے سے بے بنیاد اور بے اصل ٹھہرانے کی جد و جہد کی ہے۔ حالاں کہ دونوں نظریے از سر تا پا غلط اور گمراہ کن ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شریعت و طریقت کا "چولی دامن" کا ساتھ ہے کہ ہر ایک دوسرے کے بغیر قشر و پوست کے درجہ میں رہ جاتا ہے۔ متاخرین علماء میں صوفی و درویش، اسرارِ شریعت کے واقف کار، احسان و سلوک کے رازداں حکیم الامت مولانا تھانویؒ کا پوری امت پر احسان ہے کہ حقائق کو اجاگر کر کے شریعت و طریقت، صوفی و ملا کی باہمی آویزشوں کو ختم کر ڈالا۔ اور نتیجتاً دونوں ایک دوسرے کے ہم آہنگ و ہم نوا ہو گئے۔ آپ ہی کی متعدد تصانیف سے یہ ضخیم مجموعہ تیار کیا گیا ہے۔ سلوک کے مسائل اور مضامین کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حل کرنے کی کامیاب کوشش۔ اصطلاحاتِ تصوف پر اچھی بحثیں، اخلاقِ فاضلہ و رذیلہ کے معرکۃ الآرا مضامین اس مجموعہ کے دل آویز عنوانات ہیں۔ تصوف سے متعلق ذخیرہ جو اس کتاب پر بے تکلف قربان کیا جا سکتا ہے۔ تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ اس مجموعہ کا مطالعہ قطع نظر منازلِ طریقت کی واقفیت سے، عام انسانی و اخلاقی زندگی کے لیے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ چوں کہ متعدد تصانیف سے انتخاب و اقتباس کیا گیا ہے اس لیے مباحث میں کچھ بے ربطی پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم "عیب و نقص" کے درجہ تک بات ہرگز نہیں پہنچی۔ بہر حال مجموعہ ہر حیثیت سے لائقِ مطالعہ اور قابلِ قدر ہے۔

(سید محمد انظر شاہ کشمیری)

ابن علامہ انور شاہ کشمیری، دار العلوم دیوبند

عرض حال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ
والسلام علی خاتم الانبیاء والمرسلین

اما بعد! اس پر فتن زمانہ میں منجملہ دوسری غلطیوں کے ایک اہم اور بڑی غلطی علم تصوف کے فہم میں ہوئی کسی نے قول و فعل کی بے قیدی کا نام تصوف رکھ لیا۔ کسی نے چند ظاہری رسوم کو تصوف کا نام دیدیا۔ اور کسی نے صرف کثرت اوراد و وظائف کو تصوف سمجھ لیا غرض تصوف کے مسائل سمجھنے میں صدہا غلطیاں کیں۔ جس سے ایک طرف تو ان کے عقائد درست نہ رہے بلکہ بعض تو شرک تک میں مبتلا ہو گئے اور دوسری طرف بعض حضرات نے یہاں تک تجاوز کیا کہ اصل تصوف کا انکار کر بیٹھے اور حضرات اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی شان میں بے ادبی و گستاخی کے خوگر ہو گئے تیرہ صدیوں کے مسلم مسائل تصوف کو کتاب و سنت سے خارج اور شریعت کے خلاف سمجھ کر تصوف کے نام سے کوسوں دور بھاگنے لگے یہ لوگ نہ صرف بزرگان دین کے برکات و فیوضات سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ ان کے عقیدہ میں فساد پیدا ہو گیا ان کے علاوہ بعض حضرات تصوف کے منکر تو نہیں ہیں۔ حضرات اولیاء اللہ کے معتقد بھی ہیں لیکن علم تصوف کو شریعت کے علاوہ ایک علیحدہ علم سمجھتے ہیں۔ اور مسائل تصوف کو غیر ثابت بالسنۃ جانتے ہیں۔ ان جملہ امور کے پیش نظر کتاب شریعت اور طریقت مرتب کی گئی ہے جس کے جملہ مضامین حضرت حکیم الامت مجدد الملۃ الشاہ مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے افادات کا انتخاب ہیں اور حضرت شیخ المشائخ مولانا مفتی محمد حسن صاحب خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت نے کتاب ہٰذا کا نام اشرف الطریقۃ فی الشریعۃ والحقیقۃ تجویز فرمایا ہے حضرت مفتی مرحوم کے علاوہ حضرت مولانا جلیل احمد صاحب شیروانی خلیفہ مجاز حضرت مجدد تھانوی اور مولانا محمد نجم الحسن صاحب تھانوی نواسہ حضرت حکیم الامت تھانوی کے گرامی قدر مشورہ اور ارشاد کی تعمیل میں حلیۂ طبع سے آراستہ کر کے منظر عام پر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

شریعت

شریعت کی حقیقت اور اس کی ضرورت

اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہیں :-

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيعَةٍ مِّنَ	پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ
الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ	یعنی شریعت پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر
الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ هٰذَا بَصَائِرُ	چلے چلئے اور ان جاہلوں کی خواہشوں پر نہ
لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ	چلئے یہ شریعت عام لوگوں کے لیے دانشمندیوں
لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ○	کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ اور یقین کرنے
(سورۃ الجاثیہ)	والوں کے لیے رحمت ہے ۔

بصائر بصیرت کی جمع ہے اور بصیرت باطنی روشنی کو کہتے ہیں جیسے بصر نگاہ یعنی ظاہری روشنی کو کہتے ہیں ۔ تو شریعت بصائر یعنی باطن کو روشن کرنے والی ہے اور سراپا ہدایت ہے کہ جس سے رستہ نظر آتا ہے اور مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے گویا شریعت تین چیزوں کا مجموعہ ہے نور، راہ اور مقصود یعنی سفر کو ان ہی تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جب آدمی (منزل) مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اس کیلئے ایک مقصود ہوتا ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعے راستہ نظر آئے ۔ حق تعالیٰ کے فرمان جلیلہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ شریعت ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کیے ہوئے ہے ھدًا بصائر تو بینا آنکھیں بھی ہیں ذریعہ ہدایت ہے راستہ بھی اسی کے ذریعہ طے ہوتا ہے ، اور

لہ [illegible] ۲۰

ذخیرۂ رحمت ہے کہ مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے یہ شریعت رحمت تو ہے مگر ہر شخص کے لیے نہیں بلکہ یقین کرنے والوں کے لیے ہے۔ (لہٰذا یقین کا حاصل کرنا ضروری ہوا)۔

قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت میں خطِ شریعت کا موجود ہونا اور اللہ تعالیٰ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طریقہ پر چلنے کا حکم فرمانا اس بات پر صریح دلالت کرتا ہے کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف شریعت اسلامیہ ہی پسندیدہ نظامِ حیات ہے اس کے خلاف معاشرت، وہ زندگی گزارنے کے جتنے بھی طریقے انسان نے اختیار کر رکھے ہیں وہ جہلاء اور بددین لوگوں کے خود ساختہ ہیں جو محض انسانی خواہشات کے مطابق مختلف عنوانات سے پیش کیے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مردود قرار دیا ہے چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:-

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۔	جو شخص شریعت اسلامی کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا اس کے طریقہ کار کو خدا تعالیٰ ہرگز قبول نہیں کرے گا۔
(الآیۃ)	

شریعت خدا تعالیٰ کا قانون ہے اور سب جانتے ہیں کہ قانون کسی شخص کی رائے اور خواہش سے نہیں بدل سکتا، البتہ قانون بنانے والا خود ہی بدل دے تو دوسری بات ہے اور اسی طرح اگر لوگ قانون پر عمل کرنا چھوڑ دیں تو ان کے عمل چھوڑ دینے سے قانون نہیں بدل سکتا، خاص کر خدا تعالیٰ کا قانون، کیونکہ خدا تعالیٰ کی حکومت کا دار و مدار بندوں کی فرمانبرداری اور اطاعت پر نہیں اور فرمانبرداری کوئی کرے یا نہ کرے، ہر حال میں وہ سب کا بادشاہ ہے تو پھر اس کا قانون کس طرح بدلا جا سکتا ہے (لہٰذا فرماتے ہیں):

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ	جو شخص خدا کے اتارے ہوئے بھیجے ہوئے طریقے کے مطابق فیصلہ نہ کرے ایسے ہی لوگ دراصل کافر ہیں۔

۱؎ نجات کا طریقہ صفحہ ۔ ۲؎ الشریعت صفحہ

میں مجبور یا مغلوب نہیں پس معلوم ہوا کہ جو کلامِ الٰہی ہے اس کے تمام احکام افراط و تفریط سے پاک ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت کا پابند ہونا ہر بشر پر لازم ہے کیونکہ وہ احکام سب کے مصالح کو جامع ہیں۔ نیز ہماری یہ حالت مشاہد (یعنی نظر آتی) ہے کہ جو کیفیت شدید ہوتی ہے وہ ہم کو مغلوب کر دیتی ہے اس لیے ہم کو شریعتِ الٰہی کی پابندی ضروری ہے تاکہ ہم اعتدال پر قائم رہ سکیں۔ واقعی شریعت کی تعلیم میں غایت تعدیل (یعنی بہت بیلنس رکھا) ہے۔ سو تعدیل ہر چیز میں رکھی ہے جو اس میں شریعت کا حکم ہے۔ مثلاً ہمدردی اچھی چیز ہے مگر اس کا اس قدر افراط کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کا وسوسہ پیدا ہونے لگے مناسب نہیں۔ جیسے کوئی بچہ بیمار ہے سخت روتا اور چلاتا ہے اس پر رحم کر کے دعا کرے اور تاخیر صحت سے اللہ تعالیٰ پر اعتراض پیدا ہونے لگے کہ حق تعالیٰ میری دعا کو اس بچہ کے حق میں قبول کیوں نہیں فرماتے۔ یا قبول میں دیر کیوں کرتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ اس میں بھی حکمت ہے۔ بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ والدین تدبیر کو استعمال میں نہیں لاتے اور حق تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے کہ میری سنّت عادیہ میں یہ خلل ڈالنا چاہتا ہے (کیونکہ حق تعالیٰ کی سنّت عادیہ یہی ہے کہ اختیار اسباب سے مسبب کو مرتب فرماتے ہیں) اور ایسے وقت شریعت کا حکم یہ ہے کہ تدبیر کی جائے اور تدبیر کو مؤثر بنانے کے لیے دعا بھی کی جائے۔

خدا تعالیٰ[1] نے انسان کو عقل بھی دی ہے اور فطرت بھی۔ اس لیے اگر دونوں کے مقتضا میں تزاحم ہو تو اس وقت اس کو شریعت کی تعلیم پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ شریعت کی تعلیم میں دونوں کی رعایت ہے۔ مثلاً کسی چیز کے فوت ہونے سے رنج پہنچے تو عقل اس وقت رنج کرنے سے منع کرتی ہے کہ رنج کرنے سے وہ شے واپس نہیں آ سکتی اس لیے رنج فضول ہے اور طبیعت رنج کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ چیز ہم سے جدا کیوں ہوئی مگر شریعت میں دونوں کی رعایت کی گئی ہے کہ رنج بھی ہو مگر اس کو غالب نہ کرو۔ شریعت نے عقل کی بھی رعایت کی اور طبیعت کی بھی۔ اسی طرح غفلت دنیا سے غفلت، عقل کے نزدیک سخت غلطی ہے مگر طبیعت غفلت کو مقتضی ہے۔ کیونکہ فنائے دنیا کو بار بار دیکھتے دیکھتے مسلمانات حسی

---

[1] ملفوظ: انسانی عصر کو

ہو جاتی ہے اور جس چیز کی مسارات سی ہو جائے اس سے طبیعت کو غفلت ہو جاتی ہے۔
شریعت نے یہاں بھی دونوں کی رعایت فرمائی کہ غفلت کا تو مضائقہ نہیں مگر نہ اتنی غفلت کہ
احکام عقلیہ بالکل برباد ہو جائیں۔

الغرض شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور اعمال و اخلاق کی شرح یہ ہے (یعنی
اعمال اخلاق سے پیدا ہوتے ہیں اور) اصل محل اعتدال کا اخلاق ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ
اخلاق کے تین اصول ہیں یعنی اصل میں تین قوتیں ہیں جن سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ قوت
عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ۔ حاصل یہ ہے کہ اپنے منافع کے حصول اور مضار کے دفع
کے لیے خواہ وہ دنیویہ ہوں یا اخرویہ، دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک تو وہ قوت کہ جس سے
منفعت و مضرت کو سمجھے وہ قوت ہے عقلیہ ہے اور ایک یہ کہ منفعت کو سمجھ کر اس کو حاصل
کرے۔ یہ قوت شہویہ کا کام ہے اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو دفع کرے۔ یہ قوت ہے ملقب
قوت غضبیہ سے پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں پھر ان اعمال کے تین درجے
ہیں۔ افراط، تفریط، اعتدال، چنانچہ قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ دین کو بھی نہ مانے
جیسے یونانیوں نے کیا۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل و سفہ تک نوبت آئے اسی طرح قوت شہویہ کا
ایک درجہ افراط ہے کہ حلال و حرام کی بھی تمیز نہ رہے بیوی و اجنبیہ سب برابر ہو جاویں۔ اور
ایک درجہ تفریط یعنی ایسا پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے یا مال کے ایسے حریص
ہو گئے کہ اپنا پرایا سب ہضم کرنے لگے یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں۔ اسی
طرح قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑیا ہی بن جائے اور تفریط یہ ہے کہ ایسے نرم
ہو گئے کہ کوئی جوتے بھی مار لے، دین کو برا کہے تب بھی غصہ نہ آئے۔ یہ تو افراط و تفریط ہے اور
ایک ان تینوں قوتوں کا اعتدال ہے یعنی جہاں شریعت نے اجازت دی ہو وہاں تو ان قوتوں کو
استعمال کرے اور جہاں اجازت نہ دی ہو وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے تو ہر قوت کے
تین درجے ہو گئے۔ افراط، تفریط، اعتدال۔ ان سب درجوں کے نام الگ الگ
ہیں جو قوت عقلیہ کے افراط کا درجہ ہے اس کا نام "جربزہ" ہے۔ جو تفریط کا درجہ ہے
اس کو "سفاہت" کہتے ہیں۔ جو اعتدال کا درجہ ہے اس کا لقب "حکمت" ہے۔ اسی طرح

قوتِ شہویہ کے افراط کا درجہ فجور ہے، تفریط کا درجہ جمود ہے۔ اعتدال کا درجہ عفت ہے اور قوتِ غضبیہ کا درجۂ افراط تہور ہے اور گھٹا ہوا درجہ جبن ہے، اعتدال کا درجہ شجاعت ہے تو یہ نو چیزیں ہوئیں جو تمام اخلاقِ حسنہ و سیئہ کو حاوی ہیں۔ اور مطلوب ان نو درجوں میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں، یعنی حکمت، عفت، شجاعت۔ باقی سب رذائل ہیں تو حصولِ اخلاقِ حسنہ کے یہ تین ہیں اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہے۔ اسی لیے اس امت کا لقب "امتِ وسطاً" یعنی امتِ عادلہ ہے۔ غرض انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہو۔ اب آپ دیکھیں کہ دنیا میں زاہد تو بہت ہوں گے لیکن انسان بہت کم ہیں چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے ؎

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمند
این جملہ شدی ولیکن انسان نشدی

(یعنی تم زاہد، شیخ اور عقلمند اور سب کچھ تو بن گئے لیکن انسان نہ بنے)

حاصلِ کلام یہ کہ شریعت نے ہم کو ایسی تعلیم دی ہے جس میں تمام مصلحتوں اور مضرتوں کی رعایت ہے اس لیے ہمیں تجربہ کرکے ٹھوکریں کھا کے مصلحتیں اور مضرتیں معلوم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ شریعت کی تعلیم حاصل کر لیں پھر ہمیں تہذیب و تمدن میں کسی قوم کی تقلید کی ضرورت نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری سب مصلحتوں اور مضرتوں کی رعایت فرما کر ایسی جامع اور نافع تعلیم ہم کو فرمائی ہے جس میں مضرت کا نام و نشان نہیں بلکہ راحت ہی راحت ہے پس مسلمان اگر شریعت کی تعلیم پر کسب حق چلیں تو سب تن راحت میں رہیں، روحانی راحت بھی (میسر ہو) اور جسمانی راحت بھی (حاصل ہو)۔

طریقِ کار | دین کے جتنے حصے ہیں، عقیدے، عبادتیں، معاملے، خصلتیں اور رہنے سہنے کے طریقے، سب کی اصلاح کریں اور جو معلوم نہ ہو پوچھتے رہیں۔ جو کام کریں پہلے شریعت سے تحقیق کر لیں۔ مگر تحقیق ایسوں سے کریں جو پکی بات

لے حاسبہ [illegible] ص ۱۳۱، ے [illegible] ص [illegible]، ے شریعت ص ۲۳

بتلاویں اور جو خود ہی اپنی خواہش نفسانی کو شریعت کے مد مقابل سمجھیں اور زبردستی غیر دین کو مصلحتوں اور پالیسی کی وجہ سے دین بناویں وہ واقع میں عالم نہیں۔ وہ تو جاہل ہیں ان سے مت پوچھیں ورنہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی گمراہ کر دیں گے۔ اگر یہ کہیں کہ اس زمانہ میں سچے عالم کہاں ملتے ہیں؟ تو یہ غلط ہے بلکہ ڈھونڈنے سے مل جاتے ہیں۔

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی تعریف اور باہمی تعلق

شریعت[1] احکامِ تکلیفیہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس میں اعمالِ ظاہری اور باطنی سب آ گئے
اور متقدمین کی اصطلاحات میں لفظ فقہ کو اس امر کا مرادف (یعنی ہم معنی) سمجھا جاتا ہے جیسے
امام اعظم ابوحنیفہؒ سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے۔ معرفۃ النفس ما لہا وما علیہا
(یعنی نفس کے نفع اور نقصان کی چیزوں کو پہچاننا) پھر متاخرین کی اصطلاح میں شریعت جزو
متعلق باعمال ظاہرہ کا نام "فقہ" ہو گیا اور دوسرے جزو متعلق باعمال باطنہ کا نام "تصوف"
ہو گیا۔ اور ان اعمال باطنی کے طریقوں کو "طریقت" کہتے ہیں۔ پھر ان اعمال کی درستی سے قلب میں
جو جلا اور صفائی پیدا ہوتا ہے اس سے قلب پر بعض حقائق کونیہ متعلقہ اعیان و حوادث اور ان کے
لوازمات اور خصوص اعمال حسنہ و سیئہ و حقائق الٰہیہ صفاتیہ و فعلیہ، بخصوص معاملات
بین اللہ اور بین العبد (یعنی جو معاملات اللہ اور بندہ کے درمیان ہیں وہ) منکشف ہوتے
ہیں۔ ان منکشفات کو "حقیقت" کہتے ہیں اور اس انکشاف کو "معرفت" کہتے ہیں اور اس
صاحب انکشاف کو "محقق" اور "عارف" کہتے ہیں۔ پس یہ سب امور متعلق شریعت کے ہی ہیں۔
اور عوام میں جو یہ شائع ہو گیا ہے کہ شریعت صرف جزو متعلق باحکام ظاہرہ کو کہتے ہیں یہ اصطلاح
کسی اہل علم سے منقول نہیں۔ اور عوام کے اعتبار سے اس کا منشا بھی صحیح نہیں کہ وہ ظاہر
اور باطن میں اعتقاد تنافی (یعنی ظاہر اور باطن میں اختلاف) کا قائل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تصوف[2] کے اصول بھی قرآن اور حدیث میں سب موجود ہیں اور یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ
تصوف قرآن اور حدیث میں نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ بعض غالی صوفیوں کا بھی یہی خیال ہے
اور خشک علماء کا بھی کہ تصوف سے قرآن و حدیث خالی ہیں مگر دونوں غلط سمجھے۔ خشک علماء تو
یہ کہتے ہیں کہ تصوف کوئی چیز نہیں، یہ سب واہیات ہے، کیونکہ اگر ہوتا تو قرآن و حدیث سے
ثابت ہے اسی کو کرنا چاہیئے، یہ صوفیوں نے کہاں کا جھگڑا نکالا ہے تو گویا ان کے نزدیک
قرآن و حدیث تصوف سے خالی ہیں۔ اور غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن و حدیث میں تو ظاہری

---

[1] التکشف صفحہ [illegible] [2] [illegible]

احکام ہیں۔ تصوف مسلم باطن ہے ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن وحدیث ہی کی ضرورت نہیں۔ غرض دونوں فریقے قرآن وحدیث کو تصوف سے خالی سمجھتے ہیں پھر اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک نے تو تصوف کو چھوڑ دیا اور ایک نے قرآن وحدیث کو بالائے طاق رکھا کیا غضب کرتے ہو خدا سے ڈرو۔ اس کے متعلق میں نے اس مضمون پر دو مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ ایک تو "حقیقت الطریقت" جس میں مسائل تصوف کی حقیقت احادیث سے ثابت کی گئی ہے۔ ایک رسالہ مستقل (مسائل السلوک) جس میں صاف طور پر ظاہر کیا گیا ہے کہ تصوف کے مسائل قرآن مجید سے بھی ثابت ہیں۔ ان دونوں کتابوں سے معلوم ہوگا کہ قرآن وحدیث تصوف سے لبریز ہیں اور واقعی وہ تصوف ہی نہیں جو قرآن وحدیث میں نہ ہو۔ غرض جتنے صحیح اور مقصود مسائل تصوف کے ہیں وہ سب قرآن وحدیث میں موجود ہیں۔

(اَلتَّقْوٰی هٰهُنَا وَاَشَارَ اِلٰی — یہاں ہے اور سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔

الصَّدْرِ (مسلم)

سو جب کہ ایمان کامل اور تقوی کامل کا حاصل کرنا فرض ٹھہرا اور وہ اصلاح باطن پر موقوف ہے، سو اصلاح باطن بھی فرض ہوئی اسی طرح ظاہر ہے کہ اگر ادنیٰ درجہ کا ایمان و تقوی معدوم ہوگا تو اعلیٰ درجہ کا بھی کسی طرح حاصل نہ ہوگا۔

شرع[1] کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے وہ دو قسم کے ہیں، بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے۔ جیسے کلمہ پڑھنا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، ماں باپ کی خدمت، ان کو مامورات کہتے ہیں۔ اور کلمات کفر کہنا، شرک کے افعال کرنا، زنا، چوری، سود خوری، رشوت وغیرہ، ان کو منہیات کہتے ہیں۔ بعض اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے۔ جیسے ایمان و تصدیق و عقائد حقہ، صبر و شکر، توکل، رضا بالقضاء، تفویض و احسان، محبت خدا و رسول وغیرہ۔ ان کو مامورات و فضائل کہتے ہیں اور عقائد باطلہ، بے صبری، ناشکری، ریا، تکبر، عجب وغیرہ یہ منہیات و رذائل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔

جس طرح قرآن مجید میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو) موجود ہے، اسی طرح یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا (اے ایمان والو! صبر کرو) اور وَاشْکُرُوْا لِلّٰهِ (اور اللہ کا شکر بجا لاؤ) بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے) اور لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ (لوگوں پر اللہ کے لیے خانہ کعبہ کا حج فرض ہے) ہے تو دوسرے مقام میں یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ اور وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور جو ایمان والے ہیں وہ اللہ سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں) بھی دیکھو گے۔ یہاں اِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی (جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں) مذکور ہے، اس کے ساتھ ہی یُرَآءُوْنَ النَّا

---

[1] شرع یعنی دین کی رو سے

البتہ اتنا ہے، لوگوں کو دکھلانے کی برائی بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر تارکِ نماز و زکوٰۃ کی مذمت ہے تو دوسرے مقام پر تکبر و عجب کی برائی بھی موجود ہے۔ اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح ان میں ابواب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح و طلاق پاؤ گے، ابواب ریا و کبر وغیرہ بھی دیکھو گے۔

جس طرح اعمالِ ظاہرہ مشکل عبادتیں ہیں، اسی طرح اعمالِ باطنہ بھی حکمِ خداوندی ہیں۔ کیا اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ امر کا صیغہ ہے اور اِصْبِرُوْا وَاشْکُرُوْا امر کا صیغہ نہیں ہے؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال بھی باطن کی اصلاح کے لیے ہیں اور باطن کی صفائی ہی مقصود اور موجب نجات اور اس کی کدورت موجب ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ — بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب
خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا — ہوا، اور جس نے میلا کیا ناکام رہا۔
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ — اس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے مگر
اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ — جو شخص اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آئے۔
سَلِيْمٍ۔

ایمان و عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے، قلب ہی کا فعل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب ایمان ہی کی تکمیل کے لیے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے۔ دل بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور اعضاء اس کے لشکر یا غلام ہیں۔ اگر بادشاہ درست ہو جائے تو توابع خود بخود اس کی مطابقت کرنے لگیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ — بے شک آدمی کے بدن میں ایک گوشت کا
صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ — لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام
فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِيَ — بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے
الْقَلْبُ — تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے، وہ دل ہے۔

یہ امور ذات دن ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں کہ جس چیز کا دھیان دل میں سما جاتا ہے سب سے اعضاء اس کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ آنکھ اس کو دیکھنے، کان اس کو سننے، ہاتھ اس کو پکڑنے اور پاؤں اس کی جانب چلنے کو چاہتا ہے۔ خواہ وہ شے بُری ہو یا بھلی۔ مگر دل کا خیال ان اعضاء کو اس کے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ[1] یعنی شرع کے معنی کا بھی اعتبار ہے۔ اس معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں۔ تصوف کو علیحدہ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جاوے۔ یہ علیحدگی ایسی ہے جیسے مشہور فقہ میں کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصلوٰۃ لکھی گئی ہیں اسی طرح کتاب التصوف بھی فقہ ہے۔ اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ و کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جاویں گے۔ اسی طرح توحید و اخلاص، یا کبر و تواضع و عجب وغیرہ اخلاقِ حمیدہ و رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں۔

اہلِ علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے کہ سوائے ظاہری فقہ کے اور بھی کچھ ہے۔ اور وہ ضروری بھی ہے۔ جیسے بظاہر اٹھ بیٹھ لیے اور نماز ادا ہو گئی۔ جب کہ قرآن مجید میں جہاں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ ہے۔ اس کے ساتھ ہی خٰشِعُوْنَ (خشوع کرنے والے) بھی لگا ہوا ہے۔ جب صَلَاتِهِمْ سے نماز شرعی مطلوب سمجھتے ہیں تو کیا وجہ کہ خٰشِعُوْنَ سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ دونوں حکم ضروری ہیں

قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ[2] فَفَهَّمْنٰهَا	اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس ہم نے وہ واقعہ
سُلَيْمٰنَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى	حضرت سلیمان کو سمجھا دیا اور رسول اللہ صلی اللہ
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَقَدْ كَانَ فِيْمَا	علیہ وسلم نے فرمایا تحقیق تم سے پہلے امتوں میں
قَبْلَكُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ	صاحب الہام گذرے ہیں پس اگر میری امت
فَاِنْ يَكُنْ فِيْ اُمَّتِيْ اَحَدٌ	میں کوئی ہے تو وہ عمر ہیں (بخاری و مسلم)
فَاِنَّهٗ عُمَرُ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وَقَالَ	اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ہم نے علم دیا اس کو اپنے

۱؎ تصوف و سلوک صفحہ [illegible]۔ ۲؎ تفسیر مظہری صفحہ [illegible]

تفسیر حتیٰ کہ علم کلام وغیرہ بھی داخل ہیں، اسی طرح جب کوئی مشائخ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر چلتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تصوف سیکھتا ہے، یا صوفی ہے۔ نماز روزہ ادا کرنے والے کو صوفی نہیں کہتے، رسالہ کہ تصوف تزکیہ باطن بالمعنی الاعم سب کو شامل ہے۔

لہٰذا[۱] جس طرح کہ ورد وظیفہ ضروری ہے ایسے ہی ابوطالب مکی کی "قوت القلوب"[۲] اور امام غزالی کی "اربعین" اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی "عوارف" کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔

خلاصہ[۳] یہ کہ تصوف کی حقیقت خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھانا ہے، اس[۴] کے بغیر کام نہیں چل سکتا، ہمت[۵] کا مقتضا تو یہ ہے کہ صاحب ذوق ہو، اگر اتنی ہمت نہ ہو تو خدا کے لیے انکار تو نہ کرو۔

ولایت کے شیون

ولایت[۶] چونکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور نبوت میں مختلف شیون و شانیں ہیں، اس لیے کسی ولی کو علیٰ قدم عیسیٰ اور کسی کو علیٰ قدم موسیٰ حسب اختلاف شیون کہا جاتا ہے اور یہ سب شیون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے شیون کے انعکاس ہیں۔ آپ ان سب شیون مختلفہ کے جامع ہیں۔ پس جس کو آپ کی شان غالب یہ شانِ موسوی سے فیض ہوا، اس کو علیٰ قدم موسیٰ اور جس کو آپ کی شانِ عیسوی سے فیض ہوا اس کو علیٰ شانِ قدم عیسیٰ وغیرہا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ط — سو تم لوگ ابراہیم کا اتباع کرو جس میں ذرا کجی نہیں۔

نسبت موسوی شیون محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ایک شان ہے۔ عیسیٰ روح اللہ، موسیٰ کلیم اللہ، یہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شیون ہی کے اسماء ہیں۔ جن بزرگوں میں ان شیون موسویہ اور شیون عیسویہ کا غلبہ ہوتا ہے، بعض اوقات وہ انکار کے

---

۱ تصوف و سلوک صفحہ ۱۵۹، ۲ تفہیم الدین صفحہ ۲۲، ۳ تصوف و سلوک صفحہ ۳۰، ۴ تعلیم الدین صفحہ ۸۶

۵ نبوت اور ملاقات صفحہ ۔

وقت لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا بھی ہم اللہ اور لا الٰہ الا اللہ عیسیٰ روح اللہ پڑھنے لگے ہیں جس کی حقیقت عوام نہیں سمجھتے۔ چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جامع الکمالات ہیں لیکن اس سے مستفید ہونا اس حیثیت سے ہے کہ وہ واصل کمال موسوی ہے بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ وہ واصل کمال محمدی ہے ۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

تحقیقات مفیدہ متعلقہ نبوت و ولایت

اس میں گفتگو ہے کہ نبوت افضل ہے یا ولایت۔ مگر اس پر اتفاق ہے کہ ولی سے نبی افضل ہے کیونکہ وہ نبوت و ولایت کے جامع ہوتے ہیں۔ جو حضرات نبوت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ نبی کی افضلیت سے استدلال کرتے ہیں اور جو ولایت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ولایت میں توجہ الی الحق (صرف خدا کی طرف توجہ) ہے اور نبوت میں توجہ الی الخلق (مخلوق کی طرف توجہ) ہے چونکہ خدا کی طرف توجہ مخلوق کی طرف توجہ کرنے سے افضل ہے لہٰذا ولایت افضل ہوئی۔ لیکن تحقیق یہ ہے کہ ولایت تو بے شک توجہ الی الحق ہے۔ مگر نبوت توجہ الی الخلق والحق معاً (خدا اور مخلوق دونوں کی طرف توجہ) یعنی مرتبہ جامع ہے۔ پس نبوت کا افضل ہونا ظاہر ہے۔ علاوہ بریں اگر ولایت کو افضل کہا جائے تو لازم آتا ہے کہ نبی کو نبوت ملنے سے اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی قبل از نبوت ولی ہوتا ہے پھر نبوت ملتی ہے مگر دونوں فریق میں نزاع لفظی ہے کیونکہ جو لوگ نبوت کو افضل کہتے ہیں وہ نبوت کو معنی مطابقی (یعنی توجہ الی الحق والخلق معاً) پر محمول کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ولایت کو افضل کہتے ہیں، معنی تضمنی (یعنی مخلوق کی طرف توجہ) کے اعتبار سے کہتے ہیں۔

دوم یہ کہ نبی کی دو شاخیں ہوتی ہیں۔ ایک ولایت کی، ایک نبوت کی، توجہ الی الولایت

ملہ کمالات ... ملہ ... مبادیٔ التصوف

نبی کی نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے کہ نبی کی توجہ الی افادۃ الخلق
من حیث النبوۃ (یعنی مخلوق کے افادہ کے لیے نبوت کی حیثیت سے توجہ)
تھی اور توجہ الی الحق من حیث الولایت (یعنی حق تعالیٰ کی طرف توجہ ولایت
کی حیثیت سے) یعنی اصل مطلوب یعنی توجہ الی اللہ ہے اور توجہ الی الافادۃ مطلوب
للغیر ہے۔

(الغرض) ولی کبھی کسی نبی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ نہ عبادت کبھی معاف ہو
سکتی ہے بلکہ خواص کو زیادہ عبادت کا حکم ہے۔ البتہ مجذوب کہ مسلوب الحواس ہوتا ہے معذور
ہے۔ نہ ولی معصوم ہوتا ہے نہ صحابی کے مرتبہ کو پہنچ سکتا ہے۔

لقولہ تعالیٰ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ	کیونکہ حق تعالیٰ نے فرمایا تم لوگ بہتر امت
وقولہ علیہ السلام خَیْرُ القُرُونِ	ہو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب زمانوں
قرنی و اصحابی کالنجوم ...	سے بہتر میرا زمانہ ہے اور اسی لیے کوئی کسی کا
والصحابۃ کلہم عدول، وقول	اجماع ہے کہ صحابہ کرام سب کے سب عادل
عبد اللہ ابن المبارک من	ہیں اور عبد اللہ بن مبارکؒ جو تابعین میں سے ہیں
الغبار الذی دخل فی	فرماتے ہیں کہ جو غبار حضرت امیر معاویہؓ کے
انف فرس معاویۃ خیر من	گھوڑے کی ناک میں گیا ہے وہ حضرت اویس
اویس القرنی و عمر	قرنیؒ جو مشہور ولی ہیں اور حضرت عمر بن
المروانی۔	عبد العزیز مروانی سے بہتر ہے۔

(اور اسی طرح) حضرت غوث اعظمؒ نے فرمایا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت
عمر بن عبد العزیزؒ میں اتنا ہی فرق ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو گرد
بیٹھ گئی ہے وہ ہزار عمر بن عبد العزیز جیسوں سے افضل ہے۔ اس لیے کہ عمر بن عبد العزیز وہ
آنکھ کہاں سے لا سکتے ہیں جس سے حضرت امیر معاویہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے
اور وہ زمانہ کہاں سے لائیں گے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ اور حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اٹھے بیٹھے۔

اقسامِ طریق و سلوک

طریق دو قسم پر منقسم ہے۔ طریق جذب اور طریق سلوک۔ کبھی وصول الی اللہ پہلے ہو جاتا ہے پھر شوق عبادت و ریاضت پیدا ہوتا ہے اس کو طریق جذب کہتے ہیں اور کبھی اول ریاضت ہوتی ہے پھر وصول الی اللہ میسر ہوتا ہے اس کو طریق سلوک کہتے ہیں۔

سلوک دو قسم پر منقسم ہے۔ سلوک نبوت اور سلوک ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں جو حسب ذیل لکھے جاتے ہیں۔ اولیاء میں سے کسی پر کبھی قوت فیض نبوت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی فیض ولایت کا۔

آثارِ سلوکِ ولایت	آثارِ سلوکِ نبوت
(۱) طریق ولایت والے کھانے پینے میں تکلفاً کمی کرتے ہیں۔	(۱) طریق نبوت والے قصداً کمی نہیں کرتے جو ملتا ہے اسی پر قناعت کرتے ہیں۔
(۲) خلق سے نفرت کرتے ہیں۔	(۲) خلق کی طرف افادہ کے لیے رغبت کرتے ہیں لیکن خلق سے جی نہیں لگاتے۔
(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہیں کرتے جب تک واجب نہ ہو۔	(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں۔
(۴) ان کو اپنے مکاشفات اور تحقیقات پر اطمینان ہوتا ہے اور اس پر عمل کر سکتے ہیں گو خلاف شرع نہ ہو۔	(۴) ان پر ادب غالب ہوتا ہے جیسا کہ صاحب شرع سے منقول ہوتا ہے اس پر اپنی طرف سے بعد کشف وغیرہ نہیں بڑھاتے گو وہ زیادہ خلاف شرع نہ ہو۔

ملہ مبادی التصوف ص

	آثارِ سلوکِ ولایت		آثارِ سلوکِ نبوت
۵	ان پر ذوق و شوق غالب ہوتا ہے اور عبادت میں لذتِ طبعیہ آتی ہے	۵	ان پر ذوق و شوق غالب نہیں ہوتا بلکہ ان کو عبادت میں کچھ طبعی مزہ نہیں آتا، یعنی اگر مزہ نہ آوے دلگیر نہیں ہوتے۔ محض حکمِ ایزدی سمجھ کر عبادت کرتے ہیں۔
٦	اہتمام سے دعا نہیں مانگتے۔	٦	بمقتضائے اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ دعا مانگنا فرض سمجھتے ہیں۔
۷	اسبابِ ظاہری کو ترک کرتے ہیں	۷	اور دلوں سے زائد اسباب سے متمسک ہوتے ہیں مگر بقدرِ امکان کے مقتضا کے موافق رسول اللہ صلعم نے غزوہ میں دو دو زرہیں پہنی ہیں۔
۸	حضرت علیؓ کے ساتھ طبعاً زیادہ محبت کرتے ہیں مگر اعتقادِ فضیلت ترتیب سے ہوتا ہے۔	۸	حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔
۹	شیخ کو سارے جہاں سے افضل سمجھتے اور اس پر فریفتہ ہوتے ہیں۔	۹	افضلیت کا یقین نہیں کرتے محبت کرتے ہیں۔
۱۰	ان سے شرائع میں کبھی تسامح بھی ہو جاتا ہے اور وہ معذور ہیں۔	۱۰	یہ شریعت پر بڑی پختگی سے عمل کرتے ہیں۔
۱۱	ان پر سکر یعنی عالمِ بیخودی کا غالب	۱۱	ان پر صحو یعنی ہوشیاری کا مقام غالب

آثار سلوکِ ولایت

ہوتا ہے۔

(۱۲) بعض اوقات بعض خلوتیں چھوٹ جاتی ہیں کیونکہ ان کو اخفاء مقصود ہوتا ہے مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں ابھی غیر باقی ہے۔

(۱۳) اگر ظاہری شریعت کے خلاف شیخ حکم کرے تو اسے خلاف شریعت نہیں سمجھتے کسی تاویل سے کر لیتے ہیں مگر غیر قطعیات میں۔

(۱۴) ان پر حب عشقی غالب ہوتی ہے

(۱۵) اصحاب سلوک ولایت پر کبھی تشبیہ غالب ہوتی ہے۔

(۱۶) سلوک ولایت کی انتہا مقام رضا یا فنا الفنا ہے

آثار سلوکِ نبوت

ہوتا ہے۔

(۱۲) جماعت کی پابندی کرتے ہیں بلکہ ان کی نظر سے مقصودیت غیر کی بالکل نفی ہو چکی ہے۔

(۱۳) اگر خلاف ظاہر شریعت کوئی حکم شیخ کی طرف سے ہو تو مخالفت کرتے ہیں مگر ادب کے ساتھ۔

(۱۴) ان پر حب ایمانی غالب ہوتی ہے

(۱۵) اصحاب سلوک نبوت پر ہمیشہ تنزیہ غالب رہتی ہے۔

(۱۶) سلوک نبوت کی انتہا مقام عبدیت ہے۔

تنبیہ تفصیل بالا سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اولیاء خلاف شریعت چلتے ہیں کیونکہ ایک تو نص کا ظاہر ہے اس پر اصحاب حدیث چلتے ہیں اور دوسرے نصوص کے معانی بعض احکام ہوتے ہیں اس پر فقہاء عامل ہیں۔ تیسرے نصوص کے معنی المعنی (ہوتے ہیں) اس پر بعض احکام میں صوفیہ عامل ہیں لیکن فقہاء کا طریق اسلم ہے کیونکہ وہ شرعیات ہی سے علت مستنبط کر کے حکم کو متعدی کرتے ہیں۔ اور صوفیہ کبھی اپنے ذوق سے بھی علت نکال کر حکم کو متعدی کر لیتے ہیں۔ شرعیات سے علت نکال کر حکم کو متعدی کرنے کی نظیر قیاس ہے

لہ ملفوظ مبارک حضرت صفحہ ۲ عنہ ... اللہ۔

کے زمانہ میں بھی پائی جاتی تھی اور اس کا حجت ہونا تو صراحۃً ثابت ہے بخلاف ذوقِ محض کے کہ اس سے علت نکال کر حکم کو متعدی کرنے کی نظیر معروف نہیں اور محض ظاہریّت تو یَتَدَبَّرُوْنَ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ کے خلاف ہے۔

سالک کا مقام

سالکین کا مقام[1] اِیَّاکَ نَعْبُدُ (ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں) پر تمام ہو جاتا ہے اس کے بعد اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (آپ ہی سے اعانت کی درخواست کرتے ہیں) سے تمکین کا طالب ہوتا ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ مرید کی ابتدائی حرکت محمود ہے کیونکہ جب سالک کا نفس مزکی اور اس کا قلب مُجلّٰی ہو جاتا ہے تو پھر اس میں انوارِ عنایت جو کہ مقامِ ولایت کا موجب ہے۔ درخشاں ہوتے ہیں تو یہ نفس مزکی طلب و مقصود کے لیے خالص ہو جاتا ہے۔ پس ابتداء و بدائعاتِ الٰہیہ کے آثار کامل اور اس کے الطاف کو غیر متناہی دیکھتا ہے سو اس پر وہ حمد کرتا ہے اور ذکر کو اختیار کرتا ہے پس سرا پردۂ عزت کے پیچھے سے اس کے لیے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (ہر ہر عالم کے مربی) کے معنی کا حجاب مکشوف ہو جاتا ہے اس وقت وہ ماسوی اللہ کو محلِ فنا میں اور اپنے کو تربیت میں بعتار دہندہ کا محتاج دیکھتا ہے پس وہ وحشتِ اغراض اور کثرتِ سکون الی الاغیار سے خلاصی طلب کرنے کے لیے ترقی کرتا ہے پس اس بارگاہِ مقدس کی ہواؤں سے رحمٰن ورحیم (بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں) کے الطاف کے جھونکے چلتے ہیں۔ پھر وہ سرا پردہ کے جمال کے آگے سے برقِ جلال کی چمک کے واسطے سے مالکِ حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ پھر وہ مقام لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (یعنی مقامِ توحید) میں بلسانِ اضطرار پکارتا ہے کہ میں نے اپنا نفس آپ کے سپرد کر دیا اور میں ہمہ تن آپ پر متوجہ ہو گیا اور اس مقام پر پہنچ کر وہ لجّۂ وصول میں گھس گیا اور مقامِ عین تک پہنچ گیا جس سے اس نے نسبتِ عبودیت کو محقق کر لیا اور کہنے لگا اِیَّاکَ نَعْبُدُ[2]

---

[1] مسائل السلوک ص

[2] اس خطاب میں مقام فنا کی طرف اشارہ ہے مسائل السلوک ص ۲

اور یہاں مقام سالک کی انتہا ہے (جیساکہ شروع میں کہا گیا ہے) کیا سید الخلق و
حبیب حق صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر نہیں کرتے ہو کہ آپ کے اس مقام کو کس طرح اس
قول سے تعبیر کیا گیا۔
سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا ۔ وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ کو شب کے
وقت لے گیا۔ اس کے بعد بندہ نے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سے تمکین کی درخواست کی (جیساکہ
شروع میں اس کا بھی ذکر ہے) اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ الخ (ہم کو سیدھا راستہ بتلا
دیجئے) سے بھی اسی تمکین کا طالب ہوا اور اس قول سے کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ
(نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے) تلوین سے
پناہ مانگی۔ پس طالب کامل ہو کر اس نے صعود کیا۔ اور کامل ہو کر اس نے رجوع و نزول کیا
اور گویا اسی لطیفہ کے سبب نماز کو معراج مومن کہا گیا۔

اصلاح باطن اور اس کے لوازمات

باطن کے متعلق دو قسم کے اوصاف ہیں ایک محمود، دوسرے مذموم۔ سو حقیقت
اصلاح کی یہ ہے کہ اوصاف محمودہ کو پیدا کرے اور اوصاف مذمومہ کو دور کرے۔ پہلے کو
"تحلیہ" کہتے ہیں اور دوسرے کو "تخلیہ" اور "تجلیہ" کہتے ہیں۔ اسی طرح تحصیل ولایت
کے جتنے کا نام عرف میں تصوف ہو گیا۔ اب ان اوصاف حمیدہ اور اوصاف ذمیمہ کو

۱؎ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صراط مستقیم [illegible] کہ اس صراط مستقیم کا اتباع کیا جائے
(جن کو اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ سے تعبیر کیا ہے) اور اس کے لیے صرف کتب و اوراق کافی نہیں۔ نیز اشارہ
ہے اس طرف کہ مطلوب صراط مستقیم تشریعی ہے نہ کہ تکوینی، جو صرف منعم علیہم کے ساتھ [illegible] نہیں بلکہ تمام
مخلوق کو عام ہے۔ (مسائل السلوک [illegible])

۲؎ [illegible]

۳؎ التصوف هو علم تعرف به احوال تزكية النفوس وتصفية الاخلاق وتعمير
الظاهر والباطن لنيل السعادة الابدية وموضوعه التزكية والتصفية [illegible]
[illegible]

معدوم کرنا چاہیئے۔ یوں تو بے شمار اوصاف ہیں مگر ان کے اصول معدود ہیں۔ کچھ اوصاف حمیدہ
اور کچھ اوصاف ذمیمہ جن کے حاصل یا زائل کرنے کے لیے حضرت شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے صاف صاف امر فرمایا ہے[۱] ان اوصاف کو جب یہ درست ہو جاویں۔ اصطلاح صوفیہ میں
مقامات[۲] کہتے ہیں پس تقریر مذکور سے واضح ہو گیا کہ مقاصد اس فن کے یہی مقامات ہیں اور طالب
کا اصلی کام یہ ہے کہ ان کو درست کرے اور ان کے درست کر لینے کو تحصیل ریاضت[۳] کہتے ہیں اور ایک
طریق ریاضت و مجاہدے کا اجمالی ہے اس کے اصول ائمہ فن کے نزدیک چار امر ہیں[۴] قلت الکلام،
قلت الطعام، قلت المنام، قلت الاختلاط مع الانام۔ غرض ریاضت و مجاہدہ خواہ تفصیلاً ہو یا اجمالاً
اس سے قلب سالک میں استعداد قریب وصول الی اللہ کی[۵] پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے بعد
محض فضل خداوندی سے اس کے قلب کو بالفعل ایک خاص تعلق جذب مطلوب حقیقی کی طرف
پیدا ہو جاتا ہے اس کو نسبت، سکینہ[۶] اور نور سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی نسبت کے پیدا ہو

التعبیر المذکور وغایتہ نیل السعادۃ الابدیۃ وربما لہ ما یذکرون کتبہ من المقاصد
(القشیریۃ)۔ [۱] اب اس کہنے کی گنجائش نہیں کہ شارع نے تصریح نہیں فرمایا ۱۲ [۲] المقام ما یتحقق
بہ العبد بمنازلۃ من الآداب مما یتوصل الیہ بنوع تصرف ویتحقق [illegible] عند
ذلک وما ھو مشتغل بالریاضۃ الی ان قال فان من لا قناعۃ لہ لا یصح التوکل
الخ (القشیریۃ) ۱۲ [۳] وھو ان یعلمہ [illegible] الخلوۃ والصمت والجوع الخ (الادلۃ)
[۴] اجمالی [illegible] کہ صفات رذیلہ [illegible] اوصاف حمیدہ حاصل نہ شوند
استعداد وصول الی اللہ [illegible] ۱۲ [۵] یرجع الطرق کلہا الی تحصیل ھیئۃ
نفسانیۃ تسمی عندھم بالنسبۃ لانہا انتساب وارتباط باللہ عز وجل وبالسکینۃ
وبالنور الی قولہ والغرض من اشغال تحصیل نسبۃ والمواظبۃ علیہا
واستغراق فیہا حتی یصیر للنفس ملکۃ راسخۃ ولا نقول ان النسبۃ
لا تحصل الا بہذہ الاشغال بل ھذا طریق من غیر حصر فیہا وغالب الرای
عندی ان الصحابۃ والتابعین کانوا یحصلون السکینۃ بطرق اخری منہا
المواظبۃ علی العبادات الی آخرہا (القول الجمیل)۔

جانے کا نام "وصول" ہے۔ پچھلے زمانہ میں بوجہ برکت قرب عہد حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
اس مقام پر جو نسبت قوی پیدا ہو جانے کے وصول کامل ہو جاتا تھا لیکن اس زمانہ میں اکثر
اس مقام پر نسبت ضعیف پیدا ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا فرض ہے اور نسبت قویہ اور وصول
کامل کے لیے "اذکار" "اشغال" و "مراقبات" کی حاجت پڑتی ہے جس کا حاصل کرنا مندوب
ہے۔ اہلیت خلافت و شیخیت کا ادنیٰ درجہ اس قوت نسبت کے حاصل ہو جانے پر میسر آ
جاتا ہے۔ پھر بعد حصول نسبت قویہ کے چونکہ اس کو انفاس سے تعلق ہو گیا ہے۔ بوجہ
صفائی قلب اس پر کچھ علوم و اسرار کشفی حالات و آثار نازل ہوتے ہیں۔ ان علوم کو حقائق[1] و معارف
اور ان آثار کو احوال کہتے ہیں اور بعض اوقات کسی جذبہ غیبی سے یا کسی بزرگ کی توجہ و صحبت
سے اول نسبت حاصل ہوتی ہے اس کے بعد مقامات کی تصحیح ہوتی ہے اور یہ اقرب
طریق ہے اور اکثر اس زمانے میں معروف شیخ یہی ہے اور یہ طریق "طریق عشق" سے
ملقب ہے۔ شعر

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد ❊ او ز حرص و عیب کلی پاک شد

پہلے شخص کو سالک مجذوب، مرید اور محب کہتے ہیں۔ دوسرے کو مجذوب سالک، مراد
اور محبوب کہتے ہیں اور تقدیم سلوک کو ہدایت اور تقدیم جذب کو اجتبا کہتے ہیں۔ پس
ترتیب سلوک اہل طریق کے نزدیک یوں ہوتی کہ اول قلب میں ارادہ پیدا ہوا۔ اس وقت
اپنے کو کسی شیخ کامل کے سپرد کرنا چاہیے جس کا عنوان اس زمانہ میں بیعت ہے پھر شیخ

---

[1] الحقیقة الشاهد [illegible] معانی [illegible] (قشیریہ حاشیہ ص۴۵) الحال
عند القوم معنی یرد علی القلب من غیر تعمد منهم ولا اجتلاب ولا اکتساب لهم
من طرب او حزن او بسط او شوق او انزعاج او هیبة او اهتیاج فالاحوال مواهب
والمقامات مکاسب (قشیریہ) [2] [illegible] جذب یعنی کشش [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
(باقی اگلے صفحہ پر)

اول جیسے ہر مطلوب میں کچھ مبادی ہوتے ہیں، کچھ مقاصد، کچھ زوائد و توابع۔ اصل مقاصد ہوتے ہیں اور مبادی اس سے مقدم مگر مقصود بالعرض اور زوائد اس سے مؤخر مگر غیر مقصود۔ اسی طرح اس طریق میں بھی بعض مبادی ہیں اور وہ چند علوم و مسائل ہیں جو بصیرت فی المقصود کے موقوف علیہ ہیں اور بعض مقاصد ہیں کہ وہی مقصود بالتحصیل ہیں اور ان کی بقا کامیابی اور ناکامی کا مدار ہے اور بعض زوائد و توابع ہیں کہ ان کا وجود نہ معیار کامیابی ہے نہ عدم معیار ناکامی (یعنی غیر مقصود ہیں)

ثانیاً جیسے مجموعہ مبادی کے اجزائے مذکورہ بالا ہے جو خلاصۂ اعظم المبادی و جمع المبادی ہے اور دوسرے مبادی پر اس کے سلوک میں وقتاً فوقتاً تنبیہ و اطلاع کی جاتی رہتی ہے اور مقاصد اعمال خاصہ ہیں جو افعال اختیاریہ ہیں جن میں ایک حصہ اعمال صالحہ متعلق بجوارح ہیں جن کو سب جانتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج و دیگر طاعات واجبہ و مستحبہ۔ اور دوسرا حصہ اعمال صالحہ متعلق بقلب و نفس ہیں مثل اخلاص و تواضع و حب حق و شکر و صبر و رضا و تفویض و توکل و خوف و رجا و امثالہا اور ان کے اضداد کا ازالہ اور ان اعمال اختیاریہ کو مقامات کہتے ہیں اور یہی نصوص میں بھی مامور بہا بالتفصیل ہیں اور ان کے اضداد مامور بالازالہ والرفع۔ اور ان اعمال کی غایت تعلق مع الحق (یعنی نسبت) و رضائے حق ہے کہ روح اعظم سلوک کی یہی ہے اور زوائد احوال خاصہ ہیں مثل ذوق و شوق، قبض و بسط، صحو و سکر، غیبت و جمع، استغراق و اشباہہا۔ اور یہ امور غیر اختیاریہ ہیں۔ اعمال مذکورہ پر اکثر ان کا ترتب ہوتا ہے اور گاہ نہیں ہوتا۔ یہ احوال نہ مامور بہا ہیں نہ ان کے اضداد مامور بالازالہ، اگر ترتب ہو جاوے محمود ہے، اگر نہ ہو تو مقصود میں کچھ خلل نہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے المقامات مکاسب و الاحوال مواہب (یعنی مقامات اختیار سے حاصل ہوتے ہیں اور کیفیات و احوال عطائے ربی ہیں) پس خلاصہ یہ ہوا کہ طریق میں تین امور سے بحث ہے یعنی تین امور ہیں جن سے بحث کی جاتی ہے :

(۱) علوم جن سے مقصود میں بصیرت ہوتی ہے۔

(۲) اعمال جو کہ مقصود ہیں اور ان کا اہتمام ضروری ہے۔

(۳) احوال۔ جو کہ مقصود نہیں گو محمود ہیں۔ ان کے درپے ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔

ثالثاً یہ قواعد کلیہ ہیں۔ باقی جزئیات کا ان پر انطباق، اس میں شیخ کی ضرورت ہے کہ اس کا درجہ طبیب کا سا ہے اور طالب کا درجہ مریض کا سا۔ طبیب سے اپنا حال کہا جاتا ہے۔ وہ نسخہ تجویز کرتا ہے اس کا استعمال کر کے اس کو اطلاع دی جاتی ہے وہ پھر جواب دیتا ہے اس پر عمل ہوتا ہے اسی طرح تا حصول صحت سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی طرح طریق سلوک میں بھی دوامر یعنی اطلاع و اتباع تا حصول مقصود یعنی رسوخ نسبت بحق ضروری ہیں۔ مطلب یہ کہ جب تک کامل نسبت اور وصول پیدا نہیں ہوتا جملہ امراض سے شیخ کو مطلع کرتا رہے اور اس کی طرف سے تجویز کردہ نسخہ شفاء کو استعمال میں لاتا رہے۔
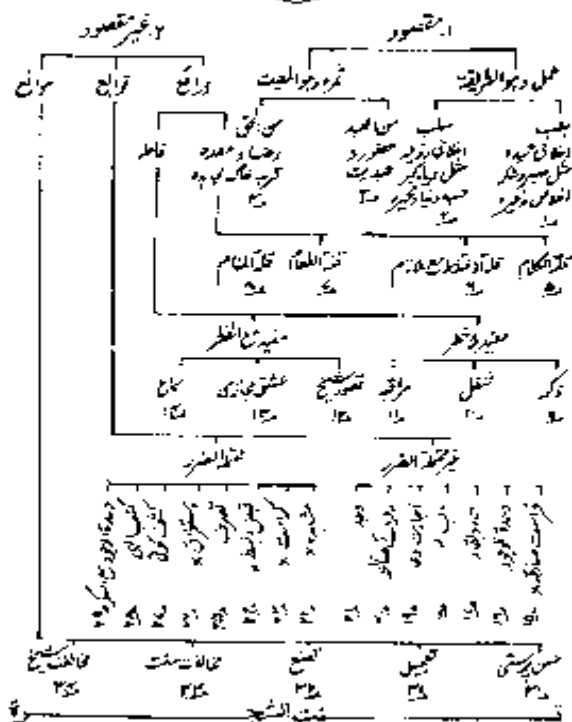
ترتیب حصولِ سلوک اور اس کے عنوانات

یہ مختصر جان لینے کے بعد اس بات کا جان لینا بھی ضروری ہے کہ اس راہ میں گامزن ہونے سے پہلے ترتیب سلوک کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ صحیح ترتیب یہ ہے کہ اول گناہوں سے توبہ خالصہ کریں اور کچھ عبادات واجبہ نماز روزہ وغیرہ اگر فوت ہوئی ہوں تو ان کو قضا کرنا شروع کردیں اور اگر ذمہ پر کچھ حقوق العباد ہوں تو ان کے ادا کرنے کے بندوبست میں لگ جاویں یا اہل حق سے معاف کرالیں۔ کیونکہ بدون اس کے کہ ان سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر عمر بھر بھی ریاضت و مجاہدہ کرتے رہیں گے، ہرگز مقصود حقیقی تک رسائی نصیب نہ ہو گی اور توبہ کے ساتھ آئندہ کے لئے بھی عزم مصمم رکھیں کہ اللہ و رسول کی اطاعت میں گو نفس کو کتنی ہی ناگواری ہو اور گو مال یا جان کا کتنا ہی بڑا ضرر ہو اور گو نقصان دنیوی مصلحت کیسی ہی فوت ہوتی ہو۔ اور گو خلق کتنا ہی ملامت کرے سب برداشت کریں گے لیکن اللہ و رسول کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیں گے اگر اتنی ہمت نہیں تو وہ طالب حق نہیں ہیں۔ کیونکہ طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے۔ شعر ؎

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

یعنی محبوب کے راستہ کو جو اپنے اندر جسم و جان کے لیے ہزاروں خطرات رکھتا ہے طے کرنے کی اگر خواہش ہو تو اس میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ دیوانہ بن جائے اور جب یہ امور انجام پا جائیں تو بقدر ضرورت علم دین حاصل کیا جائے پھر شیخ کامل کی جستجو کی جائے۔

پس امور مذکورہ کی ترتیب کے اعتبار سے عنوانات کی یوں ترتیب ہوئی۔ ارادت و بیعت ریاضت جمالی و تفصیلی، اذکار، اشغال و مراقبات، احوال، معارف و حقائق اور چونکہ ہر فن میں کچھ اصطلاحات ہوتی ہیں جن کے نہ جاننے سے قوم کے کلام سمجھنے میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضر مطلوب میں کچھ موانع پیش آجاتے ہیں اسی طرح کچھ مسائل جزئیہ بھی ہوتے

۱؎ قصد السبیل صفحہ ۔ ۲؎ تعلیم الدین صفحہ ۹ ۔

ہیں۔ اس طرح کچھ اغلاط بھی ناواقفی سے واقع ہو جاتی ہیں تو اس میں تنبیہ کی حاجت ہے جس کو اصطلاحات کہنا چاہیے۔ بعض امور کسی اشتباہ کے دفع یا کسی مرض باطنی کے علاج یا کسی عمل کے طرز و طریق ہیں اس کو تحقیقات سے تعبیر کرنا مناسب ہے اور بعض امور ظاہر نظر میں حدود جواز سے متجاوز معلوم ہوتے ہیں اگر واقع میں وہ داخل حدود ہیں تو ان کی تاویل اور تطبیق کی جاوے۔ ان کو توجیہات کہنا خوب ہے اور ایسے امور جو ان کلیات سے کسی کی زد میں نہ ہوں ان کو متفرقات کہا جائیگا۔ اسی طرح مشائخ کا معمول رہا ہے کہ کچھ کلمات جامعہ بطور وصیت کے طالبین کو فرماتے ہیں۔ بتوفیق اللہ تعالیٰ ان سب مضامین کو الگ الگ ابواب میں بترتیب مذکور لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تکمیل فرمائیں۔ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔

۱؎ التکشف صفحہ ۲۱۵ ، ۲؎ تعلیم الدین صفحہ ۲۹

۳۔ بیعت وارادت

باب اوّل ——— بیعت کا بیان

عن عوف بن مالک الاشجعی قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسعۃ او ثمانیۃ او سبعۃ فقال الا تبایعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبسطنا ایدینا وقلنا علام نبایعک یا رسول اللہ۔ قال علی ان تعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وتصلوا الصلوات الخمس وتسمعوا وتطیعوا۔

(مسلم، ابوداؤد، نسائی)

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ نو یا آٹھ یا سات۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت نہیں کرتے ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور عرض کیا کہ کس امر پر آپ کی بیعت کریں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا ان امور پر کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور پانچوں نماز پڑھو اور (احکام) سنو اور مانو۔ اس کو مسلم، ابوداؤد و نسائی نے روایت کیا۔

اثبات بیعت اور اس کی حقیقت

حضرات صوفیائے کرام میں جو بیعت معمول ہے جس کا حاصل التزام احکام (یعنی اعمال ظاہری و باطنی پر استقامت) و اہتمام کا معاہدہ ہے جس کو ان کے عرف میں "بیعت طریقت" کہتے ہیں بعض اہل ظاہر اس کو اس بنا پر بدعت کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں۔ صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعت جہاد کرنا معمول تھا مگر اس حدیث میں اس کا صریح اثبات موجود ہے کیونکہ مخاطبین چونکہ صحابہؓ ہیں اس لیے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں

لہ : التکشف صہ ۳۱۶

جگہ بدلات الفاظ معلوم ہے کہ التزام و اہتمام اعمال کے لیے ہے لیکن اس کے سنت ہونے
میں کوئی شبہ نہیں لیکن بوجہ اشتباہ بیعت خلافت کے سلف نے صحبت پر اکتفا فرمایا پھر
خرقہ کی رسم بجائے بیعت کے جاری ہوئی جب وہ رسم (بیعت) خلفاء میں متروک ہوگئی تو صوفیہ نے اس
مردہ سنت کو پھر زندہ کیا۔[۱]

(بیعت کی اصلی حقیقت خود لفظ بیعت و ارادت اور مرید کی اصطلاح بلکہ لفظی معنی
ہی سے واضح ہو جاتی ہے ارادہ محض تمنا اور تمنا کا نام نہیں بلکہ مراد کو پورا کرنے کے لیے
ضروری اسباب و وسائل کی بہم آوری میں لگ جانا یا منزل مقصود کی طرف چل پڑنا ہے پس
مرید بھی اصطلاحاً وہ ہے جو اپنی دینی خصوصاً باطنی و قلبی اصلاح و درستی کو مراد و منزل بنا کر
اس کے ضروری وسائل اختیار کرتا اور اس کی طرف چل پڑتا ہے اور بیعت کے معنی یہ ہیں کہ اس
منزل مقصود کے لیے کسی زیادہ واقف کار کو رہبر و رہنما بنا لیے تاکہ اس کے پیچھے یا ساتھ چلتا
تاکہ نہ صرف گمراہی کے خطرات سے حفاظت ہو بلکہ راستہ سہولت و راحت سے قطع ہو بالفاظ
دیگر اپنے سے زیادہ واقف و ماہر مصلح کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سونپ دے جیسے مریض
کسی حاذق طبیب کے حوالے اپنے کو کر دیتا اور وہ اپنے مرض کا علاج اس کی تجویز و ہدایت پر
عمل کرتا ہے۔

پیری و مریدی یا بیعت و ارادت کی حقیقت و ضرورت میں بہت افراط و تفریط سے
کام لیا گیا ہے ایک طرف اس کو سرے سے بعضوں نے بدعت سمجھ رکھا ہے اور دوسری
طرف صرف ایک رسم بنا رکھا ہے کہ بس دست بوسی و پابوسی کر لی باقی خود کچھ کرنے کرانے کی
ضرورت نہیں حالانکہ رسمی پیری مریدی تو کچھ نہیں بلکہ اصل کام خود چلنا ہے اور کسی رہبر کا
ہاتھ پکڑنا۔ اگرچہ (رسمی) مرید کسی سے بھی نہ ہو یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ میں داخل ہونے سے
برکات کچھ نہیں لیکن اس کو اصل الاصول سمجھنا بڑی غلطی ہے (بلکہ) اصلی غرض اور مقصود
سلوک کا رضائے حق کو سمجھے جس کا طریق احکام شرعیہ کا بجا لانا اور ذکر بہ عادت کرنا ہے
شیخ اس کی تعلیم و تلقین کرتا ہے اور مرید اس پر کاربند ہوتا ہے اگرچہ کوئی کیفیت

---

[۱] تعلیم الدین ص، [۲] تصوف و سلوک ص ۹۹، [۳] قصد السبیل ص

معلوم نہ ہوا ورنہ کوئی کمال کسی کے زعم میں حاصل ہو تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ جو کہ رضا ہے ظاہر ہوگا اور رضا سے دخولِ جنت ولقاء حق اور دوزخ سے نجات میسر ہوگی۔ اور شیخ کی طرف سے تعلیم کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اتباع کا عہد یہی پیری مریدی کی حقیقت ہے اور اگرچہ تعلیم بلا بیعت متعارفہ (یعنی مشہورہ) بھی ممکن ہے لیکن خاص طور پر بیعت کرنے میں طبعاً یہ خاصیت ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے اور مرید کو پاس فرمانبرداری کا زیادہ ہو جاتا ہے اور شیخ کی تعیین (یعنی ایک معین شخص ہونا) اور وحدة (یعنی ایک ہی ہونے) میں بھی یہی حکمت ہے کہ اس سے جانبین کو خصوصیت بڑھ جاتی ہے اور باقی ہاتھ میں ہاتھ لینا یا عورت کو کوئی کپڑا وغیرہ پکڑا دینا جبکہ وہ پاس ہو یہ محض ایک معاہدہ کی تاکید کے لیے ایک عادتِ صالحہ مستحسنہ ہے اور معاہدہ کا جزو نہیں (نہ مقصود ہے نہ کسی مقصود کا موقوف علیہ) اسی وجہ سے غائب کے لیے اس کی رسم نہیں (یعنی غائب کی بیعت بغیر ہاتھ میں ہاتھ لیے بذریعہ تحریر وغیرہ بھی ہو جاتی ہے) اور اس کا استحسان سنت میں بھی وارد ہے چنانچہ مردوں کے لیے ہاتھ پکڑنا منقول ہے اور کپڑا وغیرہ ہاتھ میں دینا یہ ہاتھ پکڑنے کے قائم مقام ہے۔[1]

بیعت کی ضرورت

یہ تحقیق ہے کہ بیعت طریقت کی ضرورت عام نہیں لیکن باوجود اس کے پھر بھی نفس میں بعض امراض خفیہ ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں آبھی جاتے ہیں تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا اور جو معلوم ہوتا ہے نفس کی کش مکش سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے[2] ان ضرورتوں سے پیر کامل کو تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے اور ان کا علاج و تدبیر بتلاتا ہے کیونکہ خود اپنی حالت کو سمجھنا آسان نہیں ہے اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے کیونکہ وہ بہت سے مغالطے دیکھ چکا ہے اور بہت سے گرم و سرد دیکھ چکا ہے۔ جو حالت تم کو پیش آئی ہے وہ اس کو بارہا پیش آچکی ہے اس کو بھی کسی صاحب بصیرت نے سنبھالا تھا یا بار بار تجربہ ہونے سے اس کو ایک بصیرت حاصل ہو گئی ہے تو وہ ہر

---

۱ انفاس عیسیٰ ص۱۹، ۲ قصد السبیل ص۳۲ ۳ ایضاً ص۱۵

حالت کو پہچانتا ہے کہ اس میں کتنا حق اور کتنا باطل شامل ہے اور کتنی واقعیت اور کتنا دھوکہ ہے اور اپنے آپ اپنی حالت کو اگر کوئی شخص کسی وقت پہچان بھی لے لیکن اپنی تشخیص پر اطمینان نہیں ہو سکتا۔ پوری پہچان اسی کو ہے جو بار با تجربہ کر چکا ہے پھر اس کے ساتھ حق تعالیٰ کی مدد بھی شامل ہو تو ہے اس کا بتایا ہوا علاج سہل اور کامل ہوتا ہے (کوئی شخص کتنا ہی عالم فاضل ہو اور طب کی کتابیں بھی پڑھ لیتا ہو مگر باقاعدہ کسی طبیب کے پاس رہ کر مشق نہ کی ہو اگر وہ خود اپنا علاج محض کتابی نسخوں سے کرنے لگے تو خطرے کا باعث نہیں تو اور کیا ہے۔ لہٰذا کتب[1] طب سے کوئی مریض اپنا علاج نہیں کر سکتا۔ حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے۔ اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے۔ مجھے ہر سال برسات کے اخیر میں بخار آیا کرتا تھا اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے تھے میں نے کہا لاؤ اس کو لکھ لیں۔ جب بخار آیا کرے گا تو اس کو استعمال کر لیا کریں گے۔ چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا مگر خاک نفع نہ ہوا۔ آخر کار حکیم صاحب کو بلایا انھوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہوا پھر تحقیق ہوئی کہ اس سال صفرا کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں اب اگر میں نے یہ نسخہ بھی نقل کر لیا کہ جو اس میں صفرا و بلغم دونوں کی رعایت ہے تو اس کا اندازہ کیسے ہوتا کہ اس سال بلغم صفرا سے زیادہ ہے یا مساوی ہے یا کم ہے اس کا اندازہ تو طبیب ہی کر سکتا ہے جو مریض کی حالت کو پہچانتا ہو اس لیے کتب طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے

غرض[2] نہ بغیر چلے کام چلتا ہے نہ بغیر رہبر۔ یہ عادت چلتا ہے اگر ایک نابینا کسی جگہ پہنچنا چاہے تو اول اس کو خود چلنے کی ضرورت ہے اگر چلے نہیں تو ہزار رفیق کتنے ہی ملتے پر راستہ قطع نہ ہوگا۔ البتہ چلنے کے بعد رہبر اور رفیق کی بھی ضرورت ہے کیونکہ اگر رہبر ساتھ نہ ہو تو نابینا راستہ میں ضرور کسی جگہ ٹھوکر کھا کر گرے گا بے خطر منزل پر پہنچنے کی صورت یہی ہے کہ اپنے پیروں سے چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑ لے۔ بالکل ویسی ہی حالت اس راستہ کی بھی ہے کہ ارادہ کر کے اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں چلنا ہے اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کو

---

[1] [illegible]، [2] [illegible]

ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔

(الغرض) عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ کوئی کمال بدون استاد کے حاصل نہیں ہوتا تو جب اس راہ (طریقت) میں آنے کی توفیق ہو استاد طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہیے جس کے فیض تعلیم و برکت صحبت سے مقصود حقیقی تک پہنچے۔ اشعار ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا — دامن رہبر بگیر و پس بیا

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق — عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

(یعنی اے دل اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ کے چلو اس لیے کہ جو بھی عشق کی راہ میں بلا رفیق کے چلا اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہوا) اور مولانا روم فرماتے ہیں شعر ؎

یار باید راہ را تنہا مرو — بے قلاوز اندریں صحرا مشو

(یعنی باطنی راستے کے لیے کوئی رفیق ساتھ لے لو تنہا اس راستہ کو طے کرنے کا ارادہ نہ کرو کیونکہ تم تنہا اس کو قطع نہیں کر سکتے)۔

باب دوم۔ شیخ کامل کا بیان

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المرء علی دین خلیلہ فلینظر احدکم من یخالل۔	حضرت ابو ہریرہ رضی سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریق پر ہوتا ہے۔ سو اسے دیکھنا چاہیے کہ کس کے ساتھ دوستی کرتا ہے۔
واخرجہ ابو داؤد والترمذی)	(ابو داؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

ظاہر ہے کہ پیر سے اعلیٰ درجہ کی محبت ہوتی ہے اور جب معمولی دوستی دین کے اندر مؤثر ہے تو اتنی بڑی دوستی اس تاثیر سے کیسے خالی رہے گی چنانچہ مشاہدہ ہے کہ پیر کے عقائد و اعمال و اخلاق کا اثر مرید میں سرایت کرتا ہے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم استحسان ہی کے درجہ میں ضرور

ے تعلیم الدین صفحہ [illegible]۔ ے الغالی صفحہ [illegible]، ے التکشف صفحہ [illegible]

اثر کرتا ہے۔ یعنی مرید ان امور کو مستحسن سمجھتا ہے پس اگر پیر کی حالت خراب ہوئی تو مرید کا خراب ہونا ظاہر ہے اس لیے تلاش پیر میں بڑی احتیاط چاہیے۔ اس لیے زیادہ تر بے پروائی برتی جاتی ہے جس کی اصلاح واجب ہے۔

چونکہ بدون علامات تلاش ممکن نہیں اس لیے اس مقام پر شیخ کامل کی حقیقت اور اس کے شرائط و علامات مرقوم ہوتے ہیں۔

شیخ کامل کی اہمیت اور اس کی پہچان

کار مرداں روشنی و گرمی ست　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست [1]

روشنی سے مراد نور ایمان و عرفان، گرمی سے مراد گرمی عشق۔ اس میں اشارہ ہے شیخ کامل کی پہچان کی طرف کہ ان کے یہ صفات ہیں (معرفت اور عشق الٰہی) اور جو کمینے اور جھوٹے ہیں ان کی عادت حیلہ (مکر و فریب) اور بے حیائی ہے۔

مولانا رومیؒ نے شیخ کامل کی علامات اجمالاً بیان فرمائی ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح مرض ظاہری کے علاج کے لیے ایسے طبیب کی ضرورت ہے جو خود بھی صحیح و تندرست ہو، مریض نہ ہو اور دوسروں کا علاج بھی کر سکے، کیونکہ اگر مریض ہے تو مسئلہ طبیہ ہے "رأی العلیل علیل" (یعنی بیمار کی رائے بھی بیمار ہے) گو وہ طبیب ہو مگر اس کی رائے قابل اعتبار نہیں۔ اور اگر وہ خود صحیح و تندرست ہے مگر علاج کا طریقہ نہیں جانتا تب بھی اس مریض کے مطلب کا نہیں۔ گو خود اچھا ہے اسی طرح امراض باطنی کے علاج کے لیے ایسے مرشد کی ضرورت ہے جو خود بھی متقی اور صالح ہو۔ بددین (اہل بدعت) و فاسق نہ ہو اور دوسروں کی تکمیل بھی کر سکتا ہو کیونکہ اگر بد عقیدہ و بدعمل ہے تو اوّلاً اس پر یہ اطمینان نہیں کہ یہ خیر خواہی سے تعلیم کرے گا بلکہ غالب تو یہی ہے کہ عقیدہ میں اپنے جیسا بنانے کی کوشش کرے گا اور عمل میں اس کو اس لیے نصیحت نہ کر سکے گا کہ خود اس کا عامل نہیں یہی خیال ہوگا کہ اگر نصیحت کروں گا تو یہ شخص اپنے دل میں کیا کہے گا بلکہ غالب یہ ہے کہ خود بھلا

---

[1] تعلیم الدین صفحہ ۱۹۲، [2] التکشف صفحہ ۹۱

بنے کو اپنی تکمیل کوتاہی سے درست کرنا چاہے گا تو اس میں بڑی گمراہی کا اندیشہ ہے۔
ثانیاً اس کی تعلیم میں انوار و برکات و تاثیر و امداد غیبی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر متقی و صالح تو ہو
مگر تربیت باطنی کا طریقہ نہ جانتا ہو تو بھی طالب کی رفع ضرورت نہیں کر سکتا اور جس طرح
طبیب ظاہری کا طبیب ہونا ان علامات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم طب پڑھا ہو کسی طبیب
کامل کے پاس مدت معتدبہ تک مطب کیا ہو۔ سمجھدار لوگ اس کی طرف رجوع ہوں اس کے
ہاتھ سے لوگ شفایاب بھی ہوتے ہوں اسی طرح طبیب باطنی یعنی شیخ کے شیخ ہونے کی
علامات یہ ہیں کہ:

(۱) علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو۔ خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے تاکہ فساد
عقائد و اعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے۔ ورنہ مصداق ؎

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

(۲) عقائد، اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔
(۳) تارک دنیا، راغب آخرت ہو ظاہر و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔
(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبہ دنیا ہے۔
(۵) بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو ان سے فیوض و برکات حاصل کئے ہوں
(۶) تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو اور ان کی کوئی برئی بات
سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے۔
(۷) جو لوگ اس سے بیعت ہیں ان میں اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع وقلت
حرص دنیا کے اچھی ہو۔
(۸) اس زمانے کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔
(۹) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم و دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔
(۱۰) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں
ترقی محسوس ہوتی ہو۔

ا۔ (۱) (۳) از تعلیم الدین صفحہ ۳۷ ، (۲) (۴) (۶) تا (۱۰) از قصد السبیل صفحہ
(۱۵)

باب سوم: مناسبت شیخ و مرید کا بیان

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ارواح
صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَرْوَاحُ	لشکر ہے مجتمع ہیں۔ جو ارواح عالم ارواح میں باہم
جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا	متعارف تھیں جن میں (وہاں) باہم جان پہچان ہوئی
ائْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا	ان میں (یہاں بھی) باہم الفت ہے اور جن
اخْتَلَفَ۔ اخرجه مسلم و	میں وہاں پہچان نہیں ہوئی۔ ان میں اختلاف
ابو داؤد	مزاج ہے۔

یہ امر تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ فیوض باطنی کے لیے پیر و مرید کی باہمی مناسبت فطری شرط ہے۔ اس حدیث کے عموم میں یہ مناسبت بھی داخل ہے کیونکہ نفع عادۃً الفت پر موقوف ہے اور بعض حدیث الفت عالم ارواح کے تعارف پر موقوف ہے جو مناسبت فطری کی حقیقت ہے اور یہی مناسبت ہے جس کے نہ ہونے پر شیخ طالب کو اپنے پاس سے (بعض دفعہ) دوسرے شیخ کے پاس جس سے مناسبت مظنون یا معروف ہو بھیج دیتے ہیں (کیونکہ) اس طرح اپنے مصلح کے ساتھ مناسبت ہونا بڑی ضروری چیز ہے۔ بدوں مناسبت کے طالب کو نفع نہیں ہو سکتا اور مناسبت شیخ (جو افادہ و استفادہ کا مدار ہے) کے معنی یہ ہیں کہ شیخ سے مرید کو اس قدر مناسبت ہو جاوے کہ شیخ کے کسی قول و فعل سے مرید کے دل میں طبعی تکدر پیدا ہو گو عقلی ہو یعنی شیخ کی سب باتیں مرید کو پسند ہوں اور مرید کی سب باتیں شیخ کو پسند ہوں اور یہی مناسبت بیعت کی شرط ہے ولہٰذا پہلے مناسبت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے اس کی سخت ضرورت ہے۔ جب تک یہ نہ ہو مجاہدات، ریاضات، مراقبات و مکاشفات سب بیکار ہیں کوئی نفع نہ ہوگا۔ اگر طبعی مناسبت نہ ہو تو عقلی پیدا کر لی جائے اسی پر نفع موقوف ہے۔ اس لیے جب تک پوری مناسبت نہ ہو بیعت نہ کرنی چاہیے جیسے پودے کی طرح راہ پر پڑ جاوے۔ خوب محبت (اور مناسبت) ہو جاوے اس وقت پیر سے بیعت زیادہ نافع ہے۔

شرح الکشف صفحہ ۳ کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۵۵، ۲۰۶، ۲۱۰

اعمال میں ان کی صحبت سے برکت ہوگی اور جلد جلد ترقی ہوگی اور جلد اصلاح ہو جائے گی۔

(۱۴) اہل اللہ حضرات کے دل خدا کے نور سے روشن ہیں۔ ان کے پاس بیٹھنے سے نور آتا ہے اور جب نور آتا ہے تو ظلمت بھاگ جاتی ہے۔ بس اس نور سے ہر چیز کی حقیقت کھل جاتی ہے۔ اور شبہ جاتا رہتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اگر طبیعت میں سلامتی ہو تو بدوں پاس رہے صرف ان حضرات کا دیکھ لینا ہی کافی ہو جاتا ہے اور اگر اس درجہ کی سلامتی نہ ہو تو البتہ پھر چند دنوں کی صحبت کی بھی ضرورت ہے۔

طریق کار

صحبت[2] پرہیز کے ساتھ اختیار کی جائے۔ پرہیز یہ ہے کہ اہل دنیا کی صحبت سے بچیں۔ اور اہل دنیا وہ ہیں جو غیر اللہ کا تذکرہ زیادہ کریں۔ جن کی صحبت کی ملنے[3] ان کی طرف سے دل میں بداعتقادی اور انکار رکھ کر وہاں نہ رہیں۔ اگر پورا اعتقاد نہ ہو تو کم از کم دل میں اتنی گنجائش تو ضرور ہو کہ شاید ان کی بات صحیح ہو۔

جب[4] شیخ کامل میسر ہو جاوے اور اس سے بیعت کا ارادہ کریں تو اب بعد بیعت کے اگر وقت اور رخصت میسر ہو تو چندے اس کی خدمت میں رہیں اور اگر اس کی نوبت نہ آئے تو غائبانہ ہی اس کی تعلیم پر کاربند رہیں اور اگر ابتدا میں ذرا زیادہ اور اس کے بعد کبھی کبھی شیخ کی صحبت نصیب ہو جاوے تو نور علی نور ہے۔

مطالعہ کتب

اگر اہل اللہ[5] کی صحبت میسر نہ ہو تو کم از کم ان کے ملفوظات وغیرہ کا مسلسل بنظر اصلاح و استفادہ مطالعہ نہ صرف دین کی فہم و بصیرت کے لیے ضروری ہے۔ بلکہ اس سے اہل اللہ کا ایمان و عمل ہمارے اندر منتقل ہوتا اور قالب سے تجاوز کر کے قلب اور روح میں اترتا اور رچ جاتا ہے۔ حضرت مجدد الملت حکیم الامت الشاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ العزیز نے بھی براہ راست صحبت میسر نہ آنے کی صورت میں بزرگوں کے ملفوظات اور تقاریر ہی کے مطالعہ کی ہدایت فرمائی ہے بشرطیکہ نیت دینی و باطنی اصلاح و استفادہ کی ہو۔ نہ کہ آجکل کی طرح علمی و ادبی تحقیق و تنقید کی۔ خود حضرت حکیم الامت کے ملفوظات اور تقاریر

[illegible] [2] [illegible] [3] [illegible] [4] [illegible] [5] [illegible]

اگر وہ کسی دوسرے کا تقاضا محمود ہے تب تو مخالفت کی ضرورت نہیں اور اگر وہ کچھ کہے کہ یہ تقاضا
مذموم ہے تو اس کی مخالفت کی جائے (اس لیے کہ) مطلقاً مخالفت نفس کا نام مجاہدہ نہیں۔
بلکہ جہاں مرغوب نفس مامور بہ نہ ہو۔ ورنہ نفس مطمئنہ (خواہ وہ کامل درجہ کا مطمئنہ نہ ہو) کو بعض
اوقات مامور بہ کی رغبت ہوتی ہے حالانکہ اس کی مخالفت مجاہدہ نہیں (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
فرماتے ہیں): جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی
گئی ہے) یعنی امر مرغوب نفس صلوٰۃ ہو رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا ترک مطلوب نہیں اور مامور
بہ ہونا یہ دلیل سے معلوم ہوگا تو مجاہدہ کا محل دلیل سے متعین ہوگا نہ کہ محض رغبت یا عدم
رغبت سے۔

منافع نفس[۱] دو قسم کے ہیں، ایک حقوق جس سے قوام بدن اور بقائے حیات ہے
دوسرے حظوظ جو اس سے زائد ہیں۔ سو مجاہدہ و ریاضت میں حظوظ کی تقلیل یا ترک کرنا
یا اچھا ہے اور حقوق کو منع نہیں کیا جاتا کہ یہ خلاف سنت بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے
اِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا (بے شک تمہارے نفس کا تم پر حق ہے) کیونکہ اس سے ضعف
بڑھ جاتا ہے صحت میں خلل پڑتا ہے، پھر ضروری اشغال و عبادات سے بھی عاجز ہو جاتا
ہے۔ اس لیے ترقی باطنی سے محروم رہتا ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ بزرگوں نے جو ریاضات و
مجاہدات میں ترک لذات کیا ہے وہ بطور علاج کیا ہے۔ جیسے کوئی ظاہری مریض بطور پرہیز کے
کوئی لذیذ غذا چھوڑ دیتا ہے کہ مضر ہوگی اس کو عبادت اور موجب قرب الٰہی نہیں سمجھتا۔ اب
ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ بدعت ہے۔

قال اللّٰہ تعالٰی لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو پاک طیب چیزیں
مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا	اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان
	کو حرام مت کرو اور نہ حد سے بڑھو۔

کیونکہ بدعت اس وقت ہوتی ہے جب بطور تقرب ہو ورنہ خود ابن عباس رضی اللہ عنہ کی
روایت ہے۔

۱؎ کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۸۵ ۔ ۲؎ [illegible]

مِنَ الْاِسْرَافِ اَنْ تَاْكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ — یہ اسراف میں سے ہے کہ تو ہر چیز کی نفس خواہش کرے اس کو کھالے

پس مقصود ان حضرات کا یہ تھا کہ تکثیر لذات سے نفس کی قوت بہیمیہ کو غلبہ ہوتا ہے اور طاعات میں سستی اور کاہلی ہوتی ہے یا معاصی کا تقاضا کرنے لگتا ہے۔ بعض اوقات اسی وجہ سے لذات متروک ہو جاتی ہیں کہ غلبہ محبت الٰہی میں لذات کی طرف التفات نہیں ہوتا مگر یہ ترک غیر اختیاری ہے نہ سنت ہے نہ بدعت۔

مجاہدات و ریاضات کی ضرورت اور ان کا رواج

[۱] صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور یہ قوت بعض بڑی حد تک صحابہ میں تھی، مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تابعین میں بھی تھی مگر صحابہ سے کم، لیکن تبع تابعین میں یہ قوت بہت ہی کم ہو گئی اور اس کی کمی کی تلافی کے لیے بزرگوں نے مجاہدات و ریاضات ایجاد کیے۔

اعمال صالحہ میں مشقت ہمیشہ ہوتی ہے کیونکہ اعمال نفس کی خواہش کے خلاف ہیں، نفس ان میں مزاحمت ضرور کرتا ہے قلیل یا کثیر، اس لیے مخالفت نفس کی ہر شخص کو ضرورت ہے مبتدی کو بھی اور منتہی کو بھی۔ اور دونوں کو کبھی نہ کبھی اعمال میں مزاحمت نفس کی وجہ سے کسل بھی پیش آتا ہے، مبتدی کو زیادہ منتہی کو کم۔ اس کسل ہی کو دفع کرنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے نیز کسی وقت دونوں کا نفس معاصی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ کے لیے بھی مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ ایک غلطی تو مبتدی کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو مشقت سے بچانا چاہتا ہے، مجاہدہ کرتا ہی نہیں بلکہ اسی انتظار میں ہے کہ سارا کام بدون مشقت کے ہو جائے۔ اور ایک غلطی منتہی کرتا ہے کہ وہ ابتدا میں مجاہدہ کر کے آئندہ کے لیے مجاہدہ سے اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے اور یہ سخت غلطی ہے کیونکہ طبائع بشریہ بھی عود کرتے ہیں اور اس وقت منتہی کو بھی معاصی کا تقاضا ہوتا ہے اور اس کا نفس بھی طاعات میں بعض دفعہ کسل کرنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کو بھی مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر مبتدی اور منتہی کے مجاہدہ میں بڑا فرق ہے۔ جیسے ایک تو وہ سوار ہے جس کے نیچے اپنا گھوڑا ہے

---

[۱] [illegible]

بس پر ابھی سواری شروع کی گئی ہے اس کو زیادہ ہوشیاری کی بھی ضرورت ہے اور زیادہ
مشقت کا بھی سامنا ہے کیونکہ نیا گھوڑا بہت شرارت کرتا ہے اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے دوسرا
وہ شخص ہے جو ایسے گھوڑے پر سوار ہے جو سواری میں شائستہ ہو چکا ہے اس کو زیادہ مشقت کا
تو سامنا نہیں مگر ہوشیار رہنے کی اس کو بھی ضرورت ہے کیونکہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی کبھی بمقتضائے
حیوانیت شوخی کرنے لگتا ہے۔ مگر سوار کی ذرا سی دھمکی اس کے دفع کرنے کو کافی ہے لیکن اگر سوار
بالکل غافل رہا تو کسی وقت یہ شائستہ گھوڑا بھی اوپر سے بھی ضرور گرا دے گا پس نفس کی
نگہداشت کا مجاہدہ منتہی کو بھی لازم ہے۔

ہم جتنے گناہوں میں مبتلا ہیں سب کی اصل یہ ہے کہ ہم نفس کو مشقت سے بچانا چاہتے
ہیں اور جتنے اوامر کو ہم ترک کر رہے ہیں اس کی اصل بھی یہی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اصلاح
اعمال و اصلاح نفس کا مدار عادی مجاہدہ پر ہے۔ چنانچہ بے نمازی اسی لیے بے نمازی
ہے کہ وہ اپنے نفس کا اتباع کرتا ہے اور اس کو آرام دیتا ہے۔ اگر وہ مجاہدہ نفس کرتا تو
بے نمازی نہ ہوتا۔

غالب حالت یہی ہے کہ نماز روزہ وغیرہ میں مشقت ہوتی ہے اور اس مشقت میں بعض
اوقات مانعیت کی نوبت پہنچ جاتی ہے اور اس مشقت کی مانعیت کا علاج مجاہدہ ہے۔ اور وہ
مانع غالب دو ہیں۔ ایک اسباب تنعم، دوسرے ضعف نفس۔ یعنی باوجود عقیدہ صحیح کے رغبت اور
ترک پر طاقت پیدا ہونے کے بھی بعض دفعہ نفس ضعف و کم ہمتی کی وجہ سے ... اسباب تنعم
اور سامان راحت میں منہمک ہونے کے سبب نماز روزہ وغیرہ دشوار معلوم ہونے لگتے ہیں۔
اور بعض دفعہ نفس اپنی تسویل (یعنی بہکانے) سے ان موانع کے ساتھ عقیدہ صحیحہ سے بھی کنارہ کشی
کا کام لیتا ہے۔ مثلاً کسی وقت گناہ کا تقاضا ہوا تو نفس یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے
غرض نفس کی شہوت وغیرہ بعض دفعہ عقائد صحیحہ سے بھی کام لینے لگتی ہے اس لیے ایسی تدبیر
کی بھی ضرورت ہے جو اس مانع کا مقابلہ کرے اور وہ مجاہدہ ہے کیونکہ سب موانع کا حاصل یہ ہے
کہ نفس آرام و لذت چاہتا ہے۔ والعلاج بالضد۔ پس اس کا علاج یہی ہے کہ نفس کو مشقت
کا عادی بنایا جائے۔ لہٰذا نفس کی اصلاح بدون مجاہدہ کے نہیں ہو سکتی۔

مجاہدہ میں اعتدال | مجاہدہ[1] سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے بلکہ نفس کو مشقت کا عادی بنانا اور راحت و تنعم کی عادت نکالنا ہے اور اس کے لیے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ بالکل معطل و بیکار ہو جائے گا تو خوب سمجھ لو کہ محنت ہر شئے مستحسن نہیں بلکہ جب اعتدال سے ہو اور اس پر نتیجہ اچھا مرتب ہو اس وقت مستحسن ہے پس مجاہدہ میں افراط بھی مذموم ہے بلکہ اعتدال کی رعایت لازم ہے اسی کو شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

نہ چنداں بخور کز دہانت برآید ۔۔۔ نہ چنداں کہ از ضعف جانت برآید

(یعنی نہ اتنا زیادہ کھاؤ کہ منہ سے باہر آنے لگے اور نہ اتنا کم کہ جسم میں کمزوری لاحق ہو جائے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ	یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں جب وہ خرچ کرتے ہیں تو
يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا	نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ وہ
(الآیۃ)	خرچ اس کے درمیان میں معتدل ہوتا ہے۔

پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنا چاہیے مگر اس اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کریں بلکہ کسی محقق سے درجۂ اعتدال اور طریقِ مجاہدہ معلوم کریں۔

ریاضت اور مجاہدہ کے اقسام | ریاضت[2] و مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدۂ اختیاریہ دوسرا مجاہدۂ اضطراریہ جب کسی پر حق تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے تو اس کو مجاہدۂ اضطراریہ میں مبتلا کر کے صبر دیتے ہیں جس سے رفع درجات ہوتا ہے پس ایک مجاہدہ تو یہ ہے کہ خود تقلیل لذات کو اختیار کیا (اس کو مجاہدۂ اختیاریہ کہتے ہیں) اور ایک یہ کہ خود تو تقلیل لذت نہیں کی لیکن حق تعالیٰ نے اس کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا (اس کو مجاہدۂ اضطراریہ کہتے ہیں) مثلاً بچہ مر گیا پھر اس نے صبر کیا اس سے ترقی درجات ہوا۔ اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ	اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تم کو خوف، بھوک،
وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَ	مال، جان اور پھلوں کی کمی میں سے کسی چیز

---

[1] الجاہدہ صفحہ ۔ [2] کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۲۳

الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (البقرۃ) کمی کر کے آزمائیں گے

(تو اس) مجاہدۂ اضطراریہ میں بھی ثواب ملتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا چاہئے فرماتے ہیں:

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ — یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کا انعام

رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (البقرۃ) — اور رحمت ہے۔

ان مجاہدات اضطراریہ سے نفس کی تہذیب جلدی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رنج و غم میں اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔ ساری فول فال اور فرعونیت یکساں رخصت ہو جاتی ہے جو بات مجاہدات اختیاریہ سے برسوں میں حاصل نہ ہو وہ ان مجاہدات اضطراریہ سے ایک دن میں حاصل ہو جاتی ہے اور نفس ڈھیلا ہو جاتا ہے۔

مجاہدۂ اختیاریہ میں تو فعل کا غلبہ ہوتا ہے اور اس سے اس میں انوار زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ انوار کا ترتب عمل پر ہوتا ہے اور مجاہدۂ اضطراریہ میں فعل کم ہوتا ہے اس میں نورانیت کم ہوتی ہے لیکن اس میں انفعال کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس سے قابلیت میں قوت بڑھتی ہے اور اس انفعال و قابلیت کی خود اعمال اختیاریہ کے راسخ ہونے میں سخت ضرورت ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے اپنے ایسے مجاہدات بہت زیادہ کرائے ہیں، اور بعض اوقات مجاہدات اضطراریہ و اختیاریہ دونوں وجود ہوتے ہیں (تو یہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (یعنی نور پر نور ہے۔ خداوند کریم جس کو مناسب سمجھتا ہے نور سے راہ دیتا ہے) اور اللہ تعالیٰ دونوں قسم کے مجاہدوں کو جمع کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا — کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کہہ کر چھوٹ جائیں گے

اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ — کہ ہم یقین لائے اور ان کی آزمائش نہ ہو

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ — اور ہم ان سے پہلوں کو آزما چکے

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا — ہیں سو اللہ ان لوگوں کو معلوم کر کے رہے گا

وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (العنکبوت) — جو سچے ہیں۔ اور ان کو جو جھوٹے ہیں۔

یعنی تم محض (آمنا) کہنے پر نہ چھوڑا جائے گا بلکہ مجاہدات اضطراریہ سے تمہارے صدق و کذب

[illegible]

کا امتحان کیا جائے گا۔ ایک (دوسرے) مقام پر ارشاد ہے:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا	کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے
يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ	حالانکہ تم پر ان لوگوں جیسے حالات نہیں گزرے جو
قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَ	تم سے پہلے ہو چکے کہ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی
الضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ	اور جھڑجھڑا گئے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ	وسلم بھی اور وہ بھی جو ان کے ساتھ ایمان لائے
مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ (الآیۃ)	کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی

اس میں بتلا دیا کہ مجاہدہ اختیاریہ کے ساتھ اضطراریہ کو جمع کیا کرتے ہیں اور فرماتے ہیں يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ یعنی فراغت میں اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اس میں حالت ضراء (تنگی) میں انفاق (یعنی خرچ کرنے کی) ترغیب ہے جس سے دو مجاہدوں کا جمع ہے کہ فقر بھی ہے اور انفاق بھی ہے۔ ایک اضطراری مجاہدہ ہے ایک اختیاری۔ بہرحال یہ بات ثابت ہو گئی کہ مجاہدہ اضطراریہ و اختیاریہ کا جمع ہونا شریعت میں محمود و مطلوب ہے پھر اگر مجاہدہ اضطراریہ سے عمل میں قلت بھی ہو جائے اور بعض فرائض و واجبات ہی پر اکتفاء ہوتا رہے تب بھی مجاہدہ کاملہ کا ثواب ملتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ مسافر و مریض کے لیے ان اعمال کا ثواب پورا لکھا جاتا ہے جو وہ سفر و مرض سے پہلے کرتا تھا۔

ریاضت و مجاہدہ کے ارکان

(بلحاظ ارکان) مجاہدہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی کیا جائے۔ مثلاً تکثیر نوافل سے نماز کا عادی کرنا اور روزہ کی کثرت سے طعام کی حرص وغیرہ کو کم کرنا اور ایک مجاہدہ یعنی مخالفتِ نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت پر داعی ہو اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کی جائے اصل مقصود یہ دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے۔ اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کے واسطے کیا جاتا ہے کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہو گا تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہو گی۔ لیکن اگر

بدوں مجاہدۂ جسمانیہ کے کسی کو نفس پر قدرت ہو جائے تو اس کو مجاہدۂ نفسانیہ کی ضرورت نہیں
مگر ایسے لوگ شاذ ہیں۔ اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدۂ جسمانیہ کا اہتمام بھی کیا ہے اور ان کے
نزدیک اس کے چار ارکان ہیں۔ قلت کلام، قلت طعام، قلت منام، قلت اختلاط مع
الانام۔ جو شخص ان ارکان کا عادی ہو جائے گا واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا
کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا اور مجاہدۂ نفسانیہ یہ ہے کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے
اس کی مخالفت کیا۔ یہ بات اس وقت حاصل ہوگی جب کہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی کسی
حد تک مخالفت کیا کریں۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش کو پورا نہ کیا جائے
بلکہ اس کی درخواست کو رد کر دیا جائے۔ اور کبھی کبھی سخت تقاضے کے بعد اس کی جب کہ
خواہش پوری کر دی جائے۔ (تاکہ نفس پریشان نہ ہو جائے بلکہ اس کو خوش رکھا جائے اور اس
سے کام بھی لیا جائے۔ اس لیے) کہ ع

مزدور خوشدل کند کار بیش

قریب مباحات میں مخالفت نفس کے عادی ہوں گے اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت
پر آسانی سے قادر ہوں گے اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکل آزاد رکھتا ہے وہ بعض وقت
تقاضائے معصیت کے وقت اس کو دبا نہیں سکتا۔

(خلاصہ یہ کہ) ریاضت ومجاہدہ کے دو رکن ہیں۔ اول مجاہدۂ اجمالی (یا جسمانی) دوسرا
ریاضت تفصیلی (یا نفسانی) مجاہدۂ اجمالی کے اصول چار ہیں۔ قلت کلام، قلت طعام، قلت
منام اور قلت اختلاط مع الانام۔ ان سب امور میں مرتبۂ توسط حسب تعلیم شیخ کا ملحوظ
رکھے نہ اس قدر کثرت کرے جس سے غفلت وقساوت وکاہلی پیدا ہو، نہ اس قدر قلت کرے
کہ جس سے صحت وقوت زائل ہو جائے۔ (اس مجاہدۂ اجمالی کا مفصل بیان انشاء اللہ
مواقع کے بیان میں آئے گا۔) دوسرے ریاضت تفصیلی۔ اس میں دو قسمیں ہیں قسم
اول اخلاق حمیدہ ہیں اور وہ چند مقامات ہیں۔ مثل توبہ، صبر، شکر وغیرہ۔ قسم دوم اخلاق
ذمیمہ ہیں اور وہ چند چیزیں ہیں۔ مثل شہوت، حرص، غضب وغیرہ (تفصیل آئندہ باب میں

[illegible]

طریق تکمیل

تکمیل کے دو درجے ہیں۔ ایک تحلیہ اور ایک تخلیہ۔ تخلیہ میں تحلیہ ہی ہوتا ہے جیسے برتن کو پہلے میل کچیل سے صاف کرتے ہیں۔ پھر اس پر قلعی یا دوسرا رنگ کرتے ہیں۔ تحلیہ کے معنی لغت میں آراستہ کرنا اور اصطلاح صوفیہ میں یہ ہے کہ سالک اپنے کو اخلاق حمیدہ اور تعلق مع اللہ سے آراستہ کر لے جس کا طریقہ طاعات و ذکر میں مشغول ہونا ہے اور تخلیہ کے معنی لغت میں خالی کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں سالک کا اپنے کو اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا اور غیر اللہ سے تعلق منقطع کرنا ہے۔

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سلوک کے لیے تحلیہ تخلیہ دونوں کی ضرورت ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تخلیہ کو مقدم کیا جائے یا تحلیہ کو۔ مشائخ میں دونوں طریقے مستعمل ہیں۔ بعض تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تحلیہ کرتے ہیں۔ بعض تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور اس کے بعد تخلیہ کرتے ہیں اور ہر دو طریقے سے کامیابی ہوتی ہے جیسے معالجات امراض جسمانیہ میں بھی دونوں طریقے مستعمل ہیں۔ حکمائے یونان تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں یعنی پہلے مادہ فاسد کو نکالتے ہیں۔ بعد میں تقویت طبع کا اہتمام کرتے ہیں اور حکمائے یورپ کی رائے یہ ہے کہ مرض کی حالت میں سب سے پہلے تقویت طبع کا اہتمام کرنا چاہیے یعنی تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحلیہ سے تخلیہ خود ہو جاتا ہے یعنی جب طبیعت قوی ہو جاتی ہے تو وہ مرض کو خود زائل کر دیتی ہے۔ حکمائے یونان جواب میں کہتے ہیں کہ ضعف طبع کا سبب تو مرض ہی ہے اگر مرض کا ازالہ ہو گیا تو طبیعت خود قوی ہو جائے گی اور دونوں طریقوں سے کامیابی ہوتی ہے۔ اسی طرح صوفیہ کی بھی رائے مختلف ہو گئی۔ بعض کے یہاں صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پہلے پیدا کیا جاتا ہے، پھر رذائل کی اصلاح کی جاتی ہے اور بعض کے یہاں صفات رذیلہ اور تعلق غیر اللہ کو پہلے قطع کیا جاتا ہے۔ پھر صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا جاتا ہے مگر اس میں قول فیصل یہ ہے کہ نہ تخلیہ کو مطلقاً مقدم کیا جائے نہ تحلیہ کو، بلکہ

---

(۱) شریعت الاسلام صفحہ [illegible]

سے ماضی پر اور عزم کی ضرورت سے مستقبل پر نظر تھی لیکن ضرورت کیلئے بقدر ضرورت اتنا کافی ہے کہ گذشتہ گناہوں سے موافق شرائط خوب توبہ کرے پھر بار بار دل میں ان کا سبق نہ دہرایا کرے اور مستقبل کے لیے اللہ پر بھروسہ کرکے اس کا قصد کرے کہ انشاءاللہ پھر گناہ نہ کروں گا۔ اس کے بعد ہر وقت اس قصد میں نہ لگا رہے۔ اس سے زیادہ دوسرا کام ہے جس کو حدیث میں ان دو لفظوں میں تعبیر فرمایا گیا ہے۔ مراقب اللّٰہ تجد تجاھک اللہ کا دھیان رکھو۔ اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ پس اسی کام میں لگ جانا چاہیئے یعنی ذکر و فکر اور عمل کے وقت عمل میں کرے وہ بھی ذکر میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرب کو مقصود سمجھے اور جو طریق اس کیلئے مقرر ہے یعنی عقائد کی تصحیح کے بعد اعمال اختیاریہ کہ جس وقت کا جو عمل ہو خواہ ظاہری مثل صلوٰۃ و زکوٰۃ، خواہ باطنی مثل خوف و رجا و شکر و صبر وغیرہ۔ پس اس میں مشغول رہے۔ اور جو بُعد کے اسباب ہیں یعنی ظاہری و باطنی معصیت اس سے بچتا رہے۔ نہ اس کی ضرورت ہے کہ اسباب قرب میں فکر پیدا کرنے کی فکر کرے۔ نہ اس کی حاجت کہ اسباب بُعد کے مادہ کو منقطع کرے (جبکہ) امور اختیاریہ میں سے جس میں کوتاہی ہو جاوے اس کو مہتم بالشان سمجھے اور اس کی اصلاح کرے اور امور غیر اختیاریہ کے وجود و عدم پر التفات بھی نہ کرے اور اصلاح حالت میں بھی زیادہ کاوش نہ کرے۔ مثلاً اگر کسی ضروری عمل میں خلل ہو گیا۔ اس کی قضا یا تلافی کرے اگر کوئی امر منکر صادر ہو گیا۔ اس سے استغفار کرے اور پھر اپنے کام میں لگ جاوے اسی ایک بات کے پیچھے نہ پڑ جائے کہ ہائے یہ کام مجھ سے کیوں ہوا یا یہ کام کیوں نہیں ہوا یہ غلو و مبالغہ ہے جس سے (اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) کتاب و سنت میں منع فرمایا ہے۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ : (دین میں) ناحق کا غلو مت کرو

مَنْ شَاقَّ شَاقَّ اللّٰہُ عَلَیْہِ : جو سختی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر سختی کرتے ہیں

سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِیْمُوْا : درمیانی راہ اختیار کرو، اور قرب کی کوشش کرو اور اس پر ثابت رہو

حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں۔ ع

سخت می گیرد جہاں بر مردمان سخت گیر

اور اسی تشدد اور ریاضت کا اثر خصوصاً اس وقت کے قویٰ و ہمتوں پر یہ ہوتا ہے کہ بہت
جلد یہ تن زار نکما لاغر اور سالک کو معطل کر دیتی ہے اور کبھی جان پر اور کبھی ایمان پر ان
کا اثر پہنچتا ہے۔ جان پر یہ کہ صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کثرت تخیلات دینیہ کا دورہ سودا
پڑ جاتا ہے اور ایمان پر یہ کہ جو ذرہ بھر نفع و معالجہ کی کامیابی مرضی حسب ارادہ شمار مطلق کے
نہ ہونے پر یا دیر میں ہونے سے حق تعالیٰ سے تنگی اور شکایت پیدا ہو کر بعض کراہت اور
ناخوشی کی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہم گزشتہ دن سر پٹکتے ہو گئے مگر وہ آسمانی فیض جو حق تعالیٰ
کے وعدے تھا جو نہ نہال لگے اور ایک دن ہر وقت کے گفتگو یہ ہتا ہے کہ اپنے عمل
کو بالغ و رائج کو سابق سمجھ کر ہر وقت ثمرات کا منتظر رہتا ہے پس اپنے تئیں دو پلہ
علی حق سے بڑھا ہوا سمجھتا ہے جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ کبھی اپنے کو کامیاب نہیں
سمجھتا اس لیے شکوی ہی میں مبتلا رہتا ہے اور اگر بد قسمتی سے خود کامیاب بھی ہو
گیا تو اگر وہ کامیابی پھر زائل ہو گئی کیونکہ ایسے انقلابات عمر بھر رہتے ہیں تو پھر وہی تنگی
اور پریشانی شروع ہوتی ہے تو اس کا سلسلہ عمر بھر بھی منقطع نہیں ہوتا۔ بس کا یہ
اس کو دیکھ کر دوسرے کا نفس کہتا ہے کہ اس راہ خدا سے خدا کی پناہ جس میں بجز مصیبت
کے راحت کا نام ہی نہیں۔ پس اس نحو کے یہ مضار و مفاسد دیکھ کر انھوں نے
یہ تجویز کیا کہ ان تدقیقات و تعمقات کو اصلاً نظر انداز کر دے اگر کوئی وارد محمود آوے تو اس
کو کمال نہ سمجھے نہ اس کے تکرار کی تمنا کرے، نہ اس کے فوت پر حسرت کرے اگر کوئی وسوسہ
پیدا ہو اس کے دفعہ میں تندہی نہ کرے۔ ذکر کی طرف بہت مبالغہ سے نہیں بلکہ سرسری طور
پر متوجہ ہو جائے خواہ وہ دفع ہو یا نہ ہو یعنی ذکر بقصد قرب کرے نہ بقصد دفع وسوسہ۔
خلاصہ یہ کہ جانب رضائے حق داعی رب عن سخط الحق رہے (یعنی خداوند کریم کی ناراضگی کے
اسباب سے بچے) جس امر کو رضا میں دخل ہو اس پر عمل کرے اور جس امر کو سخط حق میں
دخل ہو اس سے اجتناب کرے اگر اس کا صدور ہو جاوے استغفار کرے۔ وا ہے

کو خواص میں سمجھے کہ احوال عامیہ سے گھبرا رہے ۔ نہ حضرت عاجلہ و آجلہ کا طالب رہے لیکن اسکی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں توفیق اور آخرت میں جنت عطا فرمائیں اور دوزخ سے نجات بخشیں بس ہو گیا سلوک مسنون ۔

باب دوم : اخلاق کا بیان

اخلاق[1] سب فطری و جبلی ہیں ، وہ درجۂ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے نہ محمود ، بلکہ موا قع استعمال سے ان میں مدح و ذم آجاتی ہے ۔ مَنْ اَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ یعنی جس نے اللہ ہی کی رضا کیلئے دیا اور اللہ ہی کی رضا کے لیے روکا تو اس کا ایمان مکمل ہوا ۔ اس میں اعطاء و منع دونوں کے ساتھ للّٰہ کی قید ہے جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں نہ بخل مطلقاً مذموم بلکہ اگر خدا کے لیے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم ۔

اخلاق[2] ذمیمہ جن سے نفس کا تزکیہ کرنا ضروری ہے یوں تو بہت ہیں مگر اصول یہی ہیں جن کا تذکرہ کیا جائے گا ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔ ان سب میں باہم ایسا تعلق ہے کہ ایک کے ساتھ دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا لگا ہوا ہے اسی لیے جب تک سب سے نجات نہ ملے گی اس وقت تک نفس قابو میں نہ آئے گا اور ایک کی اصلاح کی اور دوسرے سے بے پرواہ رہا کچھ مفید نہ ہو گا کیونکہ جو شخص دس بیماریوں میں گرفتار ہو وہ تندرست اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کی دسوں بیماریاں جاتی رہیں جس طرح کوئی خوبصورت نہیں کہا جا سکتا ہے جبکہ ناک آنکھ کان غرض سارے اعضا متناسب اور خوبصورت ہوں اسی طرح انسان کو حسن خلق اسی وقت حاصل ہو گا جبکہ اس کی تمام باطنی قوتیں قابل تعریف اور پسندیدہ ہوں ۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ ایمان اس کا کامل ہوا اور مومنین میں افضل وہ ہے جس کا خلق سب سے بہتر ہو بس اسی کمال کا نام ہے اور اسی کی تکمیل کیلئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے ۔

خَلق و خُلق ۔ جاننا چاہیئے کہ خلق اور خُلق جدا جدا دو لفظ ہیں خَلق سے مراد صورت ظاہری ہے اور خُلق سے مراد صورت باطنی کیونکہ انسان جس طرح جسم سے ترکیب دیا گیا ہے اور ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان وغیرہ اعضا اس کو مرحمت ہوئے ہیں جن کو قوت بصارت یعنی ظاہری آنکھیں ادراک کرسکتی ہیں اسی طرح انسان روح

---

[1] اصلاح انقلاب ... [2] تبلیغ دین ...

شہوت کی حالتِ اعتدال کا نام پارسائی ہے پس اگر شہوت اپنی حدِ اعتدال سے بڑھ جائے گی تو حرص و ہوا کہلائے گی، حالتِ معتدل یعنی پارسائی اللہ پاک کو پسند ہے اور اس سے جو خصائل پیدا ہوتے ہیں وہ سخاوت، حیا، صبر، قناعت، ایثار اختیار کراتے ہیں طمع کم ہو جاتی ہے۔ خوف و خشیت اور دوسروں کی مدد کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور حدِ اعتدال سے بڑھ جانے اور گھٹنے سے حرص و لالچ، خوشامد، چاپلوسی امراء کے سامنے تذلل اور فقراء کو بنظرِ حقارت دیکھنا، بےحیائی، فضول خرچی، ریا، تنگدلی، نامردانگی اور حسد وغیرہ خصائلِ بد پیدا ہوتے ہیں۔

اور **قوتِ عقل** میں اگر اعتدال ہو تب تو انسان بہت بڑا منتظم اور زکی و سمجھدار ہوتا ہے کہ اس کی رائے صائب ہوتی ہے اور ہر معاملے میں اس کی طبیعت چلتی اور جودت دکھلاتی ہے اور اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو دھوکہ بازی، فریب دہی اور مکاری کہلاتی ہے اگر عقل کی قوت میں کسی قسم کا نقصان اور ضعف ہوگا تو کند ذہنی و حماقت اور بیوقوفی کہلائے گی جس کا اثر یہ ہوگا کہ ایسا آدمی جلد دوسرے کے دھوکہ میں آ جائے گا۔

غرض جس وقت یہ ساری قوتیں حدِ اعتدال پر ہوں گی تو اس وقت انسان کو خوب سیرت کہا جائیگا۔ کیونکہ اعتدال سے گھٹنا اور بڑھنا دونوں حالتیں حسن سے خارج ہیں خیر الامور اوسطہا حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہمارے بندوں کی یہ شان ہے کہ نہ وہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ ان کے بین بین حالت پر رہتے ہیں۔

جس طرح حسنِ ظاہری میں کمی اور بیشی ہوا کرتی ہے کہ کوئی زیادہ خوبصورت ہے اور کوئی کم۔ اسی طرح حسنِ باطنی میں بھی لوگ متفاوت ہوتے ہیں پس سب سے زیادہ خوب سیرت تو سرورِ عالم رسولِ مقبول سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ کی شان میں آیت کریمہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ نازل ہوئی ہے۔ آپ کے بعد جس مسلمان کو آپ کے اخلاق کے ساتھ جتنی مناسبت ہوگی اسی قدر اس کو حسین سیرت کہیں گے اور یہ ظاہر ہے کہ سیرتِ باطنی میں جس قدر بھی جس کو حسن حاصل ہوگا اسی قدر اس کو سعادتِ اخروی حاصل ہوگی۔

اخلاقِ حمیدہ کا بیان

اخلاقِ حمیدہ چند مقامات ہیں۔ ارادہ، ریاضت، اخلاص، انس، تبلیغ، شکر، توکل، تقویٰ،

[illegible]

تواضع، توبہ، توحید، توکل، خشوع، خوف، دعا، رجا، رضا، زہد، شکر، شوق، صبر، صدق، محبت وغیرہ۔ ہر ایک مقام کو ایک ایک فصل میں مع اس کی دلیل حقیقت اور طریق کار و طریق تحصیل کے بیان کیا جاتا ہے۔

پہلی فصل —— ارادہ اور نیت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ

اور مت دھتکار دے محمد ان کو جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں خاص ان کی رضا کو چاہتے ہیں

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (متفق علیہ) اعمال کا اعتبار نیت ہی پر ہے۔

نیت کی حقیقت | دل کا ایسی چیز کی طرف ابھرنا جس کو اپنی غرض یا نفع کے موافق سمجھتا ہے نیت کہتے ہیں اور اس کے معنی ارادہ اور قصد کے ہیں کہ جس سے کسی کام پر قدرت پیدا ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ہر کام کے لیے اول علم کی ضرورت ہوتی ہے اور علم کے بعد اس کے عمل میں لانے کا قصد و ارادہ ہوتا ہے اور اس کے بعد ہاتھ پاؤں ہلانے اور اس کام کے کرنے کی قدرت پیدا ہوتی ہے گویا **قدرت**، قصد و ارادہ کی خادم ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ تمہارے اندر کھانے کی خواہش رکھی ہوئی ہے مگر وہ ایسی دبی ہوتی ہے کہ جیسے کوئی سویا ہوا ہو۔ اور جس وقت تمہاری نظر کھانے پر پڑی اور طعام کا علم ہوا اسی وقت وہ جاگ اٹھی اور اس کے کھانے کا قصد ہوا اس کے بعد اس کی طرف ہاتھ بڑھے گا اور وہ قوت اپنا کام کرے گی جو خواہش طعام کے اشارہ کی مطیع بنائی گئی ہے۔ غرض آنکھ کے مشاہدہ سے معرفت و علم حاصل ہوگا اور معرفت کی خواہش بیدار ہوگی اور قصد پیدا ہوگا اور یہ قصد خداداد قوت کے ذریعہ سے ہاتھ کو حرکت دلائے گا اور کھانا کھلائے گا اسی طرح تمہارے اندر ان لذتوں کی بھی خواہش رکھی ہوئی ہے جو عالم آخرت میں مقدر ہیں اور جن کا علم عقل اور شریعت کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور قدرت چونکہ اس خواہش و میلان کی بھی خادم ہے لہٰذا اعضاء کو حرکت دے گی اور خواہش کو پورا کرائے گی پس دینی عزم اور

۱؎ تعلیم الدین ص [illegible]، ۲؎ تبلیغ دین ص [illegible]

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ (البینہ) — اللہ تعالیٰ کی خاص کرنے والے ہوں اس کے واسطے دین اور طرف سے منہ پھیر کر۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَ اَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ اَعْمَالِكُمْ (الحدیث) — یقیناً اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نظر نہیں فرماتے لیکن تمہارے قلوب اور اعمال پر نظر فرماتے ہیں۔

حقیقتِ اخلاص اپنی طرف سے صرف اللہ تعالیٰ کے تقرب و رضا کا قصد رکھنا اور مخلوق کی خوشنودی و رضامندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کو دخل نہ دینا اخلاص ہے۔

اخلاص کے وجود اور عدم کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیح کا قصد ہو۔ یہ تو عین اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔ دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ کہ کچھ بھی قصد نہ ہو۔ نہ غایت صحیح کا نہ غایت فاسدہ کا بلکہ یونہی معمول کے موافق ایک کام کر لیا۔ یہ درجہ بین بین ہے اس کو اخلاص سے اتنا بعد نہیں جتنا دوسرے درجہ کو بعد ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ خداوند کریم ہم سے راضی ہوں گے اس کے سوا اور کوئی نیت نہ ہو۔ یہ اخلاص کا درجہ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خشوع و خضوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جاوے گا یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ ہم معمول کے موافق نماز پڑھ لیں۔ نہ وہ خیال دل میں ہو نہ یہ خیال ہو۔ یہ مرتبہ بین بین ہے یا اگر اخلاص کا درجہ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں۔ اس کو اخلاص سے قرب ضرور ہے مگر ظاہر ہے کہ فعل اختیاری کا فاعل مختار سے بدوں کسی غرض کے تصور کے نہیں ہو سکتا تو اس کی کیا وجہ کہ بعض دفعہ ہم ایک فعل کرتے ہیں مگر نیت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض عادت کی برکت ہے جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود صادر ہونے لگتا ہے اس کے لیے بار بار ارادہ و عزم نہیں کرنا پڑتا۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز کی نیت بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی غایت

۱؎ تعلیم الدین ص ، ۲؎ اشرف المسائل ص

پر نظر نہیں ہوتی۔ تکرار کی وجہ سے عادت ہوگئی ہے اور عادت کے بعد غایات کا لحاظ نہیں ہوا کرتا پس
معلوم ہوا کہ جس کام میں تکرار ہو اس میں اخلاص سے من وجہ قرب ہے اور جس میں تکلف ہو اس میں
اخلاص کے ساتھ تکلف کا حاصل یہی ہوتا ہے کہ نیت رضائے حق کا تصور اور اس کا قصد ہو جیسے رکعتین
مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ (اور دو رکعتیں ایسی حالت میں پڑھے کہ دل سے اس پر متوجہ ہو) یہ ایک
مرفوع حدیث کا جزو ہے اور دوسری حدیث موقوف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا جزو ہے
اِنِّیْ لَاُجَهِّزُ جَیْشِیْ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ (میں اپنے لشکر کی تیاری نماز کی حالت میں کرتا
ہوں) مجموعہ روایتین سے دو درجے مفہوم ہوتے۔ ایک یہ کہ جس طاعت میں مشغول ہے اس کے
غیر کا قصداً استحضار بھی نہ ہو اگرچہ وہ بھی طاعت ہی ہو دوسرا درجہ یہ کہ دوسری طاعت کا
استحضار ہو جاوے اور ان دونوں میں یہ امر مشترک ہے کہ اس دوسری طاعت کا اس طاعت
سے قصد نہیں ہے مثلاً نماز پڑھنے سے یہ غرض نہیں کہ نماز میں یکسوئی کے ساتھ تجہیز جیش کیا
کرے پس حقیقت اخلاص تو دونوں میں یکساں ہے اس میں تشکیک نہیں البتہ عوارض کے
سبب ان میں تفاوت ہوگیا اور درجہ اول اکمل ہے درجہ ثانیہ سے اگر ضرورت نہ ہو تو خیر اکمل اور اگر ضرورت
ہے تو وہ بھی اکمل ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ضرورت تھی اور اس کا معیار اجتہاد ہے لیکن
ہر حال میں اخلاص کے خلاف نہیں۔

اخلاص کے فائدے چاہے کیسا ہی نیک کام ہو اور چاہے ذرا سا کام ہو مگر خلوص
کے ساتھ ہو تو اس میں برکت ہوتی ہے چاہے اس کا کوئی بھی معاوضہ نہ ہو جس قدر اخلاص زیادہ
ہوگا اسی قدر ثواب بڑھتا جائے گا اور اسی واسطے حدیث میں آیا ہے کہ میرا صحابی اگر نصف مد یعنی
آدھ سیر جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے کے احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر
ہے بات یہ ہے کہ ان حضرات کے اندر خلوص اور محبت اس قدر تھا کہ اوروں کے اندر اتنا نہیں
اسی واسطے ان کے صدقات و حسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں

طریق کا رنگ وہ شخص جو محض خدا کے لیے کام کرے اور مخلوق کا اس میں تعلق
تک نہ ہو وہ اس سے کم ہے کہ مخلوق کو راضی کرنے کیلئے کام کرے مگر کوئی دنیاوی غرض مطلوب

[illegible]

ذکر و درود ان کا خواہش کی مقصود موجودہ کی غرض ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ کچھ نیت نہ ہو ورنہ مطلوب ہو نہ ذات۔ پوری حالت الذین ہو کہ کوئی عمل کیا یہی اخلاص یعنی عدم ارادہ ہے۔

طریق تحصیل | بتا کو دفع کرکے یعنی اخلاص کا حاصل کرنا ہے جو بعد طلب دیا میں حاصل ہوگا

تیسری فصل۔ اُنس اور ناز کا بیان

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ — وہ اللہ ایسا ہے کہ تسکین اور اطمینان مومنین کے دلوں میں اتارتا ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ (رواہ مسلم)

لوگ نہیں بیٹھتے ہیں کہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں مگر فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور ان کو رحمت خداوندی ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر تسکین اور اطمینان اترتا ہے اور اللہ ان کا ذکر ان میں جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتوں میں) یاد کرتا ہے۔ (مسلم شریف)

اُنس کی حقیقت | جو چیز کسی وجہ سے ظاہر اور معلوم ہو اور کسی وجہ سے مخفی و مجہول ہو، اگر وجوہ معلوم پر نظر واقع ہو کر اس پر فرح و سرور ہو، اس کو اُنس کہتے ہیں۔ یہ فرح بھی یہاں تک غلبہ کرتی ہے کہ مطلوب کے صفات جلال پیش نظر نہیں رہتے اور اسی وجہ سے اس کے اقوال و افعال میں کسی قدر بے تکلفی ہونے لگتی ہے۔ اس کو انبساط و ادلال (ناز) کہتے ہیں۔ یہ ایک حال ہوتا ہے جو متوسطین سلوک پر وارد ہوتا ہے۔ کاملین اہل ادلال نہیں ہوتے ان میں عجز و نیاز غالب ہوتا ہے۔ ہاں وسط سلوک میں بعض لوگوں پر غلبہ انبساط سے ادلال کا حال وارد ہو جاتا ہے وہ

ف تیسیر الدین ص [illegible] ۔ رشد قصیر الدین ص [illegible] ۔ تتمہ کمال تعلیم الدین ص [illegible]

چوتھی فصل۔ تبلیغ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:-

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ	اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ	(اور لوگوں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ	کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں
الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ	سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں
الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران)	ثواب سے) پورے کامیاب ہوں گے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

مُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (ابن ماجہ)	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو۔

تبلیغ کی حقیقت

امر بالمعروف[1] یقیناً واجب ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور حکم سب کو عام ہے مگر اس میں بھی ایک تفصیل ہے وہ یہ کہ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خطاب عام، دوسرا خطاب خاص۔ تبلیغ خاص تو ہر جگہ اور ہر شخص پر ہے یہ بھی قدرت کی شرط سے ساقط نہیں ہوتی اور امر بالمعروف (تبلیغ) عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں بلکہ یہ صرف علماء پر واجب ہے (مگر عوام مسلمین کے ذمہ سفر خرچ و دیگر اسباب کا مہیا کرنا ہے) اور امر بالمعروف کا مدار قدرت پر ہے یعنی جس کو جس کسی پر جتنی قدرت ہے اس کے ذمہ واجب ہے کہ امر بالمعروف کرے۔ مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ (اور دیگر ضروریات دین) کی نصیحت کریں۔ خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بیوی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے۔ آقا کیلئے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر اور جو ان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔

حدیث شریف میں ہے:-

مُرُوْا أَبْنَاءَكُمْ بِالصَّلٰوةِ — تم اپنے بچوں کو نماز پڑھنے کا امر کرو جبکہ

---

[1] بیان القرآن [illegible] ۔ [illegible]

آباد تھے اور ان کے اعمال انبیاء جیسے تھے مگر اتنا نقص تھا کہ اللہ کی نافرمانیاں دیکھ کر ان کو غصہ نہ آتا تھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑے ہوئے تھے لہٰذا ہلاک کر دیئے گئے۔ (معلوم ہوا کہ) اگر کسی جگہ پر کوئی ناجائز کام ہوتا ہوا دیکھو گے اور خاموش بیٹھے رہو گے تو اس گناہ میں تم بھی شریک سمجھے جاؤ گے۔

پس خوب سمجھ لو کہ ان گناہوں کے مرتکب سے صرف بچنا ہی ضروری نہیں بلکہ جب تک بے تامل نصیحت نہ کرو گے۔ اور گناہ سے ان کو روک نہ دو گے۔ اس وقت تک بری الذمہ ہرگز نہ ہو گے۔

تبلیغ کے آداب و شرائط

امر بالمعروف[1] کا حکم علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضوابط (قاعدے) اور طرق (طریقے) مقرر ہیں۔ ایک قسم اصول کی تبلیغ کرنا ہے اس کے الگ آداب ہیں ایک فروع کی تبلیغ اس کے الگ آداب ہیں (المدعوہ [illegible])

(۱) جس امر کے متعلق (جس کی تبلیغ کرنی ہو) شریعت کا پورا حکم معلوم ہو۔

(۲) امر[2] بالمعروف کی اول شرط اخلاص ہے کہ محض لوجہ اللہ نصیحت کرے اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے نصیحت نہ کرے اور اس کا معیار یہ ہے کہ عین نصیحت کے وقت بھی اس شخص مخاطب کو اپنے سے افضل سمجھے۔

(۳) دوسروں کی نصیحت کے لیے شفقت شرط ہے۔

(۴) تبلیغ کے وقت خود نفس تبلیغ کو مطلوب سمجھے۔ ترتب ثمرات کو مقصود نہ سمجھے کہ وہ غیر اختیاری ہیں

(۵) وعظ میں تعرض خاص نہ ہونا چاہیے بلکہ خطاب عام ہونا چاہیے۔

(۶) واعظ کے لیے مناسب ہے کہ محض تبلیغ کے لیے ہو کر احکام کی تبلیغ کرے اور اس کو بیان ایسے طریقے سے شفقت کر دیا جائے۔ جب خطاب بے تعرض ہوگا اس کا مخاطب پر برا اثر ہوگا۔

(۷) کسی شخص کی مجلس عام میں اصلاح نہ کی جائے۔ کیونکہ اس سے دوسرے کو شرمندگی ہوتی ہے

۱؎ آداب التبلیغ صفحہ ۸۱ ، ۲؎ بیان القرآن سورۂ آل عمران ۳؎ اغلاط العوام [illegible] ۲۴۹، ۲۵۴، ۲۵۶

۴؎ اشرف الاحکام صفحہ ۱۱ [illegible] کی بات مان لے۔

اور اس شرمندگی کا اثر یہ ہے کہ نصیحت کرنے والے سے بغض ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات اس امر کو ترک کرنے کی بجائے اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میری رسوائی تو ہو ہی گئی پھر میں کیوں چھوڑوں اس لیے بہتر یہ ہے کہ یا تو خود اس کو خلوت میں لے جا کر اس سے کہہ دے یا اگر اس سے نہ کہہ سکے تو کسی ایسے شخص سے کہہ دے جو کہ اس کی اصلاح کر سکے لیکن اس کے دشمن سے نہ کہے کیونکہ دشمن سے کہنے میں اصلاح تو ہو نہیں سکتی ہاں تذلیل ہوگی۔

(۸) شخص درشتی کا اظہار نہ کرے بلکہ نرمی اور شفقت سے امر بالمعروف کرے۔ اس پر بھی مخالفت ہو تو تحمل کرے اور تحمل کی طاقت نہ ہو تو خطاب خاص نہ کرے محض خطاب عام پر اکتفا کرے۔ نرمی سے کہے تحقیر اور طعن کے طور پر نہ کہے۔[1]

طریق تبلیغ

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ	حق تعالیٰ فرماتے ہیں اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ	آپ لوگوں کو سبیل رب کی طرف حکمت اور مواعظ
الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي	حسنہ کے ساتھ بلائیے اور اگر مجادلہ کی ضرورت
هِيَ أَحْسَنُ (الآیۃ)	ہو تو ان سے مجادلہ بھی کیجئے مگر احسن طریقہ سے

سبیل رب وہ ہے جس سے انسان کی رسائی ہو جائے اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ وہ سبیل صرف اسلام ہے اسی کی طرف بلانے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہوا ہے۔ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے تین چیزیں بتلائی ہیں۔ دعوت بالحکمت، دعوت بالموعظۃ الحسنۃ اور ایک مجادلہ۔ یعنی ایک قسم یہ ہے کہ موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت کی جائے اور ایک یہ کہ مجادلہ سے ... کیا جاوے۔

گفتگو میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ایک اپنے دعوے کا اثبات اور دوسرے کے دعویٰ کا ابطال۔ تو حکمت یہ کہ اپنے دعویٰ پر عقلی دلائل قائم کیے جائیں اور مجادلہ یہ ہے کہ مخالف کے دعویٰ کو باطل کیا جاوے۔ اصل مقصود یہ دونوں ہیں باقی تیسری چیز موعظہ حسنہ ہے چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ شفقت بہت زیادہ ہے اس لیے موعظہ حسنہ بھی ایک طریق بتا دیا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ ناصح دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو ضابطہ کے ساتھ نصیحت کرنے والا۔ وہ تو اپنے ضابطہ کی خانہ پری

---

[1] النحل، پ ۱۴۔ [2] اشرف السوانح ... مجموعہ تبلیغ صفحہ ۱۴۳، ۱۴۶ تا ۱۰۰ ملخصاً

کر دیتا ہے۔ دوسرا وہ ناصح جس کو سامعین پر شفقت بھی ہے۔ مثلاً ایک تو منادی کا حکم سنانا ہے اور ایک باپ کا نصیحت کرنا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ منادی کا کام تو ضابطہ کا ہے صرف حکم پہنچانا اس کا فرض منصبی ہے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ اس سے اس کو کوئی بحث نہیں اور باپ محض سنانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس کی شفقت اس بات کی مقتضی ہوتی ہے کہ کسی صورت سے اس کو منوا دوں۔ جیسے بھی ہو وہ ایسی صورت اختیار کرتا ہے کہ بیٹا مان ہی لے۔ جب بچہ اس کو سمجھاتا ہے، کڑھتا ہے دل سے دعا کرتا ہے۔ درد دل سے بھی دعا کرتا ہے تو دیکھئے دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے غرض محض شفقت ہی کے مقتضا سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ثانیاً آپ کی امت کو فرمایا ہے کہ دعوت میں صرف حکمت یعنی دلائل ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ ساتھ ساتھ موعظہ حسنہ بھی کرتے رہو وہ ایسے مضامین مؤثرہ ہیں جس سے مخاطب میں نرمی پیدا ہو۔ دل پگھل جائے۔ جیسے درجات جنت کی ترغیب اور جہنم سے ترہیب کرنا وغیرہ۔ مثلاً باپ کہتا ہے کہ بیٹا بد پرہیزی مضر ہے اس کا گوشت کھاؤ گے پیٹ میں درد پیدا کر دے گا۔ پھنسیاں نکل آئیں گی۔ اسی طرح کبھی طمع دلانے سے کام لیتا ہے کہ اگر یہ دوا پی لو گے تو تم کو یہ دوں گا وہ دوں گا تو اس لیے ترغیب و ترہیب دونوں کی ضرورت ہے۔

نصیحت کا قاعدہ یہ ہے کہ مصلح ہمیشہ اور شفقت والا ارشاد طالب کو آسان طریقہ سے سمجھائے۔ ابتداء میں تو تالیف قلب کرے اور انتہا میں صفائی سے کام لے یعنی مسئلہ کو صاف صاف بیان کر دے۔ گول مول بیان نہ کرے۔ ابتداء میں ترغیب اعمال و اخلاق کے پیرایہ میں رکھی جائے تاکہ مخاطب کو گرانی اور وحشت نہ ہو۔ مثلاً اس طرح نصیحت شروع کرے کہ نفس کو بند کرنا اور آزادی سے روکنا اور اس میں استقلال اور پختگی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے ورنہ انسان اور جانوروں میں کیا فرق ہے؟ مردانگی اس میں ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو نفس کو تابع فرمان نہ ہو۔

طریق کار | دو چار آدمی مل کر تبلیغ کا کام شروع کر دیں اور اپنی قلت پر نظر نہ کریں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دیں۔ (تبلیغ عام کے لیے) ایک مبلغ مقرر کر لیں اور اس کا خرچ اپنے

[illegible] ملخص۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور
وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ	یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں
وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ	اہلِ عقل کے لیے دلائل ہیں جن کی حالت یہ
الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا	ہے کہ وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور
وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَ	زبان سے بھی) کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی
يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور
وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ	زمین کے پیدا ہونے میں غور و فکر کرتے ہیں
هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ	کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس (مخلوق)
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝	کو لایعنی پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں حکمتیں
لہ	رکھی ہیں) ہم آپ کو منزہ (اور پاک) سمجھتے ہیں
	سو ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔

اس میں صاف تعلیم ہے کہ خلق سماوات و ارض میں اس غرض سے تفکر کرنا چاہیے کہ خداوند کریم کی حکمت و قدرت کا علم ہو کر یہ فضول پیدا نہیں کیے گئے پھر اس سے امکانِ وقوعِ معاد (یعنی آخرت) پر استدلال کر کے جنت کی طلب اور جہنم سے استعاذہ (یعنی اعمالِ صالحہ کرنے اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام) کرنا چاہیے۔ اسی لیے حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اس باب میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔ کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان کہ آپ ہمیشہ فکر و سوچ اور غم میں رہتے تھے اور اس فکر و غم ہی کا یہ اثر تھا کہ آپ کبھی کھل کر ہنستے نہ تھے۔ حدیث شریف میں ہے کان جل ضحکہ التبسم کہ آپ کا بڑا ہنسنا یہ ہوتا تھا کہ آپ تبسم فرماتے تھے اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حوصلہ تھا کہ ہماری طرح تبسم فرما لیتے تھے ورنہ جس کے سامنے وہ احوالِ شدیدہ ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف تھے اس کو تو تبسم بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر تم وہ باتیں جانتے جو مجھے معلوم ہیں تو بہت کم ہنستے اور زیادہ رویا

لہ بیان القرآن آخر سورۂ آل عمران، پارہ ۴، ص ۲۳

کرتے یعنی بالکل نہ بیٹھتے۔

تفکر کی ضرورت

عن علیؓ قال لا خیر فی قراءۃ لیس فیہا تدبر ولا عبادۃ لیس فیہا فقہ (الحدیث اخرجہ رزین)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا ایسے قرآن مجید پڑھنے میں کوئی (معتد بہ) نفع نہیں جس میں تفکر نہ ہو اور ایسی عبادت میں کچھ نہیں جس میں معرفت نہ ہو۔

صوفیہ کے طریق کا مدار اعظم یہی تفکر ہے (لہذا) خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اکابر کو (بھی) فارغ ہو کر بیٹھنا نہ چاہیے بلکہ بندگی کے اہتمام اصلاح اعمال اور اندیشۂ تغیر حال میں لگا رہنا چاہیے۔ تفکر کی وجہ سے معلومات خود بخود منکشف ہونے لگتے ہیں۔ سوچنے کی مثال ایسی ہے جیسے گھڑی کی بال کمانی کہ ہے تو مختصر مگر تمام پرزوں کی حرکت اسی سے ہوتی ہے۔ اسی طرح سوچنے سے دین کے قلعے فتح ہو جاتے ہیں[1]۔

سارا قرآن مجید تفکر کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ قیامت کے بارہ میں ارشاد ہے کہ ان کو قیامت کے امکان کو سمجھنے کے لیے ملکوت السموات والارض میں نظر کرنا چاہیے۔ ایک جگہ ارشاد ہے لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ اللہ تعالیٰ یہ احکام صاف صاف اس لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم دنیا و آخرت میں فکر کرو یعنی دنیا و آخرت میں موازنہ کے لیے تفکر کرو کہ ان میں اختیار کرنے کے قابل کون ہے اور کون قابل ترک ہے۔ اہل اللہ نے دنیا میں تفکر کر کے ہی اس کی حقیقت کو سمجھا ہے اسی لیے دنیا سے ان کو نفرت ہے[2]۔

طریق فکر

نور ایمان کے کامل کرنے کا طریقہ ذکر و فکر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ہر شخص یہ دیکھتا رہے اور فکر کرتا رہے کہ کل کے واسطے کیا بھیجا ہے؟

یعنی اپنے اعمال کا محاسبہ کرتا رہے کہ آج دن میں کتنے نیک کام ہوئے جو نیک کام ہوئے ہیں ان پر خدا کا شکر کرے اور جو گناہ ہوئے ہیں ان سے توبہ و استغفار کرے جو بات کہے سوچ کر کہے جو کام کرے پہلے اس کے انجام کو سوچ لے، مراقبات کرے[3] (بالخصوص مراقبہ موت) اور اگر موت کے

۱؎ التکشف صفحہ [illegible] ۲؎ کمالات اشرفیہ صفحہ [illegible] ۳؎ مراقبہ صفحہ [illegible] ۴؎ کمالات اشرفیہ صفحہ [illegible]۔

سوچنے سے جی جو دل گھبراتا ہے تو حیات کو سوچے کہ اس حیات سے اچھی ایک دوسری حیات ہے جو خیر بھی ہے (یعنی) اور باقی رہنے والی بھی ہے لہٰذا بہت لذیذ بھی ہے اشتہی بہت زیادہ پسندیدہ بھی ہے، یوں تصور کرے کہ میں آسمان پر پہنچا ہوا ہوں، بہشت میں ہوں، جنت کی قصور کی سیر کر رہا ہوں پھر یہ خیال کرے کہ یہ چیزیں جب ملیں گی جب خدا کے حکموں کی پابندی کروں گا اس سے لالچ اور رغبت پیدا ہوگی اور اعمال صالحہ سرزد ہونے لگیں گے۔

طریق تحصیل | دو عظیم چیزوں (یعنی دنیا و آخرت کی حقیقت) کا ذہن میں حاضر کرنا۔ (تفکر کی تحصیل کا طریق ہے)

چھٹی فصل، تفویض کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس مومن نے کہا۔

وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔ آیہ — اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، خدا تعالیٰ سب بندوں کا خود نگران ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

إذا أصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء وإذا أمسيت فلا تحدث نفسك بالصباح۔ الحديث — جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ کرو اور شام ہو تو صبح کے متعلق خیال نہ کرو۔

حقیقت تفویض و طریق کار | اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا کہ جو وہ چاہیں ان میں تصرف کریں اور اپنی طرف سے کوئی حالت یا نظام تجویز نہ کرنا (تفویض ہے) جو تمام حالات کو شامل ہے، خواہ وہ حالات آفاقیہ ہوں، خواہ انفسیہ ہوں، پھر انفسیہ میں خواہ احوال حسیہ ہوں جیسے مرض و صحت اور قوت و ضعف، خواہ باطنیہ ہوں جیسے قبض و بسط، ہیبت و انس اور محبت و شوق و امثالہا۔

۱ے تعلیم الدین صفحہ ... ۲ے ایضاً ... ۳ے انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۲۳

یہ سمجھ کر تفویض اختیار کرو کہ تم غلام ہو اور وہ آقا ہیں اور آقا کا حق ہے کہ غلام اپنے سب
امور اُسی کو مفوض کر دے اور اپنی منفعت و مصلحت کا خیال نہ کرے پھر وہ منافع و مصالح
بھی خود بخود حاصل ہو جائیں گے کیونکہ وہ تفویض کے ساتھ لگے ہوئے ہیں لیکن رائے حق
عظمت کے ساتھ وہ منافع مع ثواب و رضا کے حاصل ہوں گے اور اس کے بغیر گو منافع
مرتب ہوں گے مگر اس میں رضا و قرب زیادہ نہ ہوگا۔

(الغرض) اپنی تجویز کو دخل نہ دیں بلکہ اپنی تربیت کو خدا تعالیٰ کے سپرد کریں کہ جس طرح
چاہیں تربیت کریں، حالات و کیفیات عطا کریں یا سلب کر لیں اپنی تجویز کو خدا تعالیٰ کی تجویز
میں فنا کر دیں یعنی کامل عبدیت اختیار کریں۔

طریق تحصیل | جب کوئی ناگوار واقعہ پیش آوے اس وقت اس کو خوب ذہن میں حاضر
کر لیا جاوے کہ یہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے۔ بتدریج توالی اللہ کو یہ
حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے خدا تعالیٰ کی حکمت و قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادہ
و تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے پھر یہ حالت ان کے لیے طبعی بن جاتی ہے۔

ساتویں فصل ۔ تقویٰ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ — اے ایمان والو خدا سے ڈرو اور سچے
کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ — لوگوں کے ساتھ رہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الا ان التقوی ھھنا واشار — آگاہ رہو کہ تقویٰ یہاں ہے اور آپ نے
الی الصدر — قلب کی طرف اشارہ کیا۔

حقیقت تقویٰ | تقویٰ کا مادہ اور اس کا استعمال قرآن مجید میں جس قدر ہے غالباً کسی چیز کا اتنا
نہیں ہوا ہے اس سے اس کا اہتمام بالشان ہونا معلوم ہوا حقیقت اس کی

[illegible]

یہ ہے کہ تقویٰ کا استعمال شریعت میں دو معنی میں ہوتا ہے ایک ڈرنا دوسرے بچنا اور تامل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود تو معاصی سے بچنا ہی ہے مگر سبب اس کا ڈرنا ہے کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں ہوتا ہے تبھی اس سے بچا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اول جب فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ کا نزول ہوا تو اس سے صحابہؓ ڈر گئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی حق تقویٰ لازم ہوگیا۔ حالانکہ شروع ہی سے تقویٰ کا حصول دشوار ہے۔ حق تقویٰ کے معنی ایک تو یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شان کے لائق جیسا تقویٰ ہے وہ اختیار کرو (سو آیت میں) یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور اس کی تکلیف تکلیف مالایطاق ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجا لاؤ۔ آیت میں یہی معنی مراد ہیں۔ ابتدا ہی سے انسان کا اس درجہ میں پہنچ جانا دشوار ضرور ہے تو صحابہ کرامؓ نے اس آیت کو یہی معنی لیے سمجھا اور پھر یہ خوف ہوا کہ حق تقویٰ کا آج ہی سے حاصل ہونا تو بڑا دشوار ہے پھر اس حکم کی تعمیل کیونکر ہو۔ اس پر دوسری آیت نازل ہوئی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ یعنی جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہو سکتا ہے اس وقت تو اسکو اختیار کرو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہو جائے اس آیت نے پہلی آیت کی تفسیر کردی۔

تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں، ایک تقویٰ یہ ہے کہ کفر اور شرک سے بچے دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ کو ترک نہ کرے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے۔ پھر جیسے جیسے اعمال بڑھیں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا رہے گا اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا۔ حتیٰ کہ درجۂ "احسان" حاصل ہو جائے گا جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہی تقویٰ کا بھی اعلیٰ درجہ ہے اور یہی درجہ مطلوب ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ	مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کی طرف لیکن (اصل)
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ ...

ل بیان القرآن صفحہ ۹ ۔

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	و صفات) پر یقین رکھے اور (اسی طرح) قیامت
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ	کے دن (آنے) پر بھی اور فرشتوں (کے وجود)
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ	پر بھی اور (اللہ کی) کتاب پر اور (سب)
ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	پیغمبروں پر بھی اور (وہ شخص) مال دیتا ہو
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	اللہ کی محبت میں (اپنے حاجتمند) رشتہ داروں کو
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَ	اور (نادار) یتیموں کو اور (دوسرے غریب)
اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ	محتاجوں کو بھی اور (بے خرچ) مسافروں کو
وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ	اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور قیدی
اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ	اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ
فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ	کرتا ہو) اور وہ شخص نماز کی پابندی بھی رکھتا
حِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ	ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ	(کہ ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ الآیہ	رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے
	ہوں جب (کسی جائز امر کا) عہد کر لیں اور
	(اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ)
	وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل مزاج رہنے والے
	ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے)
	بیماری میں اور (تیسرے معرکہ) قتال (کفار)
	میں (یعنی کم ہمت اور پریشان نہ ہوں) یہ لوگ
	ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں اور
	یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جا سکتے) ہیں

غرض اصلی مقاصد اور کمالات دین کے یہ ہیں۔ نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا انھیں کمالات مذکورہ میں سے ایک کمال خاص یعنی اقامت صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے اور اس

کے حسن سے اس میں بھی حسن آگیا ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا۔

اس آیت میں تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے جس میں اول نفس صورت بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے اس کے بعد ایمان باللہ و ایمان بالمعاد اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا ذکر ہے یہ تو اعتقادیات کے متعلق ہے۔ پھر حب مال کو قلب سے زائل کرنے کا امر ہے اور محبت الٰہی میں مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے۔ پھر اقامت صلوٰۃ کا امر ہے۔ یہ طاعت بدنیہ ہے۔ پھر ایتاء الزکوٰۃ کا، یہ طاعت مالیہ ہے۔ اس کے بعد ایفاء عہد کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے۔ پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے۔ غرض اس میں تمام شعب تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا ہے اسی لیے اولٰئک ھم المتقون پر اس کو ختم فرمایا ہے۔

اعمال[2] تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو دین میں نافع ہیں۔ ان کا کرنا مامور بہ ہے خواہ درجہ فرضیت و وجوب میں ہو یا درجہ سنیت و استحباب میں۔ اور بعض وہ ہیں جو دین میں مضر ہیں۔ ان کا ترک مامور بہ ہے۔ خواہ درجہ حرمت میں ہو یا کراہت میں اور بعض وہ ہیں کہ جن کے فعل یا ترک کا امر نہیں، وہ مباحات ہیں۔ مباحات اثر کے لحاظ سے دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ دین کے لیے نافع ہیں جیسے بغرض حفظ صحت چلنا پھرنا، ورزش کرنا یا نافع نہیں۔ اگر دین میں نافع ہے تو وہ فعلاً مامور بہ ہے گو درجہ وجوب میں نہ ہو مگر جب مباح نافع فی الدین کو اچھی نیت سے کیا جائے تو وہ مستحب ضرور ہو جاتا ہے اور اس پر ثواب بھی ملتا ہے یا وہ دین میں نافع نہیں تو فضول ہے اور فضولیات کا ترک کر دینا مامور بہ شرعاً ہے چنانچہ حدیث میں ہے من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ اسلام کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ مالایعنی کو ترک کر دیا جائے۔ جب فضولیات کے ترک کو حسن اسلام میں دخل ہے اور حسن اسلام مامور بہ اور مطلوب ہے تو ان فضولیات کا ترک بھی مامور بہ ہو گیا۔ گو اس درجہ میں نہ کہا جائے مگر فضولیات میں اشتغال کراہت سے خالی نہیں لیکن جس طرح حرام اور مکروہ سے بچنا ضروری ہے اسی

[illegible]

طرح فضولیات سے بچنا بھی ضروری کام ہے۔ غرض بے ضرورت مباحات میں مشغول ہونا بھی برا ہے اور ضرورت کے وقت مشغول نہ ہونا بھی برا ہے۔

بعض لوگ قبل اسلام کے حالتِ احرامِ حج میں اگر کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تو دروازہ سے جانا ممنوع جانتے تھے اس لیے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے۔ اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے حق تعالیٰ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ [1]	اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ (احرام نہیں اس لیے ان کے بچنے کی ضرورت نہیں سو گھر آنا ہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو امید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہو جاؤ۔

اس آیت سے ایک بڑے کام کی بات معلوم ہوئی کہ جو شئے شرعاً مباح ہو اس کو طاعت و عبادت اعتقاد کر لینا اسی طرح اس کو معصیت اور عمل ملامت اعتقاد کر لینا شرعاً مذموم ہے چنانچہ گھروں کے دروازوں سے آنا مباح تھا۔ اس کو ان لوگوں نے معصیت سمجھا تھا اور دروازہ چھوڑ کر کسی اور طرف سے آنا بھی فی نفسہ مباح ہے اس کو ان لوگوں نے عبادت و فضیلت سمجھا تھا۔ اس پر حق تعالیٰ نے ان پر رد فرمایا اور ان کے اعتقاد کو باطل اور مخالف تقویٰ کے ٹھہرایا اور تقویٰ کو واجب فرمایا۔ تو جس چیز سے واجب کا ترک اور خلاف لازم آتے گا وہ ضرور گناہ ہوگی پس ان کے یہ دونوں اعتقاد گناہ ہوئے اس قاعدہ سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہو گیا جو کہ عوام بلکہ خواص میں بھی شائع ہیں۔

---

[1] بیان القرآن صفحہ ۱۶۔

(نیز خیال رہے کہ ہر شئی (اور اعضاء) کا تقویٰ ہے۔ آنکھ کا تقویٰ یہ ہے کہ بُری نگاہ سے کسی عورت یا مرد کو نہ دیکھے زبان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ کرے (جھوٹ نہ بولے) کسی کو ستائے نہیں۔ اسی طرح ہاتھ کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے شہوت سے مَس نہ کرے۔ پاؤں کا تقویٰ یہ ہے کہ بری جگہ چل کر نہ جائے۔ کان کا تقویٰ یہ ہے کہ کسی کی غیبت نہ سنے۔ راگ باجہ سے بچے۔ وضع میں بھی تقویٰ ہے کہ خلافِ شریعت وضع نہ رکھے۔ پیٹ کا تقویٰ یہ ہے کہ حرام مال نہ کھائے (وغیرہ)

حاصل یہ ہے کہ صادق اور متقی یہی لوگ ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں (جو مذکور ہوئے) اور ان اوصاف میں تمام اجزاء دین کا ذکر اجمالاً آگیا۔ دین کا کوئی جزو اس سے باقی نہیں رہا۔ اس سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوگئی کہ صادق اور متقی وہی شخص ہے جو دین میں کامل ہو۔ پس صدق اور تقویٰ کی حقیقت "کمال دین" ہونا ثابت ہوگیا۔

طریق کار | جو کام کریں اس میں یہ دیکھ لیں کہ ہم خلاف شریعت تو نہیں کرتے خواہ دین کا ہو یا دنیا کا۔ دین کے کام میں تو یہ دیکھ لیں کہ شریعت نے اس کی کامیابی کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ کیا ہے اس کے موافق کریں اور دنیا کا جو کام کریں اس میں صرف یہ دیکھ لیں کہ جائز ہے یا ناجائز۔

طریق تحصیل | اللہ تعالیٰ کے قہر و عتاب کو یاد کرنا اور سوچنا اس کا طریق تحصیل ہے۔

آٹھویں فصل۔ تواضع کا بیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا | اور رحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

لہ اصلاح صہ ۱۹۔

اور بات ہے۔

طریق تحصیل | (طریق تحصیل وہی ہے جو کبر کا طریق علاج ہے۔)

نویں فصل۔ توبہ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا — اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی طرف
إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا [۱] — خالص توبہ کرو

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

يا ايها الناس توبوا الى الله [۲] — اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو

توبہ کی حقیقت | خدا کو یاد کر کے دل کا دکھ جانا اور اس کے لیے لازم ہے اس گناہ کا ترک کر دینا اور آئندہ کو پختہ ارادہ رکھنا کہ اب نہ کریں گے اور خواہش کے وقت نفس کو روکنا (توبہ کہلاتا ہے)۔

توبہ کے معنی رجوع کرنے اور بعد سے قرب کی جانب لوٹ آنے کے ہیں۔ مگر اس کے لیے بھی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے۔ ابتدا تو یہ ہے کہ قلب پر نور معرفت کی شعاعیں پھیل جائیں اور دل کو مضمون کی پوری آگاہی حاصل ہو جائے کہ گناہ سم قاتل ہے اور تباہ کر دینے والی شے ہے اور پھر خوف اور ندامت پیدا ہو کر گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خالص رغبت ایسی پیدا ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اس کو فوراً چھوڑ دے اور نہ آئندہ کے لیے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم قصد کر لے اور اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے گذشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے۔ جب ماضی اور مستقبل اور حال تینوں زمانوں کے متعلق توبہ کا ثمرہ پیدا ہو جائے گا تو گویا توبہ کا وہ کمال حاصل ہو گیا جس کا نام توبہ کی انتہا ہے۔

---

[۱] تعلیم الدین صفحہ ... [۲] ... تبلیغ دین صفحہ

محققین[1] کا مشہور قول تو یہ ہے کہ توبہ کے لیے ضروری ہے کہ عدم عود (یعنی پھر
گناہ نہ کرنے) کا عزم ہو لیکن بعض محققین کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں بلکہ عزم کا نہ ہونا
ضروری ہے کیونکہ اس عزم میں ایک قسم کا دعویٰ اور مشیت سے غفلت بلکہ مشیت سے
معارضہ ہے لیکن ذوق اور ظاہر نصوص اس کے خلاف ہیں کیونکہ یہ عزم مقدمہ ہے
کف کا اور کف واجب ہے اور واجب کا مقدمہ واجب ہوا کرتا ہے اس لیے عزم
عدم عود توبہ کے لیے لازم ہے۔ میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ عزم کے ساتھ قدرت
و مشیت الٰہی پر بھی نظر کرے کہ استناد کا بھی اندیشہ رکھے۔ غیر عارفین کی توبہ کی طرح نہ ہو کہ
عزم کرتے ہوئے قضا و قدر سے بالکل غافل رہتے ہیں۔ محققین[2] کے نزدیک توبہ کی
حقیقت صرف ندامت ہے جیسا کہ حدیث میں ہے التوبة الندم۔ یہ عزم مستقل طاعت
ہے۔ صحت توبہ کا موقوف علیہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى	ترجمہ: توبہ جس کا قبول کرنا (حسب وعدہ) اللہ تعالیٰ
اللّٰهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ	کے ذمہ ہے وہ تو ان لوگوں کی ہے جو حماقت سے کوئی
السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ	گناہ (صغیرہ یا کبیرہ) کر بیٹھتے ہیں پھر قریب
يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ	ہی وقت میں (یعنی قبل حضور موت) توبہ کر
فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ	لیتے ہیں سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ توجہ (قبول
عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ	توبہ کے ساتھ) فرماتے ہیں (یعنی توبہ قبول
عَلِيْمًا حَكِيْمًا وَ	فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں
لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ	(کہ کس نے دل سے توبہ کی) حکمت والے ہیں
يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ	(کہ دل سے توبہ نہ کرنے والوں کی فضیحت نہیں
حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ	کرتے) اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں
اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ	جو برابر گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک

---

[1] نظام جنبی ص ۱۹۲ ج ۱، [2] ... ص ۱۵، سکہ بیان القرآن ص ۱۱ ج ۲

عصمتِ انبیاء (یعنی انبیاء کا گناہوں سے پاک ہونا) ایک مسلّم مسئلہ ہے پھر بھی آپ استغفار فرماتے تھے۔ (یہ انبیاء اور) اکابرین مقبولین کی حالت ہے تو ہم کس شمار میں ہیں اس کی پرواہ نہ کریں کہ توبہ ٹوٹ جائے گی جب توبہ ٹوٹ جائے فوراً دوبارہ پھر توبہ کرلیں مگر شرط یہ ہے کہ توبہ دل سے ہو یعنی توبہ کے وقت یہ عزم پختہ ہو کہ اب یہ گناہ نہ کریں گے اس طرح توبہ کرکے اگر سو مرتبہ بھی توبہ ٹوٹے کچھ پرواہ نہیں۔ ہر دفعہ پھر توبہ کرتے رہیں۔ خدا کے مقبولوں اور اہلِ فلاح میں سے شمار ہوں گے ؎

[2] باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

یعنی ہماری درگاہ کی طرف ضرور واپس آؤ جو کچھ بھی تم ہو واپس آؤ۔ اگر کافر و بت پرست ہو تو بھی واپس آؤ۔ یہ ہماری درگاہ ناامیدی کی درگاہ نہیں ہے۔ سینکڑوں بار اگر توبہ توڑ چکے ہو تو بھی واپس آؤ اور توبہ کرو۔ ہم قبول کریں گے۔

(۱) [3] حق تعالیٰ کی وسعتِ رحمت ہے کہ ہر حالت میں اجازت دے دی کہ ہم سے باتیں کرو ہمارا نام لے لو ہر حالت میں سماعت ہوگی۔

(۲) توبہ [4] کی بدولت حق تعالیٰ کی رحمت و نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔ استغفار کے بعد جمعیتِ قلب حاصل ہوگی۔

(۳) اگر [5] ساری زمین گناہوں سے بھر جاوے تو توبہ سب کو مٹا دیتی ہے جیسے بارود ذرا سی ہوتی ہے مگر بڑے بڑے پہاڑوں کو اڑا دیتی ہے۔

(۴) دین اور دنیا کی حاجتوں کے بر آنے کا ذریعہ استغفار ہے۔

(۵) حق تعالیٰ کی ناراضی کا علاج ماضی سے استغفار و توبہ اور آئندہ کے لیے اصلاح (عمل [6])

(۶) توبہ [7] کرنے سے گناہ کی عادت اور اس کا تقاضا بدل جاتا ہے۔

---

[1] الجمعین ص ۲۴ ۔ [2] دعوات عبدیت ص ۲۲ ج ۱ ۔ [3] شرف الکلام ص ۱۹ ۔
[4] [illegible] ص ۱۹۳ ۔ [5] کمالات اشرفیہ ص ۴۸، ۲۴۸، ۵۲ ۔ [6] [illegible]

طریق کار | توبہ بسبب معصیت ہوتی ہے۔ اگر کسی نے کبھی جو عمل کو قابل تدارک ہے اور علاوہ کی ضرورت اور عدم ضرورت میں بھی۔ چنانچہ ترک نماز سے توبہ کے لیے ضروری ہے کہ فوت شدہ قضا کریں۔ (اسی طرح روزہ وغیرہ کی قضا کریں) خاص معاصی کے لیے توبہ کا اعلان ضروری ہے اخلاص اور ندامت بھی شرائط میں سے ہیں یعنی اس طریقہ سے توبہ کریں تو خوب کامل ہو۔ پس یہ نفس توبہ کا طریقہ نہیں بلکہ کمال توبہ کا طریقہ ہے۔

(۲) گذشتہ گناہوں[1] پر ندامت و معذرت ظاہر کریں اور جو حقوق العباد واجب الادا ہیں فی الحال ان کے ادا کا عزم کریں اور فی الحال ان کے ادا کا اہتمام کریں۔ یا اہل حقوق سے معاف کرائیں۔

(۳) اگر گناہ صادر ہو جائے تو فوراً دو رکعت نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں پھر توبہ کریں۔ زبان سے بھی توبہ کریں اور رونے کی شکل بنا کر خدا تعالیٰ سے خوب معافی مانگیں اس طرح توبہ کرنے میں ظاہراً چند مصلحتیں ہیں۔

(الف) اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ نیکیاں گناہوں کو زائل کرتی ہیں۔

(ب) نماز میں توبہ کرنے میں دل حاضر ہوگا اور قبول توبہ کے لیے حضور قلب ضروری ہے۔

(ج) چونکہ نفس کو نماز شاق ہے اس لیے نفس گناہوں سے گھبرائے گا کہ جان کی آفت سرگرد بلکہ شیطان بھی گناہ کرانا چھوڑ دے گا کیونکہ وہ سمجھے گا کہ میں اس سے ایک گناہ کراؤں گا تو یہ دو رکعتیں پڑھے گا۔ گناہ تو توبہ سے معاف ہو جائیں گے اور یہ دو رکعتیں اس کے پاس نفع میں رہیں گی۔

(۴) توبہ کے لیے تو گناہوں کو یاد کرے، اس کے بعد بھی جو گناہ ہو گئے توبہ کر لے مگر اس کو جان بوجھ کر یاد نہ کرے کیونکہ اس سے بندہ اور خدا کے درمیان ایک حجاب سا معلوم ہونے لگتا ہے جو محبت اور ترقی سے مانع ہے جس کا اثر یہ ہوگا کہ دل سے بھی ملاپ کی ہوگی کیونکہ جو آثار اور ثمرات کا ترتیب عمل پر ہوتا ہے۔ توبہ نصوح کے بعد اگر از خود پرانا گناہ یاد آجاوے تو پھر تجدید

---

[1] انفاس عیسیٰ ص ۴۹ ج ۲۔

قسم دوم توکل عملی ۔ اس کی حقیقت ترک اسباب ہے پھر اسباب کی دو قسمیں ہیں ۔ اسباب دینیہ اور اسباب دنیویہ ۔ اسباب دینیہ ، جن کے اختیار کرنے سے کوئی نفع دینی حاصل ہو ، ان کا ترک کرنا محمود نہیں بلکہ کہیں گناہ اور کہیں خسران و حرمان ہے اگر وہ امر دین واجب ہے تو اس کے اسباب اختیار کرنا واجب ہے اور اگر مستحب ہے تو اس کے اسباب اختیار کرنا مستحب ہے اور یہ (ترک اسباب) شرعاً توکل نہیں ۔ اگر لغۃً توکل کہا جاوے تو یہ توکل مذموم ہے اور اسباب دنیویہ جن سے دنیا کا نفع حاصل ہو اس نفع کی دو قسمیں ہیں ۔ حلال ، حرام ۔ اگر حرام ہو تو اس کے اسباب کا ترک کرنا ضروری ہے اور یہ توکل فرض ہے اور اگر حلال ہو ، اس کی تین قسمیں ہیں یقینی ، ظنی ، وہمی ۔ اسباب وہمیہ جن کو اہل حرص و طمع اختیار کرتے ہیں جس کو طول امل کہتے ہیں ۔ ان کا ترک کرنا ضروری ہے اور یہ توکل واجب ہے اور اسباب یقینیہ جن پر وہ نفع عادۃً ضرور مرتب ہو جاوے ، جیسے کھانے کے بعد آسودگی ہو جانا ۔ پانی پینے کے بعد پیاس کم ہو جانا اس کا ترک کرنا جائز نہیں اور نہ شرعاً یہ توکل ہے اور لغۃً توکل کہا جاوے تو یہ توکل نا جائز ہے اور اسباب ظنیہ جن پر غالباً نفع مرتب ہو جاوے مگر بار ہا تخلف بھی ہو جاتا ہو جیسے علاج کے بعد صحت کا ہو جانا ۔ یا نوکری و مزدوری کے بعد رزق حاصل ہونا ان اسباب کا ترک کرنا ، یہ جس کو عرف اہل طریقت میں اکثر توکل کہتے ہیں ۔ اس کے حکم میں تفصیل یہ ہے کہ ضعیف النفس کے لیے تو جائز نہیں اور قوی النفس کے لیے جائز ہے ۔ بالخصوص جو شخص قوی النفس بھی ہو اور خدمت دین میں مشغول ہو اس کے لیے مستحب بلکہ کسی قدر اس سے بھی مؤکد ہے پس خلاصہ یہ ہوا کہ توکل علمی تو مطلقاً اور عملی میں بعض ترک اسباب حرام و ترک اسباب نفع دنیوی موہوم فرض ۔ و بعض ترک اسباب دینیہ و بعض ترک اسباب دنیویہ مباح یقینیہ حرام و مذموم ۔ بعض ترک اسباب مباحہ دنیویہ ظنیہ ، ضعیف النفس کو حرام اور قوی النفس کو مستحب ، پس تین قسمیں فرض اور دو ہیں حرام ۔ اور ایک بعض اوقات میں حرام اور بعض اوقات میں مستحب ۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ جو توکل شرعاً لینہ ہے اس میں اور طاعت میں تنافی ہے ورنہ کوئی منافات نہیں ۔ واللہ اعلم ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال سے تو یہاں تک اس استدلال کا پتہ

له مکاتبات امدادیہ ص

ہے اور اس میں زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے اگر صاحب معاملہ کو ایسی بصیرت نہ ہو تو کسی
مصلح تجربہ کار سے مشورہ کی حاجت ہے وہ یہ کہ اس غلط حرکت فکریہ کا طریق کیا ہے کیونکہ یہ قطع
بالکلیہ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا طریق یہ ہے کہ اپنے قلب کو کسی محمود چیز کی طرف قصداً
متوجہ کر دیا جائے جو وضع صلوٰۃ کے خلاف نہ ہو مثلاً ذات حق کی طرف برابر توجہ رہے اگر خیال
نہ جمنے کی وجہ سے اس پر قادر نہ ہو تو یہ تصور کرے کہ میں کعبہ حسنیٰ کی طرف رخ کیے ہوئے ہوں
یا نماز میں جو اذکار و قرأت پڑھ رہا ہے ان کی طرف توجہ رکھے کہ میں یہ الفاظ پڑھ رہا ہوں یا ان
کے معانی کی طرف توجہ رکھے چونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا اس لیے یہ توجہ دوسرے
خطرات کے آنے سے مانع ہو جائے گی یہ ہے وہ طریق۔

اب اس میں ایک غلطی ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر شخص کی استعداد جدا ہے کسی کے لیے ایک تصور
نافع ہے تو کسی کے لیے دوسرا تصور بعض اوقات صاحب معاملہ بوجہ عدم بصیرت و عدم تجربہ
اپنے لیے ایک طریق کو اختیار کرتا ہے اور وہ طریق اس کی طبیعت کے مناسب نہیں ہوتا اس لیے
اس سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اور بار بار کی ناکامی سے مایوس ہو کر اس غلط گمان میں مبتلا ہو جاتا
ہے کہ خشوع فعل اختیاری نہیں اس لیے بالکل اس کا اہتمام چھوڑ بیٹھتا ہے اور اس مامور بہ
کی برکت سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے اپنے مناسب طریق کی تعیین کرنے کے لیے سخت اہتمام کی حاجت
ہے۔

دوسری غلطی اس سے اشد یہ ہوتی ہے کہ تعیین کے بعد جس طریق کو اختیار کیا گیا ہے اس
میں کاوش زیادہ کرنے لگتا ہے اور اس کا استحضار و حضور رکھتا ہے کہ دوسرا کوئی خیال اصلاً آنے
نہ پائے اور اس کے لیے طبیعت پر زور ڈالتا ہے۔ حتیٰ کہ نوبت کلال و ملال کی پیش آتی ہے جس کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد ترک کر دیتا ہے سو اس کے لیے ترک کاوش کی ضرورت ہے بس سرسری معتدل
توجہ کافی ہے اگر اس توجہ کے ساتھ کوئی دوسرا خطرہ آجائے وہ غیر اختیاری ہوگا اور غیر مضر ہوگا
جیسے کسی خاص مسجد میں سے کسی خاص نقطہ پر قصداً نظر کی جائے تو یقینی بات ہے کہ وہ شعاعیں بلا قصد
دوسرے نکات پر بھی پہنچ جاتی ہیں مگر وہ نظر قصدی نہیں ہوتی۔

اور ایک غلطی سب سے بڑھ کر ہوتی ہے کہ دوسرے خیال کے آنے کے ساتھ یہ سوچنے لگتا ہے

کہ یہ خیال قصداً آیا یا بلا قصد، سو یہ فیصلہ مشکل ہوتا ہے۔ اگر فرضاً اس کی تحقیق ہو جاوے کہ قصداً آیا
گو اب گزشتہ کا تو تدارک ہو نہیں سکتا۔ آئندہ کے لیے تدارک ہی کیا جاوے گا۔ جو اگر اس فیصلہ
کے بدون بھی اس تدارک میں مشغول ہو جاوے تو کیا ضرر ہے (اور وہ تدارک بطور تنبیہ کے تجدید ہے
اسی توجہ مقصود کی) اور نیت و ارادہ جو کہ مترادف ہیں قبل اختیار ہوتے ہیں جو بدون اختیار کے صحت
امور سب کے کافی نہیں۔ جیسے نماز کی نیت کرے مگر فعل صلوٰۃ کا اختیار نہ کرے ناکافی ہے۔[1]

اصل میں جو توجہ خطرات کی قاطع ہے وہ دو قسم کی ہے ایک مع الخوض اگرچہ اشیاء مختلفہ کی
طرف ہو۔ دوسری شے واحد کی طرف اگرچہ بلا خوض ہو سو جس شخص کو آیات و اذکار کے معانی بلا
خوض کے ذہن میں آ جاتے ہوں وہاں نہ خوض ہے نہ جس چیز میں فکر سے کام لیا جاتا ہو وہ شے
واحد ہے اس لیے توجہ کی کوئی قسم نہ پائی گئی۔ پس وہ قاطع خطرات بھی نہ ہو گی بخلاف اس شخص
کے جس کو سوچنے سے معنی یاد آتے ہیں، اس شخص کی توجہ قاطع خطرات ہو گی پس ایسے شخص کے
لیے دوسری توجہ کی ضرورت ہو گی یعنی شے واحد کی طرف خواہ وہ شے واحد کچھ ہو۔ ذات حق ہو
یا رویت حق للعبد یا نظر الی الکعبہ یا کچھ اور۔ اور توجہ الی الحق یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کا اجمالاً
تصور رکھے جس طریق سے بھی بے تکلف ذہن میں آ جاوے۔ زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں یا ان کے
کسی فعل کا تصور رکھے مثلاً وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔

توجہ الی الشی الواحد کا ایک طریق میں نے تجویز کیا ہے جو نہایت درجہ سہل بھی ہے اور بے حد
نافع بھی ثابت ہوا وہ یہ کہ اپنی تمام حالت صلوٰۃ و کلمات نماز کا بلکہ سارے اعمال میں بھی ان
کا تصور رکھے کہ یہ سب عنقریب حق تعالیٰ کے اجلاس میں پیش ہوں گے تو ان میں کوئی عمل اتنا
نکما نہ ہو کہ یہ پیشی کے قابل نہ ہو بس اتنا تصور کافی ہے۔ ابتداً تو استحضار ضعیف ہو گا مگر عادت
ڈالنے (کوشش) کے بعد اس میں دوام ہو جاوے گا۔[2]

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے کھڑے ہوتے اور نماز
میں آپ کو کچھ خطرہ ہوا (الحدیث شمائل الترمذی) اس حدیث سے (خشوع کا) عدم اشتراط معلوم

---

[1] تصوف و سلوک صفحہ ۱۸۰ [2] الکشف صفحہ ۲۲۰

درستی میں فی سال ایک مہینہ ہی خرچ کر دیجیے، یعنی کم از کم ایک مہینے ہی کسی کامل بزرگ کی صحبت میں خرچ کیجیے اور اس کے ارشاد کے مطابق عمل کیجیے۔ حق تعالیٰ کی عادت ہے کہ اس کی برکت سے خشوع کی دولت عطا فرماتے ہیں۔

طریق خشوع فی الارادہ

خشوع کے لیے عمل کی ابتدا میں توجہ کافی ہے ہر ہر لفظ پر ضروری نہیں۔ مثلاً قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے یہ خیال کریں کہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے تلاوت کرتا ہوں، یہ کافی ہے ہر ہر حرف پر ایسی توجہ ضروری نہیں۔ کیونکہ یہ تکلیف مالا یطاق ہے مگر اس میں یہ قید بھی ہے کہ جب تک اس کی ضد و توجہ متحقق نہ ہو اس وقت تک اسی پہلی توجہ کو باقی سمجھا جائے گا جیسا کہ انسان چلنے سے پہلے یہ ارادہ دل میں کرے کہ جامع مسجد کی طرف چلتا ہوں بس اتنا کافی ہے ہر ہر قدم پر یہ ارادہ ضروری نہیں ورنہ چلنا دشوار ہو جائے گا۔ ہاں اگر کسی دوسری جانب ایسی توجہ جو کسی توجہ کے متضاد ہو پائی جاوے تو پھر پہلی توجہ معدوم ہو جائے گی۔

طریق خشوع فی الاعمال

طبیعت کو مجبور کرنے سے اعمال مثلاً نماز میں خشوع حاصل ہو سکتا ہے۔ پس انسان اسی کا مکلف ہے اور مجبور کرنا مجاہدہ ہے اور عمل مع المجاہدہ، عند اللہ عمل بلا مجاہدہ سے افضل ہے جس کو مبتدی طلب کرتا ہے۔ اگر غفلت سے ادھر ادھر کے پریشان خیالات موجود ہوں اور بہ تکلف نماز کی طرف متوجہ ہو جایا کرے یہی مجاہدہ ہے اور خود آنا مطلوب نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

الذی یتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران — جو شخص پڑھنے میں اٹکتا ہے اور وہ اس پر دشوار بھی ہے تو اس کو دوہرا ثواب ہوگا۔

(یعنی ایک ثواب تو پڑھنے کا اور دوسرا محنت اور مجاہدہ کا)

تواب خشوع کا وظیفہ سمجھیں کہ رٹنے والے حافظوں کی طرح نہ پڑھا کریں بلکہ جیسے ناظرہ خواں یا حافظ کی طرح جس کا قرآن کچا ہو تو جس طرح ایک ناظرہ خواں یا حافظ ہر لفظ کو دیکھ کر یا سوچ کر ادا

؎ الکلام الحسن صفحہ ؎ انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۲۳ ؎ بخاری صفحہ

حق تعالیٰ نے انبیاء کی بابت فرمایا ہے۔ يَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ کہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور حضرت موسیٰ کے بارہ میں آیا ہے کہ وہ اژدہا سے ڈر گئے تھے تو وہ خوف طبعی تھا اور نص میں خوف عقلی مراد ہے اور خوف عقلی انبیاء کرام کو خدا کے سوا کسی سے نہیں ہوتا کیونکہ ان کا اعتقاد ہے وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ کہ بدون خدا کے حکم کے کوئی چیز ضرر نہیں دے سکتی۔ وہ ضار و نافع حق تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں۔ یہاں سے ان سالکین کی غلطی بھی معلوم ہو گئی جو ابتداء میں مختلف لوگوں کے غلبۂ خوف و بکا کو دیکھ کر افسوس کیا کرتے ہیں کہ ہم کو ایسے ایسے حالات نہیں ہوتے۔ رونا نہیں آتا۔ تو وہ سن لیں کہ یہ طبعی گریہ ہے جو بعض کو پیش آتا ہے اور یہ مطلوب نہیں مطلوب عقلی گریہ ہے اور وہ تم کو بھی حاصل ہے کیونکہ نہ رونے پر افسوس ہونا یہ خود گریہ ہے۔

خوفِ مطلوب اور اس کی ضرورت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرماتے ہیں۔

اللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُولُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيكَ۔ — اے اللہ ہم آپ کے خوف میں سے اس قدر مانگتے ہیں کہ اس سے آپ ہم میں اور معصیت میں حائل ہو جائیں۔

تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیت، معصیت سے بچنے کے لئے مطلوب ہے بالذات مطلوب نہیں ورنہ خَشْيَتَكَ (تیرا خوف) مطلق فرماتے۔ کسی چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد یہاں فرما دی کہ اس قدر چاہئے جس کہ معصیت سے مانع ہو معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں جب تک اس کی وجہ نہیں۔ یہ ہو اور اگر خوف ہی خوف ہو کہ رجا نہ رہے اور ناامیدی کی حد تک پہنچ جائے

لہ وعظ [illegible]

يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ — لوگ میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں

سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ — وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں

دَاخِرِيْنَ۔ الآیۃ — گے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الدعاء مخ العبادۃ۔ الحدیث — دعا عبادت کا مغز ہے۔

دعا کی حقیقت

دعا کی حقیقت نیاز مندی کا سچا اظہار اپنی حاجت و احتیاج کو پیش کرنا کہ نے اللہ ہی کے ہیں یہ مقصد ہے، آیت و حدیث دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دعا عین عبادت ہے، خواہ کسی قسم کی ہو۔ دینی ہو یا دنیوی ہو مگر ناجائز امر کے لیے نہ ہو۔ خواہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی۔ حدیث شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا تعالیٰ سے مانگا کرو اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لیے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں مگر دعا ایک ایسی عبادت ہے کہ یہ اگر دنیا کے لیے ہی ہو تب بھی عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے۔ مثلاً مال مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے۔ جب بھی ثواب کا مستحق ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے من لم یسئل اللہ یغضب علیہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اس پر اللہ تعالیٰ غصہ کرتے ہیں (اور یہ آیت بالا سے بھی مفہوم ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو برابر مانگتا رہے اس سے خوش ہوتے ہیں)۔

[1] ہر تدبیر میں انسان اپنے جیسے عاجز کے سامنے احتیاج کو ظاہر کرتا ہے خواہ قالاً یا حالاً اور دعا میں اس سے مانگتا ہے جو سب سے زیادہ کامل القدرت ہے اور جس کے سب محتاج ہیں اور عقل بھی یہی کہے گی کہ جو سب سے زیادہ قادر ہے اسی سے مانگنا بہت انفع ہے۔ پس یقیناً یہ تدبیر دعا ہر تدبیر سے بڑھ کر ہے کیونکہ اور تدبیر بھی حق تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہی سے کامیاب ہوتی ہے۔ تو جو شخص حق تعالیٰ سے

---

[1] [illegible]

مانگے گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔

[1] دعا صرف امور غیر اختیاریہ کے ساتھ خاص نہیں، جیسا کہ عام خیال ہے کہ جو امر اپنے اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں۔ ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے۔ بلکہ امور اختیاریہ میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے۔ اصل کام تو مشیت حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ اسباب و علامات محض اظہار کی نسبتی و دیگر حکمتوں کے لیے مقرر فرمائے گئے ہیں۔ ؎

این سبب ہا در نظر پردہ ہاست ۔ ۔ ورنہ حقیقت فاعل ہر شے خداست

ضرورت دعا

کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کو صلاح و فلاح کی ضرورت نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دارین کی صلاح و فلاح کے واسطے سب ہی اسباب موضوع فرمائے کہ اہل حاجت ان سے مدد لیں اور عقبات و مہالک سے نجات پائیں۔ ان اسباب میں سے بجز دعا کے جتنے اسباب ہیں ان کے مسببات خاص خاص امور ہیں۔ چنانچہ اسباب طبعیہ کا (مثل زراعت و تجارت و صناعت کے) اصلی مقصود فلاح دنیوی بنایا گیا ہے گو بواسطہ صحیح نیت دینی بھی ہو اور اسباب شرعیہ کا (مثل صوم و صلوٰۃ و حج کے) مقصود بالذات فلاح دینی ٹھہرایا گیا ہے گو بالعرض نافع دنیا بھی ہو۔ مگر صرف دعا ایک ایسی چیز ہے کہ فلاح دین و فلاح دنیا دونوں کے لیے بلا واسطہ ایک مرتبہ میں مشروع و موضوع ہے جیسا ہے۔ پس اس جامعیت سے اس کی وقعت و عظمت ظاہر ہے اسی لیے قرآن مجید و حدیث میں نہایت درجہ اس کی ترغیب و فضیلت و تاکید جا بجا وارد ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جس شخص کو دعا کی توفیق ہو گئی اس کے لیے قبولیت کے دروازے کھل گئے۔ ایک روایت میں ہے۔ جنت کے دروازے کھل گئے۔

اور ارشاد فرمایا کہ قضا کو صرف دعا ہٹا دیتی ہے۔ احتیاط و تدبیر سے نہیں ٹلتی۔ اور

---

[1] برکات الدعا، صفحہ ۲۰۔ [2] دیباچہ مناجات مقبول طبع دیوبند۔

دعا نازل شدہ بلا سے بھی نافع ہے اور اس بلا سے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور کبھی جو نازل ہوتی ہے اور مصیبت دعا سے بھڑ کر اس سے کشتی ہے اور دونوں میں قیامت تک کشتی ہوتی رہتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ نزول مصیبت بھی دعا کو دافع ہے۔ اس کی برکت سے مصیبت نہیں آتی اور کبھی اس کی وجہ سے مصیبت ٹل جاتی ہے۔

اور ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے زیادہ کوئی چیز قدر و منزلت کی نہیں اور جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ سختیوں کے وقت اس کی دعا قبول فرمایا کریں اسکو چاہیئے کہ خوشی اور آسائش کے وقت کثرت سے دعا مانگا کرے۔

اور ارشاد فرمایا کہ دعا مسلمان کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمان کا نور ہے۔

دعا کی خاصیت ہے کہ اس سے تدبیر ضعیف بھی قوی ہو جاتی ہے۔

دعا کرنے سے بندہ کو حق تعالیٰ سے خاص تعلق ہو جاتا ہے جس وقت آپ دعا کرتا ہے اس وقت غور کر کے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق محسوس ہوگا بغیر اس کے خاص تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف ہوائی ہوتا ہے۔

دعا میں ایک نفع یہ ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے یہاں معذور سمجھا جائیگا۔ کیونکہ جب اس سے سوال ہوگا کہ تم نے حق کا اتباع کیوں نہیں کیا تو یہ کہہ دے گا کہ میں نے طلب حق کیلئے بہت سعی کی اور اللہ تعالیٰ تو ایک ہی تھے میں نے ان سے بھی عرض کر دیا تھا کہ مجھ پر حق واضح ہو جاوے۔

بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا و زاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے بغیر کسی ظاہری سبب کے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔

---

[1] الفضل عیسیٰ صفحہ ۱۱۱ [2] کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۵

قبولیتِ دعا اور اس کا طریق کار

احادیث[۱] شریف میں دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عقلاً بھی یہ سب سے بڑی
چیز ہے اور یہ ہر تدبیر سے بڑھ کر تدبیر ہے بلکہ حقیقت میں اس کا درجہ تدبیر سے بڑھ کر
ہے اس کو تقدیر سے زیادہ قرب ہے کیونکہ اس میں اس ذات سے درخواست ہے جس
کے قبضہ میں تقدیر ہے۔ سب تدبیریں کرتے ہیں مگر دعا نہیں کرتے بجز اس کے کہ دو چار دعائیں
یاد کر لی ہیں۔ نماز کے بعد آموختہ کے طور پر ان کو پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیر لیتے ہیں (نہ خشوع ہے
نہ خضوع ہے) یہ تو عملی غلطی ہے اور دوسری علمی غلطی یہ ہے کہ دعا کے قبول نہ ہونے سے
شیطان یہ دھوکا دیتا ہے کہ یہ تدبیر تو سب تدبیروں سے کمتر ہے۔ دیکھو اتنا عرصہ دعا
کرتے ہو گیا قبول ہی نہ ہوئی۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی ایسا
مسلمان نہیں جو دعا میں اٹھائے اور پھر عطا نہ ہو۔ خواہ سر دست اس کو دیدیں یا آئندہ کے
لیے جمع کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا قبول ضرور ہوتی ہے مگر صورتیں اس کی مختلف ہیں کبھی تو
وہی مل جاتا ہے جو مانگا تھا اور کبھی اس سے افضل چیز عطا ہوتی ہے اور کبھی دنیا میں کچھ عطا
نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجر آخرت میں جمع کر کے اس کو دیا جائے گا۔ اس وقت ثواب دیکھ کر تمنا
کریں گے کہ کاش! ہماری سب دعائیں آخرت ہی کے لیے ذخیرہ رہتیں۔ دنیا میں ایک بھی
نہ ملتی۔ پس یقین کر لینا چاہئے کہ ہماری سب دعائیں بالمعنی الاعم قبول ہی ہوتی ہیں کیونکہ
اللہ تعالیٰ ہر چیز کی مصلحت کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ پس اس بات کو بھی وہی خوب
جانتے ہیں کہ یہ نعمت موجودہ (جس کی تم درخواست کر رہے ہو) تمہارے مناسب ہے
یا نہیں اور مناسب ہے تو کس وقت اور کس حالت میں مناسب ہے۔ جیسے اگر کوئی
طبیب سے درخواست کرے کہ میرا علاج مسہل سے کر دیجئے تو اصل منظوری تو علاج
کا شروع کر دینا ہے گو مسہل نہ دے اور دوسری منظوری مسہل دینا ہے اس کے بعد پھر

---

۱ [illegible] ۔ ۲ [illegible] ۔ ۳ [illegible]
۴ [illegible]

سے دعا مستجاب ہی سمجھے لیس، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ، کہ ہم ہر دعا کرنے والے کی درخواست کو لے لیتے ہیں اور اس پر توجہ
کرتے ہیں بے توجہی نہیں کی جاتی تو جب درخواست لے لی گئی تو اگر اس کا پورا کرنا ہماری
مصلحت کے خلاف نہ ہوا تو وہ پوری ہوگی ورنہ اس کی جگہ کچھ اور مل جائے گا۔ سو یہ تو یقینی
کامیابی ہے لیس اجابت جس کا وعدہ ہے اس کے معنی درخواست کا لے لینا اور اس پر توجہ
کرنا ہے۔ یہ اجابت یقینی ہے اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ آگے دوسرا درجہ ہے کہ جو مانگا
وہی مل جاوے۔ اس کا وعدہ نہیں (اگرچہ ممکن ہے)۔

احادیث میں دعا کے لیے مندرجہ ذیل آداب کی تعلیم فرمائی گئی ہے جن کو ملحوظ رکھ
کر دعا کرنا باشبہ کلید کامیابی ہے اور جن کی رعایت کے بعد دعا مقبول نہ ہونا عادۃ اللہ
کے خلاف ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی وقت ان تمام یا بعض آداب کو جمع نہ کر سکے تو یہ نہیں
چاہیے کہ دعا ہی چھوڑ دے بلکہ دعا ہر حال میں مفید ہی مفید ہے اور ہر حال میں حق تعالیٰ
سے قبول کی امید ہے۔

باوضو ہونا۔ قبلہ رخ ہونا۔ دو زانو بیٹھنا۔ دعا کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا۔ اخلاص،
ادب اور تواضع کے ساتھ دعا کرنا۔ دعا کے اول و آخر حمد و ثنا اور درود شریف پڑھنا۔
اسمائے حسنیٰ سے پکارنا۔ اپنی محتاجی اور عاجزی کو ذکر کرنا۔ دعا کے وقت انبیاء علیہم السلام
اور دوسرے مقبول بندوں کے ساتھ توسل کرنا یعنی یہ کہنا کہ یا اللہ ان بزرگوں کے طفیل
سے میری دعا قبول فرما۔ ان دعاؤں کے ساتھ دعا کرنا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
منقول ہیں۔ رغبت و شوق اور عزم کے ساتھ دعا کرنا یعنی یوں نہ کہے کہ یا اللہ اگر تو چاہے
تو میرا کام پورا کر دے بلکہ قبولِ دعا کی امید قوی رکھے۔ کسی ناجائز چیز، گناہ اور محال چیز
کی دعا نہ کرے۔ اپنی سب حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرے اور مخلوق پر بھروسہ
نہ کرے۔ دعا کے آخر میں آمین کہنا۔ دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرنا۔ مقبولیتِ دعا کی

له ان کا ... مشکوٰۃ، مناجات مقبول مطبوعہ دیوبند۔

جلدی نہ کرے۔ یعنی یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی تھی اب تک قبول نہیں ہوئی۔

اعتدال اصل طریقہ نبویؐ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت فرمائی ہے کہ نہ دعا کے بھروسہ اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا منہمک ہو کہ مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے۔

معمولی چیز بھی خدا ہی سے مانگیں اور یہ نہ سمجھیں کہ چھوٹی چیز مانگنے سے حق تعالیٰ ناخوش ہوں گے کیونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہر بڑی چیز چھوٹی ہی ہے۔ اللہ کے نزدیک عرش اور نمک کی ڈلی برابر ہے۔

دعا میں اگر دل نہ لگتا ہو تو اس طرح سمجھا دیں کہ دنیا میں نفع موہوم پر بھی ہمت سے کام لیتے ہیں۔ گو آخر میں خسارہ بھی ہو جاوے اور خسارہ کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے تجارت وغیرہ میں احتمال ہے اور دعا میں خسارہ کا احتمال ہی نہیں۔ پھر اس میں کوتاہی کیوں کی جاتی ہے۔

طریق تحصیل — اپنی احتیاجوں اور اللہ تعالیٰ کی عنایات کو سوچنا اور اس پر غور کرنا طریق تحصیل ہے۔

پندرھویں فصل رجا کا بیان[۱]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ — اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لو یعلم الکافر ما عند اللہ من الرحمۃ ما قنط من — اگر کافر بھی اللہ کی رحمت کا حال جانے تو اس کی جنت سے ناامید نہ ہو۔

---

[۱] نعیم الدین

جنت ہم احمدؒ۔ متفق علیہ۔

رجا کی حقیقت — محبوب چیزوں یعنی فضل و مغفرت اور نعمت و جنت کے انتظار میں قلب کو راحت پیدا ہونا اور ان چیزوں کے حاصل کرنے کی تدبیر اور کوشش کرنا (رجا ہے) سو جو شخص رحمت و جنت کا منتظر رہے اور اس کے حاصل کرنے کے اسباب یعنی عمل صالح و توبہ وغیرہ کو اختیار نہ کرے اس کو مقام رجا حاصل نہیں۔ وہ دھوکے میں ہے جیسے کوئی شخص تخم پاشی نہ کرے اور غلہ پیدا ہونے کا منتظر رہے وہ صرف ہوس خام ہے۔

رجا کے درجات — (جیسے[1] خوف کی حقیقت اور درجات ہیں۔ اس کے مقابلہ میں) رجا کے بھی درجات ہیں۔ ایک شرط ایمان یعنی احتمال نجات۔ اور ایک درجہ فرض ہے اور ایک درجہ مستحب ہے۔ ایک درجہ رجا میں بھی ایسا ہے جو اختیار سے خارج ہے مکتسب نہیں۔ بلکہ محض وہب سے عطا ہوتا ہے (جو مطلوب نہیں تفصیل کے لیے خوف کی حقیقت ملاحظہ ہو)۔

طریق تحصیل — اللہ[2] تعالیٰ کی وسعت رحمت اور عنایت کو یاد کرتے رہنا۔ اور سوچتے رہنا (طریق تحصیل ہے)۔

سولھویں[3] فصل۔ رضا کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

---

[1] اشرف السوانح صفحہ ۔ [2] تعلیم الدین صفحہ ۔ [3] تعلیم الدین صفحہ و انفاس عیسیٰ صفحہ

من سعادة ابن آدم رضاه بما — آدمی کی سعادت ہے یہ راضی رہنا اس پر

قضی اللہ لہ۔ رواہ الترمذی واحمد — جو اس کیلئے اللہ نے تجویز کر دیا ہو۔

رضا کی حقیقت

رضا کی حقیقت، ترک الاعتراض علی القضاء (یعنی) قضا پر اعتراض نہ کرنا ہے۔ نہ زبان سے نہ دل سے بعض اوقات اس کا یہاں تک غلبہ ہوتا ہے کہ تکلیف بھی محسوس نہیں ہوتی ہے پس اگر الم کا احساس ہی نہ ہو تو رضا طبعی ہے۔ اور اگر الم کا احساس باقی رہے تو رضا عقلی ہے اول حال ہے جس کا عبد مکلف نہیں اور ثانی مقام ہے جس کا عبد مکلف ہے۔

قضا پر راضی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف تو محسوس ہوگی مگر چونکہ حق نے اس کے بہتر انجام یعنی ملنے والے ثواب پر مطلع کر دیا ہے اس لیے طبیعت اس تکلیف کو بخوشی گوارا کرتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لیے تلخ دوا بتائے یا اپریشن کرانے یا فصد کھلوانے کی ہدایت کرے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس تلخ دوا کا پینا (اپریشن کرانا) اور فصد کھلوانا تکلیف کی باتیں ہیں مگر چونکہ اس کے ساتھ ہی عمدہ نتیجہ یعنی صحت و تندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے لہٰذا وہ ان تکلیف دہ باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی بلکہ اس کا احسان مند ممنون رہتا ہے اسی طرح جو شخص سچے دل سے اس کا یقین کیے ہوئے ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف پر حق تعالیٰ کی طرف سے اجر مرحمت ہوگا اور ہر مصیبت و صدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہوگا جس کے مقابلہ میں اس عارضی تکلیف کی کچھ حقیقت نہیں ہے تو وہ ضرور مسرور اور شاداں ہوگا۔

جس[2] وقت مولائے حقیقی سے جو عطا ہوتا ہے اس وقت کے وہی مناسب ہوتا ہے۔ اس کے خلاف کی تمنا نہ چاہیئے۔ جب حق تعالیٰ (بظاہر) حالت نقصانات ہی کو بہتر سمجھ رہے ہیں تو ہم کو اس میں صدمہ کی کونسی بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ

---

[1] تبلیغ دین صفحہ ۲۰۔ [2] کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۴۳، ۱۲۰

نے جیسا بنادیا ہے اسی کیلئے وہی مناسب تھا۔ گو ہر شخص دوسرے کو دیکھ کر یہ تمنا کرتا ہے کہ میں ویسا ہوتا اور اپنی حالت پر قناعت نہیں ہوتی لیکن غور کر کے دیکھے اور سوچے تو اس کو معلوم ہوگا کہ میرے لیے مناسب وہی حالت ہے جس میں خدا نے مجھ کو رکھا ہے (البتہ دعا کرنا خلاف رضا نہیں۔ اہل اللہ محض حکم کی وجہ سے اظہار عبدیت کے لیے دعا کرتے ہیں اس واسطے دعا نہیں کرتے کہ جو ہم نے مانگا ہے وہی مل جائے بلکہ ہر حال میں خدا کی رضا پر راضی رہتے ہیں خواہ قبول ہو یا نہ ہو (قبول نہ ہونے سے شاکی اور تنگدل نہیں ہوتے۔ یہی رضا کی علامت ہے دعا کی حقیقت دعا کے بیان میں ملاحظہ ہو اور اگر اس موقع پر صبر کا بیان بھی دیکھ لیا جائے تو مفید ہوگا۔)

طریق تحصیل | یہ آثار محبت میں سے ہے۔ اس کی تحصیل کا جداگانہ طریق نہیں وہ حصول محبت کے ساتھ ہی رضا بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

سترھویں فصل۔ زہد کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا	تاکہ فوت شدہ چیز پر افسوس نہ کرو
فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا	اور جو تم کو دیا ہے اس پر خوشی سے اترا
اٰتٰكُمْ۔ الآیۃ	نہ جاؤ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

اول صلاح هذه الامة اليقين	اول بہتری اس امت کی یقین اور زہد
والزهد و اول فسادها	ہے اور اول بگاڑ اس امت کا بخل اور
البخل والامل رواہ البیہقی	طول امل ہے۔

له انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۲۱ ۔ ۲ے تعلیم الدین صفحہ ۔ ۳ے تعلیم الدین صفحہ ۴۵

[illegible] (۶) [illegible]

زہد کی حقیقت

کسی رغبت کی چیز کو چھوڑ کر اس سے بہتر چیز کی طرف مائل ہونا مثلاً دنیا کی رغبت علیحدہ کر کے آخرت کی رغبت کرنا زہد ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے[1] کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زہد فی الدنیا یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو حرام کر لیا جائے اور نہ یہ ہے کہ مال کو ضائع کر دیا جائے۔ لیکن زہد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے قبضہ میں جو چیز ہے اس پر تمہارا اعتماد و وثوق بہ نسبت اس چیز کے زیادہ ہو جو کہ خود اپنے قبضہ میں ہے اور زہد یہ ہے کہ تم پر جب کوئی مصیبت آ جائے تو تم کو اس کے ثواب کی زیادہ رغبت ہو بہ نسبت اس کے کہ مصیبت باقی رہے (ترمذی شریف)۔

اس حدیث میں زہد کی حقیقت کی تصریح ہے جو کہ اخلاق باطنہ میں سے ہونے کے سبب علامات میں سے نہیں ہے اور اس میں بڑی غلطی رفع کر دی گئی ہے۔ اکثر عوام اپنے اعتقاد میں زاہد اسی کو سمجھتے ہیں جو تمام لذات مباحہ سے اس طرح مجتنب ہو جیسے ان کو حرام سمجھتا ہو اور اس کے پاس جو کچھ آتا ہو سب کو فوراً خرچ کر ڈالے گو غیر مصرف ہی میں کیوں نہ ہو۔ اور ہر بلا و مصیبت کے رفع کی تدبیر نہ کرتا ہو بس ان کے نزدیک بزرگی کی شرط یہی ہے اس حدیث میں بتلا دیا گیا ہے کہ یہ امور شرط نہیں بلکہ اپنے مقدور سے زیادہ حق تعالیٰ پر اعتقاد ہونا اور مصیبت گو خود مرغوب فیہ نہ ہو مگر ثواب مرغوب فیہ ہونا یہ ضروری ہے پس مصیبت پر خوش اس لیے ہے کہ وہ ثواب کا سبب ہے اور آیت سے استدلال تمام ہے۔

زہد کی اصل وہ مخصوص علم ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سینہ کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کا ساز و سامان

---

[1] [illegible]

مکھی کے پر سے بھی زیادہ حقیر و ما آخرت ہی بہتر و پائدار ہے جس وقت یہ نور حاصل ہو جاتا ہے تو اس حقیر دنیا کی آخرت کے مقابلہ میں اتنی بھی وقعت نہیں رہتی جتنی کسی بیش قیمت جوہر کے مقابلہ میں پھٹے پرانے چیتھڑا کی ہوا کرتی ہے اور زہد کا ثمرہ یہ ہے کہ بقدر ضرورت وکفایت دنیا پر قناعت حاصل ہو جائے پس زاہد اتنی مقدار پر کفایت کیا کرتا ہے جتنا کسی مسافر کو سفر کا توشہ اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

زہد کے کئی درجے ہیں، ایک تو یہ کہ نفس اگرچہ دنیا کی طرف مائل ہو مگر جبراً اسے استقامت بنایا جائے اور دنیا حاصل کرنے سے زبردستی روکا جائے، اس حالت کو زہد کہنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ نفس دنیا سے اتنا متنفر ہو کہ اس کی طرف مائل ہی نہ ہو اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ دنیا کے مال و متاع کا عدم اور وجود برابر ہو جائے پس اگر مل جائے تو کچھ مسرت نہیں اور اگر نہ ملے یا آیا ہوا ہاتھ سے چلا جائے تو کچھ حسرت نہیں اس درجہ میں نفس نہ تو دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے متنفر ہوتا ہے اور یہی زہد کے کمال کا درجہ ہے۔

حاصل کلام یہ کہ زہد[1] ترک لذات کا نام نہیں بلکہ محض تقلیل لذات، زہد کے لیے کافی ہے یعنی لذات میں انہماک نہ ہو نفیس نفیس کھانوں، کپڑوں کی فکر میں رہنا یہ زہد کے منافی ہے ورنہ بلا تکلف و بلا اہتمام خاص کچھ لذات میسر ہو جائیں تو حق تعالیٰ کی نعمت ہے شکر کرنا چاہیے نفس کو خوب آرام میں رکھے لیکن اس سے کام بھی لے۔ سعدی

کہ مزدور خوشدل کند کار بیش

حقیقت یہ ہے کہ جس کی نظر اللہ اور ما عند اللہ پر ہے اس کی نظر میں سونا اور چاندی تو کیا دنیا و ما فیہا بھی کچھ نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے جگر گوشوں اور خاص لوگوں کے لیے دنیا کو پسند نہیں کیا (لہذا) مخلوق کے ہاتھ میں جو کچھ ہے متاع دنیا ہے۔ سب سے امید قطع کر دی جائے جو شخص ایسا کرے گا اس کا قلب راحت میں رہیگا

[illegible]

کیونکہ زہد، قلب اور بدن دونوں کو راحت دیتا ہے۔

طریق تحصیل | دنیا کے عیوب[۱] اور مضرتوں اور فنا ہونے کو اور آخرت کے منافع اور بقا کو یاد کرنا اور سوچنا (طریق تحصیل ہے)

اٹھارھویں فصل شکر کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے

واشکروا لی ولا ۔۔۔ [۲] اور میرا شکر کرو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ان اصابتہ سراء شکر ۔۔۔ اگر اس کو خوشی پہنچی، شکر کیا۔

(رواہ مسلم)

شکر کی حقیقت | نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے سمجھنا اور اس سمجھنے سے دو باتیں ضرور پیدا ہوتی ہیں، ایک منعم سے خوش ہونا اور دوسری اس کی خدمت گذاری اور امتثال اوامر میں سرگرمی کرنا (یعنی) جو حالت[۳] طبیعت کے موافق ہو خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری ہو۔ اس حالت کو دل سے خداوند کریم کی نعمت سمجھنا اور اس پر خوش ہونا اور اپنی لیاقت سے اس کو زیادہ سمجھنا اور زبان سے خداوند کریم کی تعریف کرنا اور اس نعمت کا جوارح یعنی اعضاء وغیرہ سے گناہوں میں استعمال نہ کرنا بلکہ اس نعمت[۴] کو اس کی رضامندی میں استعمال کرنا شکر ہے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ مخلوق کی پیدائش کے اغراض و مقاصد اور یہ بات معلوم ہو جائے کہ کیا چیز کس کس کام کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً

۱۔ تفسیر ۔۔۔ ۲۔ تفسیر ابن ۔۔۔ ۳۔ ۔۔۔ ۴۔ ۔۔۔

اپنا کمال نہ سمجھے۔ تو غافل اور ناشکری (جھوٹے والا) نہ ہو لو نعمت میں مشغول ہو کر رب نعمت کو نہ بھولے۔ بلکہ یہ نعمت اس کے لیے زیادہ موجب تذکر ہو جا رہے۔ یہ نعمت عام ہے خواہ کھانا ہو یا پانی ہو یا لڑکی کپڑا ہو یا یہ کہ کوئی ناگوار حالت نہ ہو۔

حالات کی دو قسمیں ہیں گوارا اور ناگوار۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اختیاری و غیر اختیاری۔ یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے جن میں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں۔ اور مومن اگر ان کے حقوق ادا کرتا رہے تو اس کو نعم البدل ملتا ہے۔ اس لیے مومن کسی حالت میں نقصان میں نہیں بلکہ ہر حالت میں نفع میں ہے اسی لیے حدیث شریف میں ہے:

ان اصابته سراء شكر و — اگر اس کو راحت پہنچتی ہے شکر کرتا ہے اور
ان اصابته ضراء صبر — اگر مصیبت پہنچتی ہے صبر کرتا ہے پس اس
فكان خيرا له — کے لیے بہتر ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شکر میں بھی اجر ہے اور صبر میں بھی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امور غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو اختیاراً اس وقت مومن سے صادر ہوتے ہیں یعنی راحت میں شکر کرنا اور وہ ایک عمل ہے جو اس نے حق تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا ہے اس کے عوض اجر ملتا ہے اور مصیبت میں صبر کرنا بھی ایک عمل ہے جس پر اجر ملتا ہے اور پس دونوں صورتوں میں نعم البدل اسی عمل پر ملا جو اختیاری ہے پس جس طرح اعیان کے اعطاء یا منع کے عوض میں انسان کے اوپر کچھ حقوق ہیں یعنی شکر و صبر مثلاً حق تعالیٰ بندہ کو نعمت مال عطا فرمائیں یا نعمت اولاد یا کوئی دوسری نعمت تو اس کے عوض میں اس کے اوپر شکر واجب ہے یا اس سے مال و اولاد کو لے لیں تو اس پر صبر واجب ہے اسی طرح اعراض و اعمال پر بھی یہ حقوق ہیں مثلاً نماز روزہ وغیرہ کی توفیق عطا فرمائیں یا ذکر میں انوار و علوم عطا فرمائیں تو اس پر شکر لازم ہے اور اگر ذکر میں انوار نہ

لہ الجبر بالصبر صلہ

کیفیات سلب ہوجائیں تو اس پر صبر لازم ہے اور یہاں خود اعمال پر بھی اجر ملتا ہے اور ان کا شکر ادا کرنے پر بھی اجر ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا[1]:-

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔ ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جبکہ تمہارے رب نے تم کو اطلاع فرمادی کہ اگر (میری نعمتوں کا) تم شکر کروگے تو تم کو خواہ دنیا میں بھی یا آخرت میں تو ضرور زیادہ نعمت دوں گا اور اگر تم (ان نعمتوں کی) ناشکری کروگے تو یہ سمجھ رکھو کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے (یعنی ناشکری میں اس کا احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب میں مبتلا فرماویں لہٰذا لازم ہے کہ ہر حالت میں شکر گزار رہیں نیز اس لیے بھی کہ شکر سے محبت پیدا ہوتی اور محبت سے قرب حق کا تعلق ہوتا ہے جو کہ مقصود اصلی ہے)۔

طریق تحصیل حق تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچنا، یاد کرنا اور ہر نعمت کو اس کی طرف سے جاننا اس سے رفتہ رفتہ حق تعالیٰ کی محبت ہوگی اور شکر کا درجہ کاملہ نصیب ہو جاوے گا۔

انیسویں فصل شوق کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا[2]:-

مَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ اللَّهِ فَإِنَّ أَجَلَ اللَّهِ لَآتٍ۔ الآیہ — جو شخص اللہ سے ملنے کی امید رکھتا ہو تو اللہ کی وہ معین (یعنی موت) تو آنے والی ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[3]:-

وأسئلك النظر الى وجهك — ترجمہ: مجھ سے تیرے چہرہ مبارک کی زیارت اور

---

[1] بیان القرآن ص ۔ [2] اکمال الشیم ص ۔ [3] تعلیم الدین ص ۔ [4] تعلیم الدین ص ۔

رہنا اور صبر فی العمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا ، طاعات بجالانے کے وقت ان کے حقوق و آداب کو سکون و اطمینان سے ادا کرنا اور جمعیت متوجہ ہو کر کام کو بجالانا ، مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوتے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ تم اتنی دیر تک سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے پھر دوسری کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے ۔ اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو ان باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے روکنا اور شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے روکنا (اس کے علاوہ ہر ممنوع امر سے رکنے کو صبر ہی کہا جاتا ہے مثلاً صبر عن الشہوات یعنی شہوت رجال و نساء و شہوت لباس و شہوت طعام و شہوت کلام (وغیرہ) بھی داخل ہے اسی طرح تمام معاصی سے نفس کو روکنا یہی صبر کی داخل ہے ۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں :-

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ	وہ صبر کرنے والے ہیں باسآء میں اور
وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ	ضراء میں اور (جنگ کے وقت ۔

الْبَاْسِ ؕ

باسآء سے مراد فقر و تنگدستی ہے ۔ حاصل یہ ہے کہ فقر و تنگدستی میں صبر کرے یعنی خدا پر نظر رکھے مخلوق کے مال و دولت پر نظر نہ کرے نہ ان سے توقع رکھے اس میں قناعت و توکل کی تعلیم ہو گئی اور ضراء سے مراد مطلق بیماری خواہ ظاہری ہو یا باطنی ۔ ظاہری بیماری میں صبر یہ ہے کہ لوگوں سے شکایت نہ کرتا پھرے ۔ خدا سے دل میں کدر نہ ہو اس میں تسلیم و رضا کی تعلیم ہو گئی اور باطنی بیماریوں میں صبر یہ ہے کہ امراض قلبیہ کے مقتضٰی پر عمل نہ کرے بلکہ ان کا مقابلہ کرے اور باس سے مراد مطلق شدت و پریشانی ہو گی وہ جو اس پر مستقل مزاج رہے جس کا ایک فرد صبر عند الحرب بھی ہے کہ جہاد کے وقت لڑائی میں ثابت قدم رہے ۔ پس اب صبر کا حاصل یہ ہو گا کہ موحد کامل بن جائے ۔ جب مقام صبر کامل ہو جاتا ہے تو توحید بھی کامل ہو جاتی ہے پس یہ ایسا جامع مقام ہے

بھی۔ مصیبت میں تو صبر یہ ہے کہ جزع فزع نہ کرے اور عبادت میں صبر یہ ہے کہ باوجود
ناگواری کے نفس کو اس پر جمانا اور ناگواری کی پرواہ نہ کرنا۔ چنانچہ دونوں کی نسبت
ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا　　اے ایمان والو خود صبر کرو، مقابلہ میں
وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا۔ الآیۃ　　صبر کرو اور مقابلہ کیلئے مستعد رہو۔

"اصبروا" تو مصائب میں صبر کرو۔ اور "صابروا" دوسروں کو صبر کی تعلیم دینا، اور
"رابطوا" عبادات کے اندر جمے رہنا۔ چنانچہ رباط کی تفسیر حدیث میں یہ آئی ہے کہ ایک
نماز پڑھ کر دوسری کے انتظار میں بیٹھے رہنا اور یہی مفہوم صبر کا بھی ہے کہ معصیت میں
اس کا نام صبر ہو اور عبادت میں اسی کو رباط سے تعبیر فرمایا اور صرف عبادت کے
متعلق ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا　　اے ایمان والو صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ الآیۃ　　مدد چاہو۔

یہاں دونوں (صبر اور نماز) کا جمع کر کے بیان کرنا قرینہ اس کا ہے کہ صبر و صلوٰۃ کا مجموعہ
ایک ہی چیز ہے یعنی صبر علی الصلوٰۃ (نماز پر صبر کرنا) اور یہ اسی قید سے محکوم علیہ ہے۔
"وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ" کا [illegible] یعنی صلوٰۃ میں کوئی گرانی نہیں اور اس مضمون پر حدیث اسباغ
الوضوء علی المکارہ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کی
علامت وضو کو باوجود ناگوار ہونے کے کامل کرنا ہے یعنی جاڑے کے دنوں میں۔ سردی
شدت ہو رہی ہے۔ جی نہیں چاہتا مگر اس حالت میں بھی وضو کو پورا پورا کیا۔ حدیث شریف
میں مکارہ کا لفظ ہے جس سے ناگواری کا عموم صاف معلوم ہوتا ہے۔

(اب یہ سوال رہ گیا کہ صبر پر جو وعدہ ثواب کا ہے وہ کس صورت میں ہے یعنی
کوئی شخص کسی سے انتقام لینے یا تکلیف کے دور کرنے پر قادر ہے اور نہ کرے بلکہ صبر

۔ سعادت شریفہ صفحہ ۹۵

کہ رب اجر ملے گویا اگر قادر ہی نہ ہو، پھر صبر کرے، دس پر اجر ملے گا؟

(جواب یہ ہے کہ) بے صبری کی متعدد صورتیں ہیں (۱) انتقام، قتل لینا، اس کا ترک کرنا صبر ہے۔ یہ قدرت کے ساتھ مشروط ہے (۲) زبان سے بُرا بھلا کہنا، سامنے یا پس پشت بد دعا دینا اور اس پر غیر قادر علی الانتقام بھی قدرت رکھتا ہے اس لیے اس کا ترک صبر ہے اسی طرح اہل میت کو مدافعت پر تو قدرت نہیں لیکن نوحہ و شکایت پر تو قادر ہیں۔ لہٰذا ان کے حق میں اس کا ارتکاب بے صبری اور اس سے رکنا صبر ہے اور جو کسی فعل پر کچھ قادر نہ ہو جیسے اندھا کہ دیکھنے پر بالکل قادر نہیں لیکن تصور یا عزم بصورت ابصار یا تمنائے ابصار للابصار (یعنی کسی ناجائز امر کو دیکھنے کے لیے ارادہ کرنا کہ اگر نظر ہوتی تو دیکھتا یا دیکھنے کے لیے نظر کی خواہش کرنے) پر تو قادر ہے لہٰذا اس کی بے صبری یہی ہے اور اس کا ترک صبر ہے۔ ان سب صورتوں میں ہر شخص کو اس کے مناسب صبر پر اجر ملتا ہے۔

تفصیل و بالا تو اجر صبر میں ہے اور ایک اجر خود تکلیف پر بھی ہوتا ہے اس میں صبر کی قید نہیں۔ اگر صبر کیا تو دو اجر ملیں گے ایک صبر کا اور دوسرے تکلیف کا اور اگر صبر نہ کیا تو تکلیف کا اجر ملے گا اور بے صبری کا گناہ ہوگا۔

ضرورت صبر

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ [1]

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اے ایمان والو! (مصیبتوں میں تم جا کر صبر کے بارے میں) صبر اور نماز سے سہارا (امداد) حاصل کرو۔ بے شک حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

اس آیت میں صبر کی (ضرورت اور اس کی) فضیلت بیان ہوئی ہے کہ حق تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ایک یہ کہ معیت سے اعانت و مدد

---

[1] بیان القرآن ص۸۹ ج ۱ [2] الصبر والصلوٰۃ ص۴۳

کی معیت مراد ہو یعنی تم صبر کرکے دیکھو۔ دشوار نہ رہیگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی اور اس کی مدد کے بعد کوئی دشوار، دشوار نہیں۔ دوسرے یہ کہ معیت سے خاصہ مراد ہو پس مطلب یہ ہوگا کہ صبر کی دشواری کو اس مراقبہ سے آسان کرلو کہ اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہیں۔ اس مراقبہ کے بعد صبر میں دشواری کا شائبہ بھی نہ رہیگا۔[1] فرمایا: وَلِیَبْتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَلِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ اس کا حاصل یہ ہے کہ نفس ایمان کی آزمائش کی جاتی ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے یا نہیں اور معصیت کے ذریعہ سے ایمان کو میل کچیل سے صاف کیا جاتا ہے یعنی مصیبت کے ذریعہ سے رذائل و معاصی کا میل دھو دیا جاتا ہے اور دعویٰ اور غرور و تکبر کم ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقت منکشف ہو کر سمجھ آجاتی ہے۔

استحضار عظمت حق ہوتا ہے۔ پس انسان پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے۔

[2] مصائب سے بہت سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے بعض دفعہ حق تعالیٰ اپنے بندہ کو خاص درجہ اور مرتبہ عطا فرمانا چاہتے ہیں جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہیں کرسکتا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی مصیبت یا مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ اس درجہ عالیہ کو پالیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت میں اہل مصائب کو دیکھ کر اہل نعم کہیں گے۔ یالیت جلودنا قرضت بالمقاریض فنعطی مثل ما اوتوا یعنی "کاش ہماری کھالیں دنیا میں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں تاکہ آج ہم کو بھی یہ درجات ملتے" (جو اہل مصائب کو عطا کیے گئے ہیں)۔

[3] حدیث شریف میں ہے جو شخص اپنا انتقام خود لے لیتا ہے تو حق تعالیٰ معاملہ کو اسی کے سپرد کر دیتے ہیں اور جو صبر کرتا ہے اس کی طرف سے حق تعالیٰ خود انتقام لیتے ہیں۔ کبھی دنیا میں سزا چکھا دیتے ہیں اور کبھی آخرت پر پوری سزا کو ملتوی رکھتے ہیں۔

---

[1] اشرف التفاسیر ۱۴۲/۱ ، [2] انفاس عیسیٰ ص ۲۳ ، [3] کمالات اشرفیہ ص

۲۱ اکیسویں فصل صدق کا بیان

صدق سے مراد یہاں خاص قسم کا صدق ہے یعنی مقامات میں سچا ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ	مومن تو وہی ہیں جو خدا اور اس کے
اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ	رسول پر ایمان لائے پھر کچھ تردد نہیں
لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا	کیا اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں
بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ	جہاد کیا یہی لوگ پورے سچے ہیں۔
سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ	
الصّٰدِقُوْنَ ۔	

اور حدیث شریف میں ہے۔

مر النبی صلی اللہ علیہ	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکرؓ
وسلم بابی بکرؓ وھو	پر گزر ہوا وہ اپنے غلام پر لعنت کر رہے
یلعن بعض رقیقہ فالتفت	تھے آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور
الیہ فقال لعانین وصدیقین	فرمایا کہ لعنت کرنے والے اور پھر صدیق۔ پھر
فاتی قول ابی بکر لا اعود ۔	حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ اب ایسا نہ کروں گا۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۔

حقیقتِ صدق | جس مقام کو حاصل کرے اس کی کمال تک پہنچا دے اس میں کسر نہ رہے (صدق کہلاتا ہے) اور اس کے معنی پختگی کے

۱؎ تعلیم الدین ، ۲؎ التکشف عن مہمات التصوف

ہیں اور اسی سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے کیونکہ وہ تمام احوال و افعال و اقوال میں مرتبۂ رسوخ حاصل کر چکا ہے۔ شریعت میں صدق عام ہے۔ افعال کو بھی، اقوال کو بھی، احوال کو بھی۔ اقوال کا صدق تو یہ ہے کہ بات سچی ہو یعنی واقع کے مطابق ہو۔ جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں۔ اور افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو۔ حکم شرعی کے خلاف نہ ہو۔ پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے اور احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہوں پس جو احوال خلاف سنت ہوں وہ احوال کاذبہ ہیں اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے موافق ہوتے ہیں، اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔ نیز صدق احوال کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے۔ یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہو گئی اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا۔ یہ مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہیئے کہ جو حالت طاری ہو۔ وہ مقام ہو جائے۔

محققین[1] نے حقیقت صدیقیت کی یہ بیان کی ہے کہ عقائد شرعیہ نظریہ کا اس کو ذوق اور ادراک ہونے لگے اور اعمال شرعیہ اس سے طبعًا صادر ہونے لگیں۔ پس نظریات اس کے نزدیک بدیہیات ہو جائیں اور عبادات، عادات ہو جاویں۔ اول ثمرہ ہے قوت قدسیہ کا۔ اور ثانی کمال خلق کا ثمرہ ہے اور صرف ثانی میں اکمل ہونا شہادت ہے۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

[2] یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ — اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

اس آیت میں اول تقویٰ کا امر ہے۔ متقی کے معنی کامل فی الدین و تقویٰ کے ہیں

۱؎ التکشف ص۲۰۳ ۲؎ الکمال فی الدین ص۲۰۴۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ	جو اللہ کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے
اللّٰہُ لِقَاءَہٗ وَمَنْ کَرِہَ لِقَاءَ	اللہ اس کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے۔
اللّٰہِ کَرِہَ اللّٰہُ لِقَاءَہٗ۔	اور جو اللہ کی ملاقات کو بُرا سمجھتا ہے اللہ اس
متفق علیہ	کی ملاقات کو بُرا سمجھتا ہے۔

حقیقت محبت

طبیعت کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس سے لذت حاصل ہو محبت کہتے ہیں یہی میلان اگر قوی ہو جاتا ہے اس کو عشق کہتے ہیں۔ محبت کا یہ درجہ طبعی ہے اور غیر مامور بہ ہے مگر نعمت ہے اور دائمی ہے پھر اس میلان کے آثار میں رضائے محبوب کو رضائے غیر پر ترجیح دینا ہے اور یہ محبت عقلی ہے درجہ فرض اور واجب ہے، پھر اسی ترجیح کے باعتبار محل ترجیح کے اقسام ہیں چنانچہ ایک قسم ایمان کو کفر پر ترجیح دینا ہے۔ اور یہ محبت کا اولیٰ درجہ ہے۔ بدون اس کے بندہ مومن نہیں ہے، اور دوسرے اقسام میں دوسرے احکام کو غیر احکام پر ترجیح دینا ہے اور احکام کے درجات کے اعتبار سے اس کے درجات ہیں۔ کوئی درجہ فرض واجب، کوئی اعلیٰ و مستحب۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :-

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ	اے محمدؐ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ
وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ	اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری
وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ	بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے اور وہ
تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ	تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا اندیشہ ہو اور وہ
تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ	گھر جن کو تم پسند کرتے ہو اگر یہ چیزیں تم کو اللہ
مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ	اور رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے
فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی	سے زیادہ پیاری ہوں۔ تو تم منتظر رہو۔

- کمالات اشرفیہ صفحہ ، بیان القرآن صفحہ ۱۰۰۔

اس کا حدوث و بقا بالکل غیر اختیاری ہے اور مزید اختیار کی پر بعض اوقات دوام نہیں ہوتا بخلاف محبت عقلی کے کہ اس کا حدوث و بقا اختیاری ہے تو اس پر دوام بھی ہوتا ہے اس لیے محبت عقلی افضل و راجح ہے۔ محبت طبعی کا منشا جوش طبیعت ہے اور جوش ہمیشہ نہیں رہا کرتا۔

محبت کے تین سبب ہوا کرتے ہیں یا تو یہ کہ کوئی ہم پر احسان کرتا ہے اور اس کے احسان کی وجہ سے ہمیں اس سے محبت ہو۔ یا یہ کہ وہ خود نہایت حسین و جمیل ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف میلان خاطر ہو۔ یا یہ کہ اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو۔ اور وہ کمال باعث محبت ہو۔ سو انعام و نوال، حسن و جمال اور فضل و کمال علی وجہ الکمال خدا تعالیٰ ہی میں پائے جاتے ہیں تو جب تک ان وجوہ کمالات باقی ہیں اس وقت تک محبت بھی رہے گی اور محبوب حقیقی کے کمالات ختم نہیں ہو سکتے تو ان کی محبت بھی ختم نہ ہوگی اور چونکہ خداوند کریم کے سوا کسی میں بھی بالذات کمالات نہیں اس لیے کاملین کو خدا تعالیٰ کے سوا کسی سے حب عقلی نہیں ہو سکتی۔ ہاں حب طبعی یعنی عشق غیر خدا سے بھی ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ کے ساتھ جس محبت کا امر ہے وہ حب عقلی ہے نہ کہ طبعی۔ اسی لیے نصوص میں حب طبعی عشق کا عنوان کہیں ذکر نہیں بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ حب طبعی مطلوب نہیں بلکہ حب عقلی مطلوب ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حب عقلی والوں یعنی کاملین میں حب طبعی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ غلبہ حب عقلی کو ہوتا ہے باقی جن پر حب عقلی کا غلبہ ہوتا ہے بعض اوقات ان میں محبت طبعیہ بھی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن پر محبت طبعیہ کا غلبہ ہے۔ مگر وہاں محبت طبعیہ پر حب عقلی غالب ہوتی ہے اس لیے جوش دبا رہتا ہے لیکن گاہے گاہے کاملین پر بھی حب طبعی کا غلبہ ہو جاتا ہے بہر حال کاملین تو حب طبعی و عقلی دونوں کے جامع ہوتے ہیں مگر ان میں غلبہ عقلی کو ہوتا ہے اور ناقصین

لہ شرح السنۃ ۔ ص ۔ مشکوٰۃ لہ تعبید والوعید ص ۔ ملخصاً ۔

اگر بھاپ ہونے کی صورت میں یہ لائن پر رہی تو مسافت اس تیزی سے قطع کرتی ہے
گی اور اگر لائن کو چھوڑ دی تو تہس نہس ہو جاوے گا۔ اس مثال میں گویا تین حالتیں ہوئیں
ایک یہ کہ بھاپ نہیں لیکن لائن پر ہے۔ اس صورت میں رفتار ضرور کم ہوگی لیکن خطر نہیں
دوسری صورت یہ ہے کہ بھاپ تو ہے لیکن لائن پر نہیں۔ یہ حالت نہایت خطرناک ہے۔
اور ایک حالت نور علیٰ نور ہے کہ بھاپ بھی ہو اور لائن پر بھی ہے (آں) رہا بھاپ محبت ہے
اور لائن صراط مستقیم شریعت کی ہے جس نے محبت تو پیدا کر لی لیکن اعمال شریعت کو
رخصت کر دیا تو وہ قطع طریق تو کیا کرتا الٹا اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا
اور جس نے محبت تو پیدا نہیں کی لیکن شریعت پر عمل کرتا رہا تو رفتار گو نہایت سست
ہوگی مگر کوئی خطرہ نہیں۔ عمل اور محبت کو جمع کر لو۔ یہ البتہ وہ ملیا ہوگی جس میں بھاپ بھی
ہے پہیے بھی درست ہیں اور لائن پر بھی ہے۔ پھر دیکھو کیسی جلدی مسافت قطع
ہوتی ہے۔

محبت کو جو کہا ہے کہ اصل چیز ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط محبت ہی کافی
ہے۔ عمل کی ضرورت نہیں بلکہ بھاپ (محبت) کے اصل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہی
پہیوں کی تیزی کا ذریعہ ہے لیکن اگر سرے سے پہیے ہی نہ ہوں تو نری بھاپ کیا کر سکتی
ہے ویسی ہی جس میں محض جوش و خروش ہو۔ اس میں سوائے اس کے کہ حق حق
اور الا اللہ کے نعرے لگا لے اور بھی کچھ ہے جو نفع کیا؟ یہ جوش و خروش تو ایسا ہے
جیسا اس ریل کا جس کے انجن میں آگ اور بھاپ بھی دیکھ رہی ہے مگر پہیے ٹوٹ گئے
ہیں تو یہ بیچاری سوائے اس کے کہ کھڑی دھواں دیتی جاوے اور شیں شاں شیں شاں
کیے جاوے اور کیا کر سکتی ہے (کیا مسافت قطع کر لے گی؟ ہرگز نہیں) بلکہ الٹا شور سے
پریشان کرے گی، کاش جس گاڑی میں بھاپ تھی۔ پہیے بھی ہوتے اور لائن پر بھی ہوتی
(یعنی جس میں محبت اور جوش تھا اس میں شریعت کے مطابق عمل بھی ہوتا) تب لطف
تھا کہ سفر کتنا جلدی اور اطمینان سے طے ہوتا)۔

محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے تو پھر محبوب کے کسی قول اور

[illegible] ص ۱۹۹، ۲۰۳

فعل میں کوئی شبہ اور وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔ تمام مصائب محبین کو آسان ہو جاتے ہیں کہ نہ قید خانہ سے ان کو تکلیف ہوتی ہے نہ فاقہ سے کلفت۔ ان کی شان یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں مگر خوش ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی وہ آخرت میں محبت میں رضائے محبوب۔ ہے لذت طاعت ہے۔ لذت مناجات ہے۔ لذت قرب ہے ۱۱ اسلئے کہ محبت سے معرفت بڑھتی ہے طاعت و فرمانبرداری میں لطف آنے لگتا ہے۔

طریق کار

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ الآیہ۔

آپ فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

محبت گو خود غیر اختیاری ہے مگر اس کا طریقہ اختیاری ہے جس پر محبت کا پیدا ہونا عادۃً ضروری ہے اور اختیاری کاموں میں خدا تعالیٰ نے ہر کام کی تدبیر بتلائی ہے اس کی تدبیر یہ ہے کہ چند باتوں کی پابندی کریں۔ انشاء اللہ بہت تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ سے محبت کامل ہو جائے گی (جس کو اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ)

(۱) دین کا علم سیکھیں (۲) اعمال میں ہمت کر کے ظاہراً بھی اور باطناً بھی شریعت کے پابند رہیں۔ (۳) کسی شیخ کامل کی صحبت کا انتخاب کریں۔ بشرطیکہ کوئی محذور شرعی لازم نہ آئے کیونکہ اہل محبت کی صحبت سے حق تعالیٰ سے محبت پیدا ہوتی ہے (۴) شیخ و مرشد کے احکام کی پوری طرح اطاعت کریں۔ کیونکہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے (۵) نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت و استقامت کے ساتھ مشغول رہیں۔ (۶) تھوڑی دیر خلوت

[illegible]

میں بیٹھ کر ان شاء اللہ ذکر کیا کریں۔ (۷) محبانِ خدا سے تعلق پیدا کریں اور ان کی صحبت اختیار کریں اور یہ بہت ضروری ہے۔ اگر آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت ہی رکھیں۔ (۸) تنہائی میں کسی وقت خدا کی نعمتوں کو سوچا کریں۔ پھر اپنے برتاؤ پر غور کیا کریں۔ (۹) خدا تعالیٰ سے دعا کیا کریں کہ محبت عطا فرمائیں۔ (۱۰) یہ مراقبہ کیا کریں کہ حق تعالیٰ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور مجھ کو چاہتے ہیں اس سے بندہ کے قلب میں بھی نسبت پیدا ہوگی اور بندہ خواہ کیسی ہی مصیبت اور پریشانی میں ہو۔ ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔

طریق تحصیل دنیا کے علائق کو قطع کرنا یعنی غیر اللہ کی محبت کو دل سے نکالنا کیونکہ دو محبتیں ایک دل میں جمع نہیں ہوتیں اور اللہ تعالیٰ کے کمالات و اوصاف و انعامات کو یاد کرنا اور سوچنا (طریق تحصیل ہے)

لہ انفاسِ عیسیٰ ص [illegible] لہ [illegible]

باب سوم اخلاقِ ذمیمہ کا بیان

اخلاقِ رذیلہ: ذمیمہ مذموم نہیں ہیں ان پر عمل بمقتضی الاخلاق الرذیلہ مذموم و منہی عنہ ہے
(یعنی اخلاقِ ذمیمہ کے تقاضے کے مطابق عمل کرنا منع ہے) مثلاً غصہ کا وجود مذموم نہیں ہے لیکن
اس کو بے محل صرف کرنا ناجائز ہے یا مثلاً بخل اگر کسی اچھی جگہ کیا جاوے تو بُرا ہے اور اگر کسی
بُری جگہ کیا جاوے تو بُرا نہیں۔ مثلاً ناچ (وغیرہ) میں چندہ دینے سے بخل کیا۔ (مزید معلومات
کے لیے شریعت کے عنوان کے تحت اخلاق کا بیان اور باب دوم متعلق اخلاقِ حسنہ
ملاحظہ ہو)۔

اخلاقِ ذمیمہ چند چیزیں ہیں۔ آفاتِ لسان (کذب، غیبت وغیرہ) اسراف، بخل
بغض، تکبر، حبِ جاہ، حبِ دنیا، حرص، حسد، ریا، شہوت، عجب، غضب وغیرہ۔
ان چیزوں کا ازالہ کرنا سالک کو ضروری ہے۔ ان کو الگ الگ فصلوں میں ذکر کیا جائے گا۔
(ان شاء اللہ تعالیٰ)۔

طریقِ کار رذائل کا امالہ کافی ہے۔ ازالہ کی فکر ضروری نہیں۔ اضمحلال بھی کافی ہے مگر
اضمحلال کے لیے مشق کی ضرورت ہے اور مشق کثرت تکرار سے ہوتی ہے
کثرت تکرار کی خاصیت ہے کہ ایک دن ان شاء اللہ تعالیٰ یہ رذیلہ کمزور ہو جائیگا۔ مجاہدات
وکثرت مخالفت سے اخلاقِ رذیلہ گو معدوم نہیں ہوتے مگر کالعدم ضرور ہو جاتے ہیں اور یہ
طریقہ آسان ہے جو ہر شخص کے اختیار میں ہے کہ اپنے قصد و اختیار سے رذائل کی مخالفت
کیا کرے۔

معالجہ اخلاقِ رذیلہ کا مختصر علاج یہ ہے۔ تامل و تحمل، یعنی جو کام کریں سوچ کر کریں کہ
شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کریں بلکہ تحمل سے کام لیا کریں یا [illegible]
اتباع، یعنی اپنے احوال و اعمال سے شیخ کو مطلع کرتے رہیں اور اس کی تجویز پر عمل کریں۔ یا

ے اشرف الرسائل صفحہ [illegible] ؎ تعلیم الدین صفحہ [illegible] ؎ کمالات اشرفیہ صفحہ [illegible]

"عقیدہ و اعتماد یعنی اپنے شیخ کی اطاعت کا طو کریں اور وہ جو کچھ کہے اس پر اعتماد کریں۔

پہلی فصل آفاتِ لسان کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا — وہ کچھ بات نہیں بولتا ہے مگر اس کے
لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۔ الآیۃ — نزدیک نگہبان تیار ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

من صمت نجا۔ رواہ احمد الترمذی — جو چپ رہا اس نے نجات پائی۔

حقیقت آفاتِ لسان | انسان جتنے کام یا کلام کرتا ہے بظاہر اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱:۔ مفید۔ جس میں کوئی دین یا دنیا کا فائدہ ہو۔

۲:۔ مضر۔ جس میں دین یا دنیا کا کوئی نقصان ہو۔

۳:۔ نہ مفید نہ مضر۔ جس میں نہ کوئی فائدہ ہو نہ نقصان۔

اس تیسری قسم کو حدیث میں لایعنی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن جب ذرا غور سے کام لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی درحقیقت دوسری قسم یعنی مضر میں داخل ہے کیونکہ وہ وقت جو ایسے کام یا کلام میں صرف کیا گیا اگر اس میں ایک دفعہ سبحان اللہ کہہ لیتا تو میزانِ عمل کا آدھا پلہ بھر جا) ۔ کوئی اور مفید کام کرتا تو گناہوں کا کفارہ اور نجاتِ آخرت کا ذریعہ یا کم از کم دنیا کی ضرورتوں سے بےفکری کا سبب بنتا۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انسان کا اسلام درست و صحیح ہونے کی ایک علامت

لہ تعلیم الدین صفحہ ۔ لہ کتاب ... صفحہ ۔ ... رواہ الترمذی وابن ماجہ

یہ ہے کہ بے فائدہ کاموں اور باتوں کو چھوڑ دے۔

احیاء العلوم میں ہے کہ لایعنی کلام کا حساب ہوگا اور جس چیز کا حساب دینا پڑے تو اس سے خلاصی یقینی نہیں۔

گالی گلوچ کرنا

گالی اور فحش کلامی سے مراد یہ ہے کہ ایسے کام جن کے اظہار سے آدمی شرماتا ہو، ان کو صریح اور کھلے الفاظ سے ظاہر کرنا پھر اگر وہ واقع کے مطابق اور صحیح ہو تو ایک گناہ گالی دینے کا ہے اور اگر واقعہ کے خلاف ہو تو دوسرا گناہ بہتان و افترا کا بھی ہے۔ جیسے کسی شخص یا اس کی ماں بہن کی طرف کسی فعل حرام کی نسبت کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے اور (ایک دوسری) حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی شخص کو عیب لگانے کے لیے ایسی بات کہے جو اس میں نہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ میں اس وقت تک روکے رکھیں گے جب تک وہ اپنے کہے کی سزا نہ بھگت لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشرکین کفار کو بھی گالی دینے سے منع فرمایا جو غزوۂ بدر میں مارے گئے تھے اور فرمایا "ان کو گالی دینے سے ان تک تو کچھ اثر نہیں پہنچتا، زندوں کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے"۔

احادیث مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ گالی دینا کسی کافر یا جانور کے حق میں بھی حرام ہے۔

لعنت کرنا

لعنت کے معنی ہیں کسی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور، یا غضب و قہر میں مبتلا، یا دوزخی کہنا، یا بطور بددعا کے یہ کہنا کہ اس کو اللہ اپنی رحمت سے دور کرے، یا اس پر غضب الٰہی نازل ہو، یا دوزخ میں جائے وغیرہ۔

لعنت کے تین درجے ہیں۔

[illegible] صحیح بخاری، صحیح مسلم [illegible] ترمذی وغیرہ۔

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ ۔ — آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات سنے بیان کر دے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جھوٹ بولنے سے بچو کیونکہ جھوٹ اور فجور ساتھ ساتھ ہیں اور یہ دونوں دوزخ میں ہیں اور فرمایا۔ جھوٹی شہادت تین مرتبہ شرک کے برابر ہے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک زنبور ہے (زنبور چمٹے کے مثل ایک آلہ ہے جس کے اگلے سرے مڑے ہوئے ہوتے ہیں) اور اس بیٹھے ہوئے کے کلے کو چیرتا ہے یہاں تک کہ گدی تک جا پہنچتا ہے۔ پھر وہ کلا درست ہو جاتا ہے پھر اس کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھی (جبرائیل) سے پوچھا تو کہا کہ وہ شخص جھوٹا ہے اس کے ساتھ قیامت تک یوں ہی کرتے رہیں گے۔ (یعنی قبر میں عذاب ہوتا رہے گا)

غیبت : اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۔ الآیۃ — اور کوئی کسی کی غیبت نہ کیا کرے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْغِيْبَةُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا — غیبت زنا سے سخت تر ہے۔

کسی کی پیٹھ پیچھے اس کی ایسی بات کہنا کہ اگر وہ سنے تو اس کو ناگوار ہو اگر یہ وہ بات اس کے اندر موجود ہو اور اگر وہ بات اس میں نہیں تو وہ غیبت سے بڑھ کر بہتان ہے۔ اسی طرح کسی کی نقل اتارنے سے مثلاً لنگڑا کر دکھانا اگرچہ یہ بھی غیبت ہے بلکہ یہ زیادہ برا ہے۔

۱؎ مسلم ۔ ۲؎ ترغیب صفحہ ۳۹۳ نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد [illegible] جلد اول۔ ۳؎ [illegible] تعلیم الدین صفحہ [illegible]

سوم ۔ مفتی سے فتویٰ لینے کے لیے استفتاء میں امر واقعی کا اظہار کرنا بھی جائز ہے اگرچہ اس اظہار حال میں کسی کی غیبت ہوتی ہو۔

چہارم ۔ اگر کوئی شخص کسی سے نکاح یا خرید و فروخت کا معاملہ کرتا ہے اور تم کو علم ہوا کہ اس معاملہ میں ناواقفیت کی وجہ سے اس کا نقصان ہوگا تو اس کو نقصان سے بچانے کیلئے اس کا اصل حال بیان کر دینا بھی جائز ہے۔

پنجم ۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے نام ہی سے مشہور ہو گیا جس میں عیب ظاہر ہو، مثلاً کانا، لنگڑا۔ تو اس نام سے اس کا پتہ بتلانا غیبت میں داخل نہیں ہے مگر پھر بھی اگر دوسرا پتہ بتلا دو تو بہتر ہے تاکہ غیبت کی صورت بھی پیدا نہ ہو۔

مدح سرائی

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مجمع میں اپنے دوست کی تعریف کی تو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نفس میں خودی و بڑائی پیدا کر کے اس کو ہلاک کر دیا۔ دوسرا یہ کہ تعریف سن کر نفس پھولتا ہے اور اعمال خیر میں سستی پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مسلمان بھائی کو کند چھری سے ذبح کر دینا اس سے بہتر ہے کہ اس کے منہ پر اس کی تعریف کی جائے۔ اس لیے کہ ممدوح مغرور ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو قابل تعریف سمجھنے لگتا ہے۔ یہ اس کی ہلاکت دنیاوی کی جڑ ہے۔

اکثر دنیا دار مسلمانوں کی عادت ہے کہ وہ مالدار اور صاحب جاہ لوگوں کی تعریف کرتے ہیں۔ اس میں اکثر باتیں ایسی بیان کی جاتی ہیں جو واقعہ کے خلاف ہوتی ہیں۔ یہ صریح جھوٹ اور کبیرہ گناہ ہے۔

دوم ۔ محبت کا جھوٹا اظہار کرتے ہیں حالانکہ دل میں ذرا بھی محبت نہیں ہوتی اور یہ محض ریا اور نفاق ہے جو گناہ کبیرہ ہے۔

سوم ۔ اٹکل سے تیر چلاتے ہیں اور جو باتیں یقینی طور پر معلوم نہیں محض تخمین در گمان کی بنا پر ان کو واقعی ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ آپ بڑے متقی ہیں۔ نہایت منصف ہیں۔ حالانکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی کی تعریف کرنی ہو تو یوں کہا کرو کہ میرا گمان

یہ ہے کہ آپ ایسے ہیں۔ کیونکہ غلط باتوں کو صحیح بتانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔

چہارم: اگر ظالم اور فاسق کی تعریف کی جاتی ہے اور وہ تعریف سے خوش ہوتا ہے تو ناحق کو خوش کرنے والا مداح بھی فاسق اور نافرمان ہوا۔ حدیث میں آیا ہے کہ فاسق کی تعریف سے حق تعالیٰ کا عرش کانپ اٹھتا ہے۔

البتہ ان صورتوں کا جن کا ہم نے ذکر کیا ہے، اندیشہ نہ ہو تو کچھ حرج نہیں بلکہ بعض اوقات مستحب اور باعث اجر ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کی مدح فرمائی ہے جو کہ صحابہ میں خود پسندی اور کوتاہی عمل کا اندیشہ نہ تھا۔ بلکہ ان میں نشاط پیدا کرنے کے لیے یہ مستحب تھی کہ ان کی طاعات میں ترقی کا وسیلہ تھیں

اگر کوئی شخص کسی کی مدح کرے تو ممدوح کو چاہیے کہ اپنے اعمال اور خطرات و وساوس کا محاسبہ کرے اور سوچے کہ نہ جانے میرا انجام کس حالت پر ہوتا ہے؟ واقعی یہ خوبیاں جو یہ شخص بیان کر رہا ہے اگر مجھ میں موجود ہیں تو بھی ان کا کیا حساب؟ نیز اپنی باطنی بیماریوں اور عیوب پر نظر کرے اور خیال کرے کہ یہ پوشیدہ عیب ایسے ہیں کہ اگر اس مداح کو معلوم ہو جائیں تو میری مدح کبھی نہ کرے۔ غرض مسلمان کو چاہیے کہ اپنی تعریف سن کر خوش نہ ہو بلکہ اس کو مکروہ سمجھے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مداح کے منہ میں خاک ڈالو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جب مدح ہوتی تھی تو یوں دعا مانگتے پھرتے تھے کہ یا الٰہا! میرے جو گناہ ان کو معلوم نہیں ہیں وہ بخش دیجئے اور جو یہ کہہ رہے ہیں اس کا مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے۔ اور مجھے ان کے گمانوں سے بہتر بنا دیجئے۔ میں جیسا ہوں آپ ہی خوب جانتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے۔

(۱۰) امور مذکورہ بالا کے علاوہ اور بھی بہت سی آفتیں ہیں[1]۔ مثلاً خلاف شرع باتیں کرنا۔ ناحق بحث مباحثہ کرنا۔ جھگڑا کرنا۔ کلام میں بناوٹ اور تکلف کرنا۔ کسی کا راز ظاہر کرنا۔ کسی کی زیادہ خوشامد کرنا۔ ذات و صفات میں محض اٹکل پچو گفتگو کرنا۔ علماء سے فضول باتیں پوچھنا۔ وغیرہ۔

---

[1] تعلیم الدین ص ۶۰

تیسری فصل بخل کا بیان [۱]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَفْسِهِ [۲] — اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

والبخیل بعید من اللہ بعید من الجنۃ بعید من الناس قریب من النار۔ رواہ الترمذی — کنجوس اللہ سے دور ہے جنت سے دور ہے لوگوں سے دور ہے۔ دوزخ کے قریب ہے۔

حقیقت بخل [۳] جس چیز کو خرچ کرنا شرعاً یا مروۃً ضروری ہو اس میں تنگدلی کرنا بخل ہے اس کے دو درجے ہیں۔ ایک خلاف مقتضائے شریعت اور یہ معصیت ہے۔ دوسرا خلاف مقتضائے مروت۔ اور یہ معصیت نہیں لیکن خلاف اولیٰ۔ یہ بھی فضیلت تو ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔ اور تدبیر اس کی یہ ہے کہ اس مقتضاء کی مخالفت کی جاوے لیکن اگر ہمت نہ ہو تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ اور اگر باوجود استطاعت کے اس پر عمل کیا تو بعض کے نزدیک یہ بھی بخل ہے اسلئے اور جو ضرورتیں اتفاقیہ پیش آجائیں ان کو بھی الگ سمجھنا بھی ضروری ہے حدیث میں آیا ہے کہ جس مال کے دینے سے آدمی اپنی آبرو کو بچائے وہ بھی صدقہ ہے۔ مثلاً کسی مالدار کو اندیشہ ہو کہ یہ شاعر یا ڈوم یا بھانڈ میری ہجو کرے گا اور اگر میں اس کو کچھ دیدوں تو اس کا منہ بند ہوجائیگا اور باوجود اس علم کے نہ دی کچھ صورت تو وہ شخص بخیل سمجھا جائیگا۔ کیونکہ اس نے اپنی آبرو محفوظ رکھنے کی تدبیر نہ کی اور بدگو کو بدگوئی کا موقع دیا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

---

۱ تعلیم الدین صفحہ ۱۲ ۲ کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۸ ۳ تبلیغ دین صفحہ ۵۲

ہے اور مال کی محبت دنیا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے جس سے اللہ کی محبت کا علاقہ ضعیف اور کمزور ہو جاتا ہے اور بخیل مرتے وقت حسرت بھری نظروں سے اپنا جمع کیا ہوا محبوب مال دیکھتا اور جبراً و قہراً آخرت کا سفر کرتا ہے اس لیے کہ اس کو خالق جل جلالہ کی ملاقات محبوب نہیں ہوتی۔ اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص مرتے وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہ کرے وہ جہنمی ہے۔

طریق کار بخل کے نقصانات معلوم کریں کہ آخرت کی تباہی اور دنیا کی بدنامی دونوں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔ خوب سمجھ لیں کہ مال بخیل کے ساتھ جانے والا نہیں ہے۔ دنیا میں جو مال انسان کو دیا گیا ہے وہ صرف اس غرض سے دیا گیا ہے کہ وہ اس کو اپنی ضرورتوں میں خرچ کیا کرے (ابتداً) جو چیز اپنی ضرورت سے زیادہ ہو اپنی طبیعت پر زور ڈال کر وہ چیز کسی کو دیدیا کریں۔ اگرچہ نفس کو تکلیف ہو مگر ہمت کر کے اس تکلیف کو برداشت کریں۔ جب تک کنجوسی کا اثر بالکل دل سے نہ نکل جائے برابر یہی کیا کریں۔

طریق علاج مال کی محبت دل سے نکالیں۔ طریقۂ علاج حب دنیا میں مذکور ہے۔

چوتھی فصل بغض یعنی حقد اور کینہ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ — معاف کرنے کو اختیار کرو اور اچھی بات کا
وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ — حکم کرو اور جاہلوں سے منہ موڑو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لہ تبلیغ دین صفحہ [illegible]

لا تباغضوا (متفق علیہ) آپس میں بغض نہ رکھو۔

حقیقتِ بغض

جب غصہ میں بدلہ لینے کی قدرت نہیں ہوتی تو ضبط کرنے سے اس شخص کی طرف سے دل پر ایک قسم کی گرانی ہو جاتی ہے اس کو حقد یعنی کینہ (اور بغض) کہتے ہیں۔ پس کینہ کا منشا غصہ ہے اور بیٹا غصہ میں ہوتا ہے اور بیٹے غصہ میں دو عیب ہیں ایک عیب تو خود وہ غصہ تھا اور دوسرا عیب یہ کینہ ہے تو کینہ صرف ایک عیب نہیں بلکہ بہت سے گناہوں کا تخم ہے جب غصہ نکلا نہیں تو اس کا غبار دل میں بھرا رہتا ہے اور بات بڑھتی اور رنجیدگیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

کینہ[1] یہ ہے جو اختیار اور قصد سے کسی کی برائی اور بدخواہی دل میں رکھی جاوے اور اس کو ایذا پہنچانے کی تدبیر کرے۔ اگر کسی سے رنج کی کوئی بات پیش آوے اور طبیعت اس سے ملنے کو نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباض طبعی ہے جو گناہ نہیں (حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کینہ پرور بخشا نہیں جاتا) اور فرمایا۔ اللہ تعالیٰ پیر اور جمعرات کو جب بندوں کے نامۂ اعمال اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو ہر استغفار کرنے والے کی مغفرت کر دیتا ہے لیکن اہل کینہ کی نجات نہیں ہوتی نیز فرمایا ان دو آدمیوں کی بخشش نہیں ہوتی جن کے درمیان عداوت اور کینہ ہو بشرطیکہ عداوت کا منشا دنیاوی امور ہوں لیکن اگر کسی مسلمان کو کسی سے دین کے متعلق خدا کے واسطے دشمنی ہو تو یہ عداوت مستحسن و قابلِ اجر ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ الحب للہ والبغض للہ کا اجر ہے۔

قیامت[2] کے دن حق تعالیٰ آواز دے گا کہ کہاں ہیں وہ جو خاص میرے واسطے باہم محبت کرتے تھے؟ آج جبکہ میرے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہیں میں ان کو اپنے سایہ میں رکھوں گا۔ یاد رکھو کہ ایمان کے بعد اللہ واسطے کی محبت کا درجہ ہے اور اس کے بھی کئی درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ تم کو کسی شخص سے اس بنا پر محبت ہو کہ تم کو اس کے ذریعہ سے ایسی چیز حاصل ہوتی ہے جو آخرت میں مفید ہے۔ مثلاً شاگرد کو اپنے استاد کے ساتھ علمِ دین حاصل کرنے کے سبب ہے

---

[1] غوائل الغضب صفحہ [illegible]۔ [2] [illegible] صفحہ [illegible]۔ [3] تبلیغ دین صفحہ [illegible]۔

۴:۔ قبولِ حق اور رجوع عن الباطل سے بڑا سدِّ راہ ہے۔ ایسا[1] شخص[2] کسی کی نصیحت کو نہیں مانتا۔ بلکہ بُرا مانتا ہے اور اس نصیحت کرنے والے کو تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔

طریقِ کار: وہ[3] ایک مراقبہ ہے جس کی ایسے ہر وقت میں تجدید و تکرار کی جائے جبکہ اس طرف التفات ہو۔

۱:۔ گو میرے اندر یہ کمال ہے مگر میرا پیدا کیا ہوا نہیں۔ حق تعالیٰ کا عطا فرمایا ہوا ہے۔ اور

۲:۔ عطا بھی کسی استحقاق سے نہیں ہوا بلکہ محض موہبت و رحمت سے ہوا۔ پھر

۳:۔ عطا کے بعد بھی اس کا بقاء میرے اختیار میں نہیں بلکہ حق تعالیٰ جب چاہیں سلب کر لیں۔ اور

۴:۔ گو اس دوسرے شخص میں فی الحال یہ کمال نہیں ہے مگر فی المآل ممکن ہے کہ میرے کمال سے زیادہ اس کو یہ کمال حاصل ہو جاوے کہ میں اس کمال میں اس کا محتاج ہو جاؤں۔ اور

۵:۔ اگر فی المآل بھی نہ ہو جیسا بعض قرائن ظاہرہ کا مقتضا ہے اس کا گمان غالب ہوتا ہے تو فی الحال ہی اس شخص میں کوئی ایسا کمال ہو جو مجھ سے مخفی ہو اور دوسرا اس پر ظاہر ہو یا سب ہی سے مخفی ہو اور حق تعالیٰ کو معلوم ہو جس کے اعتبار سے اس کے عارض کا مجموعہ میرے اوصاف کے مجموعہ سے اکمل ہو۔

۶:۔ شاید یہ علمِ الٰہی میں مقبول ہو اور میں غیر مقبول ہوں۔ یا اگر میں بھی مقبول ہوں تو یہ مجھ سے زیادہ مقبول ہو تو مجھ کو کیا حق ہے کہ اس کو حقیر سمجھوں۔

۷:۔ اور اگر بالفرض یہ سب امور میں مجھ سے کم ہی ہے تو ناقص کا کامل پر حق ہوتا ہے جیسا کہ بیمار کا صحیح پر، ضعیف کا قوی پر، فقیر کا غنی پر۔ تو مجھ کو چاہئے کہ اس پر شفقت، ترحم کروں اس کی تکمیل میں کوشش کروں۔ اور اگر کسی طرح قدرت یا ہمت یا فرصت نہ ہو تو دعائے تکمیل ہی سہی۔

[illegible]

حبِ جاہ سے ضرر ہوتا ہے یہ وہ جاہ ہے جو طلب سے حاصل ہو۔ یہ رذیلہ ہے جو کہ دین و دنیا دونوں کو مضر ہے۔ دینی ضرر تو یہ ہے کہ جب آدمی دیکھتا ہے کہ دنیا مجھ پہ فدا ہے تو اس میں عجب و کبر پیدا ہو جاتا ہے آخر کار اسی عجب و کبر کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے۔ بہت لوگ اس میں آکر ہلاک ہو گئے۔ یہ تو دین کا ضرر ہوا اور دنیا کا ضرر یہ ہے کہ مشہور آدمی کے حاسد بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس صاحبِ جاہ کا دین بھی خطرہ میں رہتا ہے اور دنیاوی خطروں کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ ہاں جب حق تعالیٰ کی طرف سے بدون طلب کے جاہ حاصل ہو وہ نعمت ہے کیونکہ مال کی طرح انسان جاہ کا بھی بقدر ضرورت محتاج ہے تاکہ اس کی وجہ سے مخلوق کے ظلم و تعدی سے محفوظ اور بے فکر ہو کر باطمینانِ قلب عبادت میں مشغول رہ سکے۔ لہذا اتنی طلبِ جاہ میں مضائقہ نہیں ہے۔

چونکہ حبِ جاہ کا منشا بھی کبر ہے اس لیے اس کے اقسام، احکام و معالجات وہی ہیں جو تکبر میں گزر گئے ہیں۔

طریق کار حبِ جاہ کی جو مذمتیں اور وعیدیں وارد ہیں ان پر غور و فکر کریں بلکہ زبان سے بھی ان کا تکرار کریں اور ان مضامین سے اپنے نفس کو خطاب کریں کہ تجھ کو ان سے عقاب ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس کے ساتھ اپنے عیوب کا استحضار اور نفس کو خطاب کہ اگر لوگوں کو ان رذائل کی اطلاع ہو جاوے تو کتنا ذلیل اور حقیر سمجھیں تو یہ غنیمت سمجھو کہ لوگ نفرت و تحقیر نہیں کرتے نہ کہ ان سے توقع تعظیم و مدح کی رکھی جاوے اور مدح کو زبان سے منع کر دیا جائے اور اس میں ذرا اہتمام سے کام لیا جاوے۔ سرسری نہی کرنا کافی نہیں اور اس کے ساتھ ہی جو لوگ ذلیل شمار کیے جاتے ہیں ان کی تعظیم کیجائے گو نفس کو گراں ہو۔

طریق علاج یوں سوچیں کہ جو لوگ میری تعظیم و خوشامد کر رہے ہیں یہ سب مر جائیں گے اور میں بھی مروں گا پھر ایسی موہوم و فانی چیز پر خوش ہونا نادانی ہے۔

لہ تعلیم الدین صفحہ ۲ ۔ ۲ تبلیغ دین صفحہ ۱۵۵ ۳ بخاری شریف صفحہ ۹۹ ۴ تعلیم الدین صفحہ ۹۳

ساتویں فصل حُبِّ دنیا کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۔ دنیا کی زندگانی دھوکے کی پونجی ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ رواہ مسلم ۔ دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔

حقیقتِ دنیا

جس چیز میں فی الحال حظِ نفس ہو اور آخرت میں اس کا کوئی ثمرہ مرتب نہ ہو۔ وہ دنیا ہے۔

دنیا لغۃً قریب کی چیز کا نام ہے اور عرفاً مطلق اس حالت کا نام ہے جو موت سے پہلے ہے اور شریعت میں اس حالت کا نام ہے جو مانع عن الآخرۃ ہے اور مجازاً ان اموال و اسباب پر اطلاق کیا جاتا ہے جو اس کی ذمیمت کے اسباب بن جائیں پس جو احوال خواہ از قسم اموال ہوں یا از قبیل افعال و اعمال یا عقائد و علوم ہوں اسی طرح جو احوال کہ آخرت کے واجب التحصیل سے مانع ہوں گے وہ سب دنیائے مذموم میں داخل ہیں اور ان کے مذموم ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

دنیا کے تمام جھگڑوں، بکھیڑوں اور مخلوقات اور موجودہ چیزوں کے ساتھ تعلق رکھنے کا نام دنیا کی محبت ہے۔ البتہ علم و معرفتِ الٰہی اور نیک کام جن کا ثمرہ مرنے کے بعد ملنے والا ہے ان کا دخل اگرچہ دنیا میں ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ دنیا سے مستثنیٰ ہے اور ان کی محبت دنیا کی محبت نہیں۔ بلکہ آخرت کی محبت ہے۔ حق تعالیٰ دنیا کے بارے میں فرماتے ہیں دنیا کی تمام چیزوں کو زینت کی

له تعلیم الدین ص [illegible] ۲ه تبلیغ دین ص [illegible]

اسباب غفلت کو مجازاً تسمیۃ المسبب باسم السبب کو بھی دنیا کہہ دیتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ الآیۃ

اکثر لوگوں کو خوشنما معلوم ہوتی ہے محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں بیٹے ہوئے، سونے اور چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر ہوئے، نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی (یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگانی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے (جو بعد موت کام آنے کی ہے)۔[1]

یہ جو فرمایا کہ ان چیزوں کی محبت خوشنما معلوم ہوتی ہے اس کا حاصل میرے ذوق میں یہ ہے کہ یہ محبت و میلان غالب حالات میں موجب فتنہ ہوجانے کی وجہ سے بُری چیز ہے مگر اکثر لوگ اس کو سبب ضرر نہیں سمجھتے بلکہ اس میلان کو عقل اور اخلاق اچھا سمجھتے ہیں چونکہ مذاق مختلف تھا اس لیے مختلف چیزیں بیان فرمائیں۔ کسی کو عورتوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور کسی کو اولاد سے کسی کو سونے چاندی سے، کسی کو گھوڑوں سے، کسی کو بیلوں اور کھیتی سے۔ کسی کو عورتوں سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ دن رات اسی میں مبتلا ہیں۔ ہر وقت یہی خیال ہے۔ کسی کو اولاد کی ایسی چاہت ہوتی ہے کہ دن رات اسی دھن میں رہتے ہیں کہ بیٹا ہو، پوتا ہو، پڑپوتا ہو۔ بعض رؤسا کو بیلوں اور گھوڑوں وغیرہ سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ ریاست بھی غارت کر بیٹھتے ہیں، وجہ یہ کہ محبت کے افراط میں جنون ہوجاتا ہے۔

تو اب سمجھ لیجئے کہ کسب دنیا اور چیز ہے اور حب دنیا اور چیز ہے۔ حب دنیا مذموم ہے اور کسب دنیا بقدر حاجت جائز۔ چنانچہ حق تعالیٰ کی کیا اچھی تعلیم ہے کہ مرغوب چیزوں کی فہرست تو بیان فرمادی مگر ان کی نفی صراحتاً بالکل نہیں فرمائی بلکہ اس کے بعد اس سے اچھی چیز کا پتہ بتلا

---

[1] بیان القرآن ص۵۰ ج۲ [2] انوار السراج ص [illegible] ملخصاً

دیکھو یہ سب چیزیں مثلاً عورتیں، اولاد، زر و مال وغیرہ سب اچھی چیزیں ہیں۔ مگر دوسری چیز ان سے زیادہ اچھی ہے غرض حق سبحانہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی مذمت نہیں فرمائی۔ چنانچہ اس آیت میں اس طرح بیان فرمایا کہ ان چیزوں کی خاص درجہ کی محبت واقع میں تو اچھی نہیں مگر انسان کی نظر میں یہ چیزیں مزین کر دی گئی ہیں جس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی پرمیزہ جواہر ان کو میٹھی ڈلی سمجھے کہ یہ ایک چمکتا ہے اور اس کے ظاہر رنگ و روپ کو دیکھ کر فریفتہ ہو جائے اور جب وہاں پہنچے تو پاخانہ میں بھر جائے یہی حال دنیا کا ہے کہ ظاہر تو اس کا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے مگر اندر نجاست بھری ہوئی ہے۔

دنیائے مذموم کی مثال خوبصورت سانپ کی سی ہے جس کا ظاہر تو اچھا ہے نقش و نگار سے آراستہ ہے مگر اندر زہر بھرا ہوا ہے ؎

زہر ایں مار منقش است آں ہست
باشد از وے دور ہر کہ عاقل است

اگر بچے کے سامنے سانپ چھوڑ دیں تو وہ اس کی ظاہری خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کو پکڑ لیتا ہے۔ اس کو یہ خبر نہیں کہ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے اور اس کا انجام کیا ہو گا ہماری حالت بھی اسی بچہ کی سی ہے کہ ہم دنیا کی ظاہری آب و تاب اور نقش و نگار اور رنگ و روپ پر فریفتہ ہیں اور اندر کی خبر نہیں یہ بھی تجربہ ہے کہ سانپ جتنا خوبصورت ہوتا ہے اسی قدر زہریلا ہوتا ہے۔ اسی لئے حقیقت شناس اس کی طرف رغبت نہیں کرتے۔

دنیا کی حقیقت معلوم نہ ہونے سے لوگ اس پر فریفتہ ہو رہے ہیں۔ اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو سخت نفرت ہو جائے جیسے کسی چڑیل بڑھیا کو لال ریشمی لباس پہنا دیا گیا ہو اور نقاب سے منہ ڈھک دیا گیا ہو اور کوئی اس کو حسین خوبصورت سمجھ کر دم بھرنے لگے۔

حدیث شریف میں ہے۔

؎ کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۴۹ ؎ انفاس عیسیٰ صفحہ ۳۲

لو[1] كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة ما سقى كافرا منها شربة ماء — اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی قدر مچھر کے بازو کے برابر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ دیتے۔

چونکہ کسی کی قدر کچھ بھی نہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ مبغوض رکھتے اپنے دشمنوں کو دیتے ہیں۔ حقیقت شناس آدمی ہمیشہ ایسی چیز سے گھبراتا ہے جو خدا تعالیٰ کو مبغوض ہو۔

حال[2] دنیا را بپرسیدم من از فرزانۂ — گفت یا خوابے است یا بادے است یا افسانۂ؟
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے ببست — گفت یا غولے است یا دیوانۂ

(یعنی ایک عاقل سے دنیا کی حالت کے متعلق میں نے سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ دنیا ایک خواب ہے یا ایک ہوا ہے یا ایک افسانہ ہے۔ پھر میں نے اس شخص کے متعلق دریافت کیا کہ جس نے دنیا سے دل لگایا تو اس نے جواب دیا کہ وہ یا تو بھلاوا ہے یا شیطان ہے یا پاگل ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کو ایک مثال میں بیان فرماتے ہیں:

مالی وللدنیا انما مثلی ومثل الدنیا کراکب استظل تحت شجرۃ یعنی مجھ کو دنیا سے کیا علاقہ ہے میری مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی سوار راستہ میں جا رہا ہو اور کسی درخت کے سایہ میں سستانے کے لیے ٹھہر جائے اور سستا کر اپنی راہ لے۔

رہ[3] عقبیٰ است دنیا چوں پلے — بہر تماشا مکن دروے منزلے

راہ عقبیٰ (یعنی سفر آخرت) میں دنیا کی مثال پل جیسی ہے (جو ایک نالی گزرگاہ) اور ایک ویرانہ منزل ہے۔ نیز اس کی مثال آخرت کے سامنے سرائے جیسی ہے اس لیے دنیا کی مصلحت و منفعت بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے اور شریعت نے بھی اجازت دی ہے (البتہ اس تمام تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ ان کو مقصود بالذات نہ بنائیں بلکہ مقصود بالغیر بنائیں۔

مقصود[4] تو یہ ہے کہ آخرت ایک بازار ہے اور اس کا سکہ اعمال ہیں۔ اگر یہ سکہ پاس نہ ہو گا تو آدمی کس چیز سے وہاں کی نعمتیں خریدے گا۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ دنیا کی سرائے میں لگائے چلے جاتے

۱؎ کمالات اشرفیہ ص۱۸۹ ۲؎ ابقیٰ ص۱۴۰۲۲ ۳؎ الاجر بالصبر ص۲۰ ۴؎ الاحکام و تحقیق ص۲۰

یَتَّقُوْنَ ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿﴾ کے لیے بہتر (یعنی نافع تر) ہی ہے، تم پھر
سمجھتے نہیں ہو؟ کہ اس کو مان کر اس کے لیے
سعی کرو، یعنی ایمان اور اعمال صالحہ میں)

(یہاں اللہ تعالیٰ کا مقصود مباحات وغیرہ کو لہو و لعب فرمانا مقصود نہیں بلکہ ان کے اشتغال میں اعمال کو کہ آخرت کے لیے نہ موضوع ہیں نہ معین ہیں تو اس قید سے طاعات اور مباحاتِ معینہ طاعات سب نکل گئے اور مباحات لایعنی اور معاصی سب داخل رہ گئے گو ایسے مباحات میں گناہ نہ ہو لیکن بے سود اور فانی الاثر تو ہیں اور لہو و لعب کے معنی اہلِ لغت نے متقارب بلکہ متحد ہی لکھے ہیں۔ صرف فرق اعتباری ہو سکتا ہے وہ یہ کہ غیر نافع امر میں مشغول ہونے کے دو اثر ہیں ایک خود اس کی طرف متوجہ ہونا۔ دوسرے اس کی وجہ سے نافع امور سے بے توجہی ہو جانا تو امر اول کے اعتبار سے لعب کہلاتا ہے اور دوسرے اعتبار سے لہو۔

(خلاصہ یہ ہوا کہ طلبِ دنیا یعنی دنیا کمانا تو برا نہیں لیکن حبِ دنیا برا ہے مال مثل پانی کے ہے اور قلب مثل کشتی کے ہے۔ ؏

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است ۔ آب اندر زیرِ کشتی پشتی است

یعنی کہ پانی کشتی کا معین بھی ہے اور اس کو ڈبونے والا بھی ہے اس طرح کہ کشتی سے باہر (اور نیچے) رہے تو معین (و مددگار) ہوتا ہے اور اگر کہیں پانی کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو ڈبو دیتا ہے۔ اسی طرح مال ہے کہ اگر قلب سے باہر صرف ہاتھ میں ہے تو معین اور اگر قلب کے اندر اس کی محبت ہے تو مہلک اور اسی کو کہا ہے۔ ؏

مال را کز بہرِ دیں باشی حمول ۔ نعم مالٌ صالحٌ گفتش رسول

حدیث میں ہے نعم المال الصالح للرجل الصالح (نیک آدمی کے لیے حلال مال بہت ہے) ایسی حالت میں وہ مال اپنا رب کو دیں گے، ضروریات دینیہ میں خرچ دیں گے لوگوں کی مدد کریں گے اور اگر دل میں مال کی محبت ہے تو اور دل کے حقوق دبا دیں گے۔ حضرت مرحوم

؎ آخرتی ص۲۹

سکے سامنے جب قارون کا خزانہ آیا تو آپ نے آیت زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ
پڑھی اور فرمایا کہ اے اللہ! اس سے معذور ہیں کہ ہم میں اس کی رغبت تو پیدا کی گئی ہے تو اس کا
ازالہ تو نہیں چاہتے مگر یہ دعا ہے کہ یہ محبت آپ کی محبت میں معاون ہو جائے۔

طریق کار

یاد رکھیں کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشہ ہے اور کثرت
مگر باطنی امراض جیسے کہ مثلاً غرور و رعونت، کینہ، حسد، ریا، تفاخر
اور جاہ و برتری کی حرص پیدا ہوتی ہے اور جب انسان کو حیات دنیوی کی رونق اور آرائش کا شوق پیدا ہوتا
ہے تو صنعت و حرفت اور زراعت، و تجارت کے ناپائیدار مشغلوں میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ آگے
پیچھے مبدا و معاد کی اس کو کچھ خبر ہی نہیں رہتی اور ظاہر و باطن دونوں دنیا ہی کے ہو رہتے ہیں۔
قلب محبت دنیا میں مشغول ہو جاتا ہے اور بدن اس کی اصلاح و تدبیر میں مصروف، حالانکہ دنیا
توشۂ آخرت ہے اور اس سے مقصود یہی ہے کہ مسافران آخرت آسانی سے اپنا سفر ختم کر سکیں۔ مگر
بہت سے لوگوں نے اسی کو مقصود اصلی سمجھ لیا اور طرح طرح کے مشغلوں اور قسم قسم کی خواہشوں
میں ایسے پڑے کہ آخرت کے وقت کو بالکل بھول گئے۔ ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص
حج کی نیت سے روانہ ہو اور جنگلوں میں پہنچ کر سواری کے گھاس دانہ اور اس کے موٹا تازہ کرنے
کی فکر میں لگ جائے اور ہمراہیوں سے پیچھے رہ جائے۔ افسوس ہے اس کی حالت پر کہ تن تنہا
جنگل میں رہ گیا اور قافلہ کوچ کر گیا جس نیت سے چلا تھا یعنی حج وہ بھی گیا گزرا اور نتیجہ یہ کہ
کہ جنگل کے درندوں نے سواری کو چیر پھاڑ ڈالا۔ اور اس کو بھی نوچ کھا گئے۔ یاد رکھو کہ دنیا
آخرت کی کھیتی ہے اور منزل کا پڑاؤ ہے اور تم جسم خاکی پر سوار ہو کر سفر آخرت کر رہے ہو۔ اس
لیے تم کو چاہیے کہ اپنی سواری کا گھاس دانہ بقدر کفایت اٹھاؤ اور سفری ضرورتوں میں کام آنے والا
سامان مہیا کر کے وہ پونجی لو جس کو آخرت میں کام آ سکے۔ اور پھر دائمی زندگی آرام سے گزار سکو۔ اور
اگر اس ماتحت سواری کی پرورش و فربہی میں مشغول ہو جاؤ گے تو قافلہ کوچ کر جائیگا اور تم منزل
مقصود پر نہ پہنچ سکو گے۔

۱؎ تبلیغ دین ص ۱۹۵ ملخصاً

جو شخص اپنے نفس کی ماہیت سے واقف ہو گیا اس نے معرفتِ الٰہی حاصل کر لی اور جس
نے دنیا کے دوں کی حقیقت سمجھ لی وہ خوب سمجھ سکتا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے بغیر آخرت
کی جاودانی نعمتیں نہیں مل سکتیں اور جب تک انسان دنیا سے منہ نہ پھیرے گا اور ان فانی
تعلقات کو منقطع کرے اور بقدرِ ضرورت دنیا پر قناعت کر کے باطمینان ذکر و فکر
میں مشغول ہو جائے اس وقت تک حق تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہوگی۔ چنانچہ قرآن پاک
بقریب سترہ بار ہلاہل (یعنی زہر قاتل) کی برائی سے بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ
جس نے سرکشی کی اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی وہ جہنمی ہیں۔[1] رسول مقبول صلی اللہ
علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان بندوں پر تعجب ہے جو دار البقا کو سچی سمجھیں اور پھر اس ناپائیدار
پر فریفتہ ہوں۔ خوب سمجھ لیں کہ جو لوگ اس کو مقصود سمجھ کر اس کے کمانے میں مشغول ہو
جاتے ہیں وہ سدا پریشان رہتے ہیں کہ ان کی طلب کبھی ختم نہیں ہوتی اور ان کی آرزو کبھی
پوری نہیں ہو سکتی۔ ان کی حرص ہمیشہ بڑھتی ہی رہے گی۔ دنیا کے زر و مال کو اپنے اطمینان
کا ذریعہ سمجھنا بڑی حماقت ہے۔ جہاں ہمیشہ رہنا نہیں ہے وہاں اطمینان کیسا؟

لہٰذا دنیا کی حالت پر توجہ ضرور کریں مگر کامل توجہ کریں جس سے حقیقت منکشف ہو جائے
ناتمام توجہ نہ کریں کہ ظاہری چمک پر رہ جائیں اور حقیقت مستور رہ جائے کیونکہ طالب دنیا کو کوئی راحت
میں نہیں چنانچہ اگر ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر ان کی اندرونی حالت کو ان کے پاس
رہ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی پریشانی سے خالی نہیں بخلاف طالب آخرت کے کہ سب کے سب
راحت میں ہیں۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ دنیا کی مرغوب سے مرغوب شے اگر اس وقت کم بھی نہ ہوتی مگر
کسی وقت تو کم ہوتی کیونکہ فنا ہونا تو گویا اس کے ذاتیات سے ہے جیسے چراغ میں تیل
کہ جو کچھ روشنی ہے وہ کم بھی ہو رہا ہے تو وہ ایک نہ ایک وقت ضرور ہی ختم ہوگا پس
ختم ہونے والی چیز سے کیا دل لگانا۔ خداوند کریم سے دل لگانا چاہیے۔ جو لافانی
ہیں۔[2]

---

[1] اندلس سیتی ص ۴۰ [2] کمالات اشرفیہ ص ۱۵۰

میں ویسے تو اس کی حماقت پر سب حاضرینِ مجلس ہنسیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے اور اس کے بعد نتیجہ یہ ہوگا کہ مالک مکان زبردستی اس سے طباق چھین کر دوسروں کے سامنے رکھ دے گا تم ہی سوچو کہ اس وقت اس کو کیسی ندامت ہوگی۔ اسی طرح دنیا حق تعالیٰ کی مہمان سرا کی جگہ ہے۔ اس سے حق تعالیٰ کا یہ مقصود ہے کہ مسافرانِ آخرت آئیں اور بقدر ضرورت اس طرح نفع اٹھائیں جس طرح مستعار چیزوں سے نفع اٹھاتے اور اپنی حاجتیں رفع کرتے ہیں۔ اس کے بعد بخوشی خاطر اس کو دوسروں کے حوالہ کر کے اپنا راستہ لیں۔ اور آخرت میں آ پہنچیں۔ پس مستعار چیز سے دل لگانا حقیقت میں چلتے وقت اپنے آپ کو شرمندہ و رنجیدہ بنانا ہے۔ پس چاہیے کہ دنیا چھوڑ کر آخرت کی طلب کریں مگر اس کے حصول کے لیے جمیع طاعاتِ مرضیہ کا اختیار کرنا اور تمام ذنوب کا چھوڑنا شرطِ لازمی ہے۔

طریقِ علاج | موت[2] کو کثرت سے یاد کیا کریں اور بہت لمبی لمبی منصوبے اور سامان نہ کریں اور نہ سوچیں۔ خداوند تعالیٰ[3] کی طاعت کو اپنے اوپر لازم کریں گو تکلف سہی۔ خداوند تعالیٰ کی طاعت میں اثر خاص ہے کہ اس سے فکر پیدا ہوگی اور نیکی کے پیدا ہونے سے تمام کام درست ہو جائیں گے۔

آٹھویں فصل حرص کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۔ الآیۃ

اپنی آنکھیں اس چیز کی طرف مت بڑھاویں جس سے ہم نے تمتع دیا ان کافروں کے مختلف گروہوں کو آرائش زندگانی دنیا کی۔

لہ بیان القرآن [illegible] سلہ تعلیم الدین ص [illegible] سلہ [illegible] تفسیر [illegible] سلہ تعلیم الدین ص [illegible]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

یھرم ابن آدم ویشب منه	آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے اور اس کی دو چیزیں
اثنان الحرص علی المال والحرص	بڑھتی رہتی ہیں مال پر حرص کرنا اور عمر
علی العمر متفق علیہ	پر حرص کرنا۔

حقیقتِ حرص

توجہ الی الدنیا (یعنی) طلب کمال دنیویہ کے ساتھ مشغول ہونا حرص ہے اگر کسی توجہ کو کسی دوسری طرف پھیر دیا جائے تو توجہ الی الدنیا نہ رہے گی۔ پھر جس چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جاوے گا اگر وہ طبعاً بھی محبوب ہو تو اس کی طرف توجہ اشد ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ توجہ الی الدنیا کا ازالہ بھی آدمی ہی کا ہوگا پس اپنی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کرو اور چونکہ حق تعالیٰ سے طبعی تعلق ہے اس لئے یہ توجہ اشد و اکمل ہوگی تو جتنی توجہ حق تعالیٰ کی طرف ہوگی اتنی ہی توجہ دنیا سے ہٹے گی۔[1]

حرص تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ ایسا مرض ہے کہ اس کو ام الامراض کہنا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے جھگڑے فساد ہوتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے متعدد برائیاں ہوتی ہیں۔ اگر لوگوں میں حرص مال نہ ہو تو کوئی کسی کا حق نہ دبائے۔ بدکاری کا منشا بھی لذت کی حرص ہے۔ اخلاق رذیلہ کی اصل کبر ہے اور کبر ہوس جاہ ہی کا نام ہے۔ پس کبر کا منشا بھی حرص ہوا۔ انسان کا طبعی خاصہ ہے کہ اگر اس کے پاس مال کے دو جنگل بھی ہوں جس میں سونا چاندی پانی کی طرح بہتے ہوں۔ پھر بھی وہ تیسرے کا طالب ہوگا۔ جتنا ہوس کو پورا کرو گے اتنا ہی بڑھے گی۔ جیسے خارش والا جتنا کھجلاتا ہے خارش بڑھتی رہتی ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ کیا انسان کی ہر آرزو پوری ہو سکتی ہے (یعنی کبھی پوری نہیں ہو سکتی) یہی وجہ ہے کہ حریص کو کبھی راحت نہیں مل سکتی اس کے پیٹ کو سوائے قبر کی مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی ؎

گفت چشم تنگ دنیا دار را
یا قناعت پر کند یا خاک گور[2]

---

۱ کمالات اشرفیہ صفحہ ۹۲ ۲ کمالات اشرفیہ صفحہ ۹۵

کیونکہ) ایک آرزو ختم نہیں ہوتی، دوسری شروع ہو جاتی ہے اور تقدیر پر راضی نہیں تو ہر کام میں یوں چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے اور سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار ہے اس لیے نتیجہ اس کا پریشانی ہی پریشانی ہے گو ظاہر میں اولاد اور مال سب کچھ ہے مگر اندرونی حالت سب کی پریشانی ہے۔

طریق کار اور علاج خرچ کو گھٹائیں تاکہ زیادہ آمدنی کی فکر نہ ہو اور آئندہ کی فکر نہ کریں کہ کیا ہوگا اور یہ سوچیں کہ حریص آدمی ہمیشہ ذلیل و خوار رہتا ہے (یہاں حب دنیا کا بیان بھی مطالعہ میں رکھیں، انشاء اللہ مفید ہوگا)۔

نویں فصل حسد کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝[1] (ترجمہ) اور میں حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے پناہ مانگتا ہوں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَحَاسَدُوا (رواہ البخاری) آپس میں حسد نہ کرو۔

حقیقت حسد کسی شخص کی اچھی حالت کا ناگوار گزرنا اور یہ آرزو کرنا کہ یہ اچھی حالت اس کی زائل ہو جائے (یہ حسد ہے) اس کے تین درجے ہیں۔ ایک کیفیت نفسانیہ ہے جس میں انسان معذور ہے، ایک اس کے مقتضا پر عمل ہے کہ اس میں شخص ماخوذ (یعنی گنہگار) ہے، ایک اس کے مقتضا کی مخالفت ہے اس میں انسان ماجور (یعنی ثواب پانے والا) ہے۔

۱۔ [illegible] ص۱۹ ۲۔ تعلیم الدین ص۱۲ ۳۔ تعلیم الدین ص۱۱ ۴۔ [illegible] ص۱۹۹

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندہ پر نعمت دیکھ کر حسد کرنے والا گویا میری اس تقسیم سے ناراض ہے جو میں نے اپنے بندوں میں فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑیوں کو جلا دیتی ہے۔ البتہ ایسے شخص پر حسد کرنا جائز ہے جو اللہ کی عطا ہوئی نعمت کو ظلم یا معصیت میں خرچ کر رہا ہو۔ مثلاً مال کو جوا و شراب و زنا کاری میں اڑا رہا ہو۔ لہٰذا ایسے شخص سے مال چھن جانے کی آرزو کرنا گناہ نہیں ہے کیونکہ یہاں درحقیقت مال کی نعمت کے چھن جانے کی تمنا نہیں ہے بلکہ اس فسق و معصیت کے بند ہو جانے کی آرزو ہے۔ اور اس کی شناخت یہ ہے کہ اگر وہ شخص معصیت چھوڑ دے تو اب اس نعمت کے جاتے رہنے کی آرزو بھی نہ رہے۔

حسد کا باعث عموماً یا تو تکبر و غرور ہوتا ہے یا عداوت و خباثت نفس۔ کہ بجائے رحمت خدا کی عامت میں بخل بھی کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح یہ کسی کو کچھ نہیں دیتا اسی طرح حق تعالیٰ بھی دوسرے کو کچھ نہ دے۔ البتہ دوسرے کو نعمت میں دیکھ کر حرص کرنا اور چاہنا کہ اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے اور مجھے بھی ایسی ہی حاصل ہو جائے، غبطہ (رشک) کہلاتا ہے۔ اور غبطہ شرعاً جائز ہے۔

حسد قلبی مرض ہے۔ اس میں دین کا بھی نقصان ہے اور دنیا کا بھی۔ دین کا نقصان تو یہ ہے کہ اس کے کیے ہوئے نیک اعمال ساقط ہو جاتے ہیں۔ نیکیاں چلی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنا ہوا ہے اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ حاسد ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا اور اسی فکر میں گھلتا رہتا ہے کہ کسی طرح فلاں شخص کو ذلت و افلاس نصیب ہو۔ اس طرح عذاب آخرت سے پہلے دنیا میں قناعت و آرام کی زندگی کو رخصت کر کے ہر وقت کی خلش اور بے چینی کو خود خرید لیا۔

طریق کار اور علاج

حسد کا مقصود تو یہ ہے کہ محسود یعنی جس پر حسد کیا جائے اس کی عیب جوئی کریں اور رنج و غم کے صورت رات دن بنیں۔ لہٰذا نفس پر جبر کریں اور قصداً اس کے منشا کی مخالفت کر کے اس کی

اور اگر مخلوق کو اس لیے راضی کیا جا رہا ہے تاکہ وہ ہمارے معتقد رہیں، ہمارے مرید زیادہ ہوں تو یہ ریا ہے کیونکہ یہ نیت معصیت ہے اس واسطے کہ عین عبادت کے وقت اس کی نظر مخلوق پر رہی، اور ان کی نظر میں معظم رہنا چاہا۔

صوفیاء[1] نے کہا ہے ترک العمل للقوم ریاء (یعنی لوگوں کی وجہ سے کام نہ کرنا اور چھوڑ دینا ریا ہے) اور اس کو ظاہر کرتے ہیں: والعمل للقوم ریاء (یعنی لوگوں کو دکھلانے کے لیے کام کرنا ریا ہے) اور محققین کے نزدیک عبادت کے اخفاء کا اہتمام کرنا بھی ریا ہے۔ کیونکہ اخفاء عن الخلق (لوگوں سے چھپانے) کا اہتمام وہی کرے گا جس کی نظر مخلوق پر ہو، اور جس کی نظر مخلوق سے اٹھ جاوے اور اپنے سے بھی اٹھ جاوے کہ عبادت کو اپنا عمل نہ سمجھے بلکہ محض توفیق حق سمجھے کہ منجانب اللہ ہو رہے ہیں کام۔ اپنے ہاتھ میں خود کچھ نہیں کر سکتا وہ اخفاء کا اہتمام نہ کرے گا کیونکہ جب وہ مخلوق کو لاشی محض سمجھے گا تو ان سے اخفاء کیوں کرے گا۔

ریا کی اصلیت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عبادت اور عمل خیر کے ذریعہ سے وقعت اور منزلت کا خواہاں ہو، اور یہ عبادت کے مقصود کے بالکل خلاف ہے کیونکہ عبادت سے مقصود حق تعالیٰ کی رضامندی ہے۔ اور اب چونکہ اس مقصود میں دوسرا شریک ہو گیا کہ رضائے خلق اور حصول منزلت مقصود ہے۔ لہٰذا اس کا نام شرک اصغر ہے۔

ریا پانچ[2] طرح سے ہوا کرتا ہے:—

اوّل بدن کے ذریعہ سے مثلاً ضعف اور غنودگی ظاہر کی جائے تاکہ لوگ روزہ دار اور شب بیدار خیال کریں۔ یا شکل ایسی صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کو آخرت کی بڑی فکر ہے۔ دین میں مشغول ہے۔

دوم ہیئت کے ذریعہ سے۔ مثلاً رفتار یا گفتار میں نرمی ظاہر کرنا۔ سر جھکانا، سجدہ کے نشان کا باقی رکھنا، اور ایسی صورت بنانا جس سے لوگ سمجھیں کہ صاحب وجد ہیں یا مراقبہ میں مشغول ہیں، دریائے فکر کے اندر غرق ہیں۔

---

[1] اشرف السوانح ص ۱۳۰ [2] تبلیغ دین ص ۹۵۔

سوم۔ شکل و شباہت اور لباس میں، مثلاً صوف اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننا۔ پنڈلی تک پائنچہ چڑھانا، کپڑوں کا بوسیدہ اور میلا کچیلا رکھنا۔ تاکہ لوگ صوفی سمجھیں حالانکہ تصوف سے اتنے کورے ہیں کہ اس کی حقیقت بھی نہیں جانتے۔ یا چغہ یا ڈھیلی آستینوں کا جبہ پہننا۔ تاکہ لوگ عالم سمجھیں۔ بعض لوگ امیروں اور تاجروں میں وقعت پیدا کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، اور سوچتے ہیں کہ اگر پھٹے پرانے کپڑے پہنے تو امرا کی نظروں میں وقعت نہ رہے گی اور اگر لباس فاخرہ پہنا تو لوگ زاہد اور صوفی نہ سمجھیں گے۔ لہٰذا وہ بیش قیمت کپڑوں کو گیروا یا آسمانی (یا سبز وغیرہ) رنگ کا رنگوا لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی قیمت دیکھئے تو شاہانہ لباس کے برابر ہے اور رنگ و روپ درویشانہ اور صوفیانہ ہے۔ اس طرح اپنا مطلب حاصل کرتے اور ریاکار بنتے ہیں۔

چہارم۔ گفتگو اور زبان سے ریا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض دنیادار واعظ مقفیٰ اور مسجع عبارتیں بنا بنا کر سلف صالحین کی نقل اتارتے اور محض دکھلاوے کی غرض سے کبھی آواز کا لہجہ بدلا بناتے ہیں اور کبھی غمگین کہ دل میں تو خاک بھی اثر نہیں۔ مگر بناوٹ اور تصنع یوں بنا رہا ہے کہ بڑے عالم اور صوفی ہیں۔ اسی طرح مثلاً حفظ حدیث اور مشائخ اور علما کے زمانے سے ملاقات کا دعویٰ اور اظہار کرنا یا مثلاً کسی حدیث کے متعلق صحیح نہ ہونے یا ضعیف ہونے کا جلدی سے حکم لگا دینا، کہ لوگ محقق اور محدث سمجھیں۔ یا بدکاری اور معصیت کے تذکرے پر زبان سے آہ اور ہائے افسوس کے کلمے نکالنا، یا خلاف شرع باتوں سے نفرت ظاہر کرنا اور کڑھنا۔ حالانکہ ان کے دل میں رنج یا نفرت کا اثر نام کو بھی نہیں ہوتا بلکہ محض یہ اس غرض سے ہوتا ہے کہ لوگ ان کو پارسا اور رشد والا متبع شریعت سمجھیں۔

پنجم۔ عمل میں ریا۔ مثلاً قیام اور رکوع و سجدہ میں دیر تک رہنا، سر جھکانا تاکہ لوگ عابد و زاہد سمجھیں حالانکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان کے دل ان خوبیوں سے بالکل کورے اور خالی ہیں۔ اور اس کی شناخت یہ ہے کہ جب اکیلے نماز پڑھتے ہیں تو تھوڑا سا چھوڑ دیتے ہیں اور اگر کسی کو معلوم کرلیں کہ وہ ان کی نماز کو دیکھ رہا ہے تو فوراً آہستگی اور وقار کے ساتھ نماز کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے لگتے ہیں۔ تاکہ دیکھنے والا سمجھے کہ ان کی نماز خشوع اور خضوع سے بھری ہوئی ہے۔

باہوا و آرزو کم باش دوست — چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

تا ہوا تازہ است ایماں تازہ نیست — چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

تازہ کن ایماں نہ از گفت زباں — اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

خواہش نفسانی ایسی بُری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابیاں اور دین کی بھی۔ صدہا مصیبتیں ہیں جملہ شرور کی جڑ اگر ہے تو خواہش نفسانی ہی ہے۔ یہی روکنے کی چیز ہے۔ دیکھئے اگر نفس کو روکا نہ جائے تو دنیا اجاڑ ہو جاتا ہے۔ اسی نکتہ کو سب نے سمجھا ہے حتیٰ کہ حاکم جس کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جن کو لوگ کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے نزدیک باعث مضرت ہیں۔ دنیاوی مصلحتوں کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پوری کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھئے کیا ہو۔ ڈاکو کو ڈاکہ ڈالنے دے۔ چوروں کو چوری کرنے دے۔ زبردستوں کو زیردستوں پر ظلم کرنے دے۔ غرض ہر شخص کو کھلی بالعموم کر دے کہ اپنی خواہش کے موافق جو چاہو کرو۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس لطف سے زندگی بسر ہوگی۔ قانون کیا ہے۔ ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے فرض کرو کسی کو روپیہ کی ضرورت ہے کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے تو اس کو کیوں منع کرتے ہو اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مضرت ہے کہ اس کے مقابلہ میں ضرورت کا خیال بھی نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح دنیاوی انتظاموں کو دیکھ کر یہ بات صاف نکلتی ہے کہ خواہش نفس ہی روکنے کی چیز ہے۔

دیکھئے نماز قضا ہوتی کیوں ہے اگر غور کیا جائے تو سبب اس کا اکثر یہی نکلے گا کہ منجملہ افراد خواہش نفس کے ہو گا۔ فرض کیجئے نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہوا کہ نیند آ رہی تھی۔ عشاء کا وقت ہوا مگر نماز میں خلل گوارا نہ ہوا سو کر صبح کر دی۔ آرام اور تن پروری خواہش نفسانی ہی ہے۔ تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی کسی دوسرے کام میں لگا ہوا ہو۔ اس کے ادھورے بیچ میں رہ جانے سے نقصان مالی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس نقصان کو گوارا نہ کیا اور نماز میں تاخیر کر دی۔ یہ سبب بھی ایسا ہے کہ منجملہ خواہشات نفسانی ہے۔ اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جبھی ہوگی کہ دوسری طرف

لہ وعظ سیرۃ صفحہ ۲۹۔

یہ کام حق تعالیٰ کی رضا کے خلاف تو نہیں اور یہ پیر شدید ہے یا عذر پذیر اس کے ترک کے لیے خوف ضروری ہے اس لیے قرب الٰہی کی تحصیل ضروری ہے۔

طریقِ علاج | زیادہ ذکر کرنا چاہیے۔ اس کا طریق مجاہدہ کے بیان میں معلوم ہو چکا۔

بارھویں[13] فصل عجب کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ[1] — جب کہ تم کو تمہارا زیادہ ہونا بھلا معلوم ہوا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

وَاَمَّا الْمُهْلِكَاتُ فَهَوًى — رہے مہلکات سو وہ خواہش ہے جس کی
مُتَّبَعٌ وَشُحٌّ مُطَاعٌ وَ — پیروی کی جائے اور بخل ہے جس کے موافق عمل
اِعْجَابُ الْمَرْءِ بِنَفْسِهٖ وَ — کیا جائے اور آدمی کا اپنے آپ کو اچھا سمجھنا
هِيَ اَشَدُّهُنَّ[2] — اور یہ سب سے بڑھ کر ہے۔

حقیقتِ عُجب | اپنے کمال کو اپنی طرف نسبت کرنا اور اس کا خوف نہ ہونا کہ شاید سلب ہو جائے یہ عجب ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ نفس کا ایک مخفی کید ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ممتاز و برتر رہے اور اس میں اس کو حظ آتا ہے سو یہ عجب ہے۔ اور عجب ایسی بری چیز ہے کہ جس وقت کوئی شخص اپنی نظر میں پسندیدہ ہوتا ہے اسی وقت اللہ تعالیٰ کی نظر میں ناپسندیدہ ہو جاتا ہے۔ البتہ[3] اگر اللہ کی نعمت پر خوش ہووے اور اس کے چھن جانے کا خوف بھی دل میں رکھے اور یوں سمجھے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے فلاں علم یا عمل کے سبب مجھ کو عنایت فرمائی ہے اور وہ مالک و مختار ہے جس وقت چاہے اس کو مجھ سے لے لے تو یہ خود پسندی اور عجب نہیں ہے۔ کیونکہ خود پسند شخص نعمت کا منعمِ حقیقی کی جا

[illegible]

غصب کرنا ہی بھول جاتا ہے اور جملہ نعمتوں کو اپنا حق سمجھنے لگتا ہے۔

عجب[1] میں صرف ایک شے کم ہے۔ یعنی اس میں دوسروں کو چھوٹا سمجھنا نہیں صرف اپنے کو بڑا سمجھتا ہے باقی سب اجزا رہتے ہیں (جو تکبر کے ہیں) اس میں بھی حقیقت اور صورت کے ویسے ہی درجے اور وہی احکام (اور طریق علاج ہے)۔

حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اور اتراتا ہوا چلتا ہے۔ (دنیا میں) کے روز خداوند کریم سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ (مسند احمد)

طریق علاج اس[2] کمال کو عطائے خداوندی سمجھے اور اس کی استعداد اور قدرت کو یاد کرکے ڈرے کہ شاید سلب ہو جائے۔

تیرھویں[3] فصل غضب کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (الآیۃ)

اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں (کی تقصیرات) سے درگزر کرنے والے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لَا تَغْضَبْ (رواہ البخاری) غصہ مت کرو۔

حقیقت غضب خون قلب کا بدلہ لینے کے لیے جوش مارنا غضب ہے۔ (اس کے درجات، شریعت اور اخلاق کے بیان میں ملاحظہ ہوں)۔

---

[1] کمالات اشرفیہ ص [illegible] [2] تعلیم الدین ص [illegible] [3] بیان القرآن ص [illegible] ج ۲ [4] تعلیم الدین ص [illegible]

باب اوّل۔ ثمرۂ من العبد یعنی عبدیت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ الآیۃ	اور جن اور انسان کو میں نے صرف اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔

حقیقتِ عبدیت

ایمان و عمل[1] کے کمال کا نام عبدیت یا غلامی ہے۔ یعنی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو بے چون و چرا ماننا اور کرنا اور اس کی رضا اور خوشی میں اپنی خوشی و خواہش و مرضی کو فنا کر دینا، بلکہ اگر غور کیا جائے تو خدا کے ساتھ تو ہم کو حقیقی غلامی کا تعلق ہے۔ انسانی غلامی سے تو آزادی ممکن ہو سکتی ہے برخلاف خدا کی غلامی کے کہ کسی کا طوقِ بندگی گردن سے کبھی نہیں نکل سکتا کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی صورت یہی ہے کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور وہ خدا نہ رہے۔

انسان کو جس بات کے حاصل کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے وہ یہی عبدیت کی حالت ہے یعنی دنیا میں انسان کو اس لیے بھیجا ہے کہ وہ اوامر اور نواہی کو پورا کر کے عبدیت حاصل کرے (اور اوامر و نواہی کا تعلق ہی زیادہ تر افعال و اعمال سے ہے۔ خواہ وہ اصطلاحی عبادات ہوں یا معاملات و معاشرات و اخلاق سب کو پورا کرنا ہی عبدیت یا بندگی ہے) اور کمالِ عبدیت یہ ہے کہ بندہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور حق تعالیٰ جو تصرف اس کے اندر کرے اس پر راضی رہے۔

پس[2] بحیثیت عبد کی حیثیت سے ہم کو امر و نواہی کے اسرار و مصالح معلوم کرنے کا حق ہی نہیں نہ اس کی فکر میں پڑنا چاہیے۔ بس جو حکم ہو بے چون و چرا مانا اور پورا کرنا اور اس کو عین حکمت و مصلحت جاننا چاہیے بلکہ اگر خلافِ مصلحت بھی ہو تب بھی دم مارنے کی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ہم عبد یا غلام ہیں۔

---

[1] تصوف و سلوک صفحہ ۱۹۰ [2] انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۲۵ [3] تصوف و سلوک صفحہ ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۰۴ ملخصاً

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ پر اشکال کیا گیا کہ جن و انس کی تخصیص کی کیا وجہ۔ عبادت تو ساری مخلوق ہی کرتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک نوکر ہے ایک غلام ہے۔ نوکر کا کام معین ہوتا ہے خواہ ایک یا متعدد، جیسے باورچی کے لیے کھانا پکانے کی خدمت معین، یا مکان پر بازار اور گھر کے کام کے لیے کوئی نوکر ہے تو جس خدمت کے واسطے یہ نوکر ہیں ان سے وہی خدمت لی جا سکتی ہے۔ نوکر بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں حتیٰ کہ اگر آقا باورچی سے کہے کہ یہ خط گنگوہ (یا کسی دوسرے شہر) لیے جاؤ تو نوکر (باورچی) ضابطہ سے انکار کر سکتا ہے۔

اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں۔ تمام خدمات اس کے ذمہ ہیں جس کا حکم ہو جائے چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ایک وقت میں آقا کی وردی پہن کر آقا کا قائم مقام ہو کر جلسہ میں سوار ہو کر جانا پڑتا ہے۔ غرض غلام کو کسی وقت کسی خدمت سے بھی انکار نہ ہوگا۔ اسی طرح جن و انس کے سوا تمام مخلوق کی خدمت معین ہے۔ ہر شے مخلوقات میں سے ایک خاص کام پر مقرر ہے کہ اس کے سوا ان سے دوسرا کام نہیں لیا جاتا مگر انسان کی کوئی خدمت مقرر نہیں۔ چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے اور ایک وقت میں نماز پڑھنا بھی عبادت ہے۔ مثلاً جماعت تیار ہے اور پاخانہ کا تقاضا ہو تو اس وقت پیشاب پاخانہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا ممنوع ہے اس وقت بیت الخلاء جانا ہی عبادت ہے۔ ایک تو یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہوتی ہے کہ مظہر حق بنا ہوتا ہے اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں۔ غرض یہ شان غلام کی ہوتی ہے یہی انسان کی ہے۔ عبد شاہ کے لیے انسان کو ہے باقی تمام مخلوق ذاکر و شاغل ہے مگر عابد صرف انسان ہے۔ لہذا اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ وہ کسی خاص حالت اور کسی خاص کام کو اپنے لیے تجویز نہیں کر سکتا۔ بلکہ حضرت حق جس حالت میں بھی رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہیے۔ کمبل اڑھائیں تو کمبل اوڑھے، دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے۔ جو کچھ رکھیں تو بندہ کا ہے۔ کمبل کھدر میں زندگی تھی۔ یہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی۔

غرض بندہ ہونے کی عبدیت ہے اور اپنی تجویز سے امتیازی شان بنانا عبدیت کے بالکل

باب دوم ثمــــرہ من الحق

پہلی فصل رضائے الٰہی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۔ الآیۃ — اور اللہ کی رضا بڑی چیز ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ رِضَاكَ وَالْجَنَّةَ ۔ الحدیث — اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں۔

حقیقتِ رضا

حق تعالیٰ کو بندہ کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق ہو جانا جس کا خاصہ ایک خاص انجذاب ہے، جس کے لوازم میں سے سہولتِ طاعت اور حضورِ دائم ہے اور یہ محض موہوب ہے۔ کیونکہ کسی عمل صالح میں یہ خاصیت نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کافی ہو سکے گو عادۃ اللہ یہ ہے کہ محض اپنے فضل سے اپنی رضا کو اعمالِ صالحہ پر مرتب فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا، بلکہ حق تعالیٰ کے فضل سے جائے گا اور یہ نسبت مع اللہ عادۃً پھر کبھی زائل نہیں ہوتی۔ جیسے بالغ ہونے کے بعد صفتِ بلوغ کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اسی مسئلہ کو صوفیہ نے بعنوان فنا تعبیر کر کے فرمایا ہے کہ الفانی لا یرد یعنی فانی واصل کبھی مردود نہیں ہوتا۔ اگر یہ شبہ ہو کہ بعد وصول و حصولِ نسبت کے بھی تو معاصی کا صدور ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے پھر نسبت دائمی کا تحقق کیا؟ سو اس کو یوں سمجھو کہ گہری دوستی کے بعد یہ ضروری نہیں کہ کبھی شکر رنجی بھی نہ ہو، گو کبھی شکر رنجی بھی ہو جاتی ہے لیکن تدارک کے بعد پھر ویسا ہی تعلق ہو جاتا ہے۔

۱۔ التوبۃ ۲۔ الحاکم فی صحیحہ عن عائشہ

مع اللہ کی یہی حقیقت ہے۔ جب تک عمل میں لگے ہو رضا حاصل ہے اور جب رضا حاصل ہے تو سب کچھ ہے۔ چاہے وصال ہو یا نہ ہو۔ کیفیات بدلیں یا نہ بدلیں

طریق کار | طاعات میں صرف خدا کو مطلوب سمجھیں۔ کیفیات کو ہرگز مطلوب نہ سمجھیں بلکہ جس کو وصال سمجھ رہے ہیں، اس پر بھی نظر نہ کریں کہ ہر گز یہ وصال میسر ہوگا یا نہیں۔ صرف عمل کو مقصود سمجھیں۔ ہمت سے اسی میں لگے رہیں اور زبان حال سے یوں کہتے رہیں ؎

یابم او را یا نیابم جستجوئے می کنم   حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم
فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

اور ؎

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق   ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست
ارید وصاله ویرید ہجری   فاترک ما ارید لما یرید

دوسری فصل قرب و وصول کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ؎

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ   آگے بڑھ جانے والے، آگے بڑھ جانے
اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ۔ الآیہ   والے ہی تو مقربین ہیں۔

حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ؎

من تقرب الی شبرا تقربت   جو شخص میری طرف ایک بالشت چل کر آتا ہے
الیہ ذراعا ومن تقرب الی   میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں اور جو میری

---

[1] تعلیم انام ص۳۶ [2] الکمال فی الدین ص۹۷

قرب وہ ہیں جو صورت جسم پر موقوف ہیں۔ یہ روح مجرد کو بدون جسم کے کیونکر حاصل ہوتے۔

وہاں چہرہ ہی نہیں تو نماز میں وضع الجبہ کیسے ہوتا۔ اس کو بھوک پیاس نہیں تو روزہ کیسے ہوتا اور طواف بیت اللہ کیسے ہوتا وغیرہ وغیرہ تو روح ان اقسام قرب کی تحصیل سے بالکل عاجز تھی۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا میں آنا گو بصورت عتاب تھا مگر حقیقت میں یہ عنایت تھی کہ حق تعالیٰ نے یہاں بھیج کر ہمارے لیے ترقی کی راہیں کھول دیں۔ اب تم جتنی ترقی چاہو۔ اعمال کے ذریعہ کر سکتے ہو۔ کوئی اس کے لیے حد ہی نہیں کسی درجہ پر پہنچ کر ترقی بند نہیں ہوتی۔ عاشق کو بھلا اس پر کہاں چین آ سکتا ہے کہ محبوب کے سامنے ہو اور یہ کہہ دے کہ خبردار آگے نہ بڑھنا۔ وہ تو چاہتا ہے کہ محبوب سے لپٹ جاؤں۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ وہ مجھ سے لپٹ جائے۔ لپٹنے میں یہی تو ہوتا ہے کہ محبوب و عاشق کو غایت قرب کے ساتھ اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے سو قرب تو نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ وغیرہ سے ثابت ہو چکا۔ رہا احاطہ سو وہ بھی موجود ہے خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ — بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہیں

یہ بڑی تسلی کی بات ہے۔ ان جذبات کو اہل عشق خوب سمجھتے ہیں۔ گو مجاز ہی کی ہوں۔[1]

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی مندرجہ بالا میں واضح کر دیا کہ جو میری طرف ذرا بھی توجہ کرتا ہے میں اس کی طرف دو چند اور سہ چند توجہ کرتا ہوں واقعی سچ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اتنی توجہ اور رحمت نہ فرماتے تو انسان کی کیا مجال تھی کہ ان تک پہنچ سکے۔ آخر انسان کو ان سے نسبت ہی کیا ہے۔ یہ انہی کی عنایت ہے جو کچھ حصہ معرفت وغیرہ کا انسان کو عطا ہو جاتا ہے واقعی وہ غیر متناہی مسافت ہے جس کا قطع کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لیکن وہ کیونکر قطع ہوتی ہے۔ سنیے ؎

خود بخود آں شہ ابرار بہ بر مے آید — نہ بزور نہ بزاری نہ بزر مے آید

۱؎ تصوف و سلوک صفحہ ۲۲۳۔ ۲؎ الکمال فی الدین صفحہ ۹

ان حضرات نے حسرت بطور خلاف سنت کے ترک کیا۔ بخلاف جہلاء کے کہ اس کو دین و عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں۔

بہرحال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق ادا کرنا بھی ضروری ہے اسی لیے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی حد مقرر کر دی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ صحابی رات کو بہت جاگتے تھے حضرت سلمان نے ان کو روکا۔ آخر معاملہ دربار نبوی تک پہنچ گیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں۔ اور یہ ارشاد فرمایا ان لنفسك عليك حقا الخ (یا تمہارے نفس کا تجھ پر حق ہے۔)

اور راز اس میں یہ ہے کہ کوئی چیز حتیٰ کہ اپنا نفس بھی ہمارا ملک حقیقی نہیں کہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں بلکہ یہ سب سرکاری چیزیں ہیں۔ سر کو مگر حد سے زیادہ اس سے کام لینا یہ سرکاری اصول کے خلاف اس کی بے قدری کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح ہاتھ پاؤں دماغ یہ سب سرکاری مشینیں ہیں۔ جن کو ہمارے سپرد کیا گیا ہے اگر ہم اپنی بے اعتدالی سے ان کو بگاڑیں گے تو خود مورد عتاب و مستوجب عذاب بنیں گے اور اگر اپنے دل و دماغ اور آنکھ کی حفاظت اس نیت سے کریں گے کہ یہ ہمارے مولیٰ کی سپرد کی ہوئی چیزیں ہیں۔ ان کی عزت درست۔ خدمت و حفاظت ہم پر بوجہ بندہ خادم ہونے کے ضروری ہے تو اس میں بھی ثواب ملے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سید العاشقین ہیں مگر آنکھوں کی آپ اتنی حفاظت فرماتے تھے کہ سرمہ کی تین سلائی ایک آنکھ میں لگاتے تھے اور تین سلائی دوسری میں۔ اسی طرح کبھی آپ سے یہ ثابت نہیں کہ رات بھر جاگے ہوں اور امت کے لیے ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہاری جان کا بھی تم پر کچھ حق ہے اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر کچھ حق ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ہماری نہیں ورنہ ہم کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہوتا۔ بلکہ سرکاری چیزیں ہیں جن کے کچھ حقوق سرکار نے مقرر فرما دیے ہیں جن کی رعایت ہمارے ذمہ ضروری ہے۔ اب میے عارف اپنی جان میں خلاف حکم کوئی تصرف نہیں کرتا۔ جہاں حکم شریعت ہوتا ہے۔ وہاں تو وہ جان کی پرواہ نہیں کرتا اور جہاں حکم نہیں ہوتا یا ممانعت ہوتی ہے۔ وہاں جان کی حفاظت کرتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے جس کو ترمذی

۱؎ سیرۃ الصوفی ص ۸ ۲؎ تقلیل الطعام ص ۲۹، ۱۱

نے روایت کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان کے لیے اپنے نفس کو ذلیل کرنا مناسب نہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان اپنے کو خود ذلیل کیسے کرتا ہے۔ فرمایا ایسی بلا اپنے سر لے جس کے تحمل کی اسے طاقت نہیں۔ سبحان اللہ! کیا عجیب تعلیم ہے کہ اتنا بار اپنے ذمہ لو جس کو کر سکو۔

قدم بکار زچون طلب باشد قوت بود — مگر تو بیاد کنی شرط مروت نبود

طفل را گر ناں دہی برجائے شیر — طفل مسکیں را ازاں ناں مردہ گیر

اور فرماتے ہیں۔

چار پا را قدر طاقت بار نہ — بر ضعیفاں قدر ہمت کار نہ

حضرات ازواجِ مطہراتؓ سے بعض صحابہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات پوچھے۔ انھوں نے ظاہر فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ آپ رات کو کچھ دیر سوتے ہیں کچھ دیر جاگتے ہیں کچھ دیر عبادت کرتے ہیں کچھ وقت بیویوں کی باتوں میں صرف کر دیتے ہیں۔ کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ ان حضرات صحابہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستور العمل کو عمل دیکھ کر قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ حضور کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ تقلیلِ عمل مضر نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کے سب اگلے پچھلے گناہ بخش دیے ہیں لیکن ہم کو بوجہ اپنے نقصانِ مرتبہ کے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ اس لیے ایک نے قسم کھائی کہ میں تو آج سے تمام رات نہ سوؤں گا۔ یہ عمل شاق تو اس نے اختیار کیا۔ دوسرے بولے کہ میں ساری عمر روزے ہی رکھا کروں گا۔ تیسرے بولے کہ میں کبھی نکاح ہی نہ کروں گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور ان حضرات کی غلطی ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ تم نے ایسا ایسا کہا۔ یاد رکھو میں تم سے زیادہ حق تعالیٰ سے ڈرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں کبھی روزہ رکھتا ہوں کبھی افطار کرتا ہوں اور کچھ جاگتا ہوں کچھ سوتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہ میری سنت ہے) اور جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔

ـــہ تقلیل الانام ص [illegible]

اس کو وہ ثمرات حاصل نہیں جو مجاہدہ پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً غلبۂ ذوق، شوق، یکسوئی وغیرہ نہیں تو یہ شخص یہ سمجھ رہا ہے اس کو مقصود حاصل ہے اور جو مقصود ہے وہ مقصود نہیں اس کا غم کرے۔

شریعت نے جو مجاہدات میں محض ترک پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی مشروع کیا۔ اس میں راز یہی ہے کہ اگر مجاہدہ میں صرف ترک پر اکتفا کیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی عمل تعلق مع اللہ کا بڑھانے والا نہ کیا جائے تو نتیجہ مجاہدہ کا یہ ہوگا کہ قلب تعلقات غیر سے خالی ہونے کے ساتھ تعلق مع اللہ سے بھی خالی ہوگا اور اس صورت میں شیطان کا قلب پر قبضہ جما لینا آسان ہو جائیگا اسی واسطے شریعت نے ہر مجاہدہ میں اس کی رعایت کی ہے کہ تعلقات مباحہ کو ترک کر کے اعمال میں مشغول کر دیا ہے تاکہ قلب خالی نہ ہو۔[1]

احیاء العلوم (مصنفہ حضرت امام غزالیؒ) اور دیگر متقدمین ائمہ کرام و بزرگان دین کی کتابوں میں جو مجاہدات کے طریقے تحریر کئے گئے وہ ان کے زمانہ کے مناسب کئے ہیں۔ ان میں اکثر مجاہدات اسی زمانہ متقدمین کے مناسب ہیں ناکس زمانہ متاخرین کے موافق نہیں۔ اصول تو اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اصول کبھی نہیں بدلا کرتے۔ مگر طرق معالجہ تبدل زمان سے بدل جاتے ہیں۔ لہذا اس کو جانتے ہیں جو کہ ان کے موافق عمل کی ہمت آج کل کے طبائع میں ہے نہیں تو اس سے بجز پریشانی پڑھنے کے اور کچھ نفع نہ ہوگا بلکہ جہاں تک ہو سکے بلا ضرورت نفس کو مشقت میں ڈالنے کی بجائے سہولت و راحت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی محبت قلب میں پیدا ہو اور معصیت میں نشاط ہے جو کسی عبادت سے الٹ معصیت کے پاس نہ پھٹکیں اور نفس پر ہر وقت نگرانی رکھیں۔ نہ کم کھانے کی ضرورت نہ کم سونے کی۔ یہ دونوں مجاہدے آج کل متروک ہیں کیونکہ طبائع میں پہلے ہی سے ضعف غالب ہے۔ ہاں کم بولنا اور کم ملنا جلنا ضروری ہے لیکن نہ اتنا کہ جس سے قلب میں وحشت پیدا ہو جائے۔[2]

حاصل کلام! خاص مشہور مجاہدات اربعہ یہ ہیں۔ قلت طعام، قلت منام، قلت کلام، قلت اختلاط مع الانام۔ ان میں مقصود تقلیل ہے وہ بھی بشرط ضرورت اور بقدر ضرورت، اور

۱؎ تعلیم الحکم صفحہ ۶۲ ۲؎ تصوف و سلوک صفحہ ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۵

مستلزم کو بدل کر ان میں غسل زیادہ تجویز کیا ہے اور اس تبدیل عادت مزید وغسل سے جو نفس کو تکلیف ہوتی ہے اس کو شریعت نے تقلیل طعام کے قائم مقام کیا ہے اس میں جتنی صورتیں مجاہدہ کی نکل سکتی ہیں روزہ ان سب میں افضل ہے (لہٰذا) تقلیل طعام[1] کو شریعت نے روزہ کی صورت میں مقرر فرمایا ہے اس کے علاوہ صورتیں اہل مجاہدہ نے تقلیل طعام کی اختیار کر رکھی ہیں۔ شریعت میں اس کی مقصودیت کی اصل نہیں (یعنی کم کھانا) اور بھوکا رہنا یہ شرعی مقصود نہیں اور بھوک کی جو فضیلت وارد ہے اس سے اختیاری بھوک مراد نہیں۔ بلکہ غیر اختیاری مراد ہے یعنی یہ اس بھوک کے فضائل نہیں ہیں جو باوجود غلہ گھر ہونے کے اختیار کی جائے بلکہ کسی شخص پر فاقہ آپڑے تنگدستی ہو، اس کی تسلی کے لیے یہ فضائل بیان کر دیے گئے ہیں کہ مسلمان کو فاقہ سے پریشانی نہ ہونی چاہیے اس سے اس کو ثواب ملتا ہے درجات میں ترقی ہوتی ہے یہ فضائل ایسے ہیں جیسے احادیث میں بیماری کے فضائل ہیں اور اس پر ثواب بیان کیا گیا ہے۔ یقیناً اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خود بیمار پڑ جایا کریں۔

مجدد[2] عصر العلامۃ المحدث علی بن سلطان القاری رحمہ نے شرح شمائل ترمذی میں ابن الجوزی[3] سے نقل کیا ہے۔

ومن جهلة الصوفية من	بعض جاہل صوفی ایسے ہیں جو کھانا بہت کم
يقلل المطعم والأكل الدسم	کر دیتے ہیں اور چکنائی کا استعمال بہت کم کرتے
حتى ييبس بدنه ويعذب	ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بدن میں خشکی پیدا
نفسه بلبس الصوف ويمتنع	ہو جاتی ہے وہ اپنے نفس کو صوف پہن کر تکلیف
من الماء البارد وما هذا طريقة	دیتے ہیں اور ٹھنڈے پانی کے
رسول الله صلى الله عليه وسلم	استعمال سے باز رہتے ہیں حالانکہ یہ نہ حضور
ولا طريقة صحابته و	صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور نہ صحابہ و تابعین کا وہ
أتباعهم وإنما كانوا	حضرات بھوکے رہتے جب ان کے پاس کچھ نہ ہوتا

---

[1] تقلیل انام ص [2] تقلیل الطعام ص [3] تقلیل طعام ص

تقلیلِ غذا سے صحت برباد ہو جاتی ہے خاک کیسے نماز پڑھ سکتیں قل ھو اللہ پڑھیں گی۔ زبان و قلب سے کچھ نہ نکلے گا (اسی طرح) غذائے جسمانی کی کثرت سے غذائے روحانی یعنی ذکر اللہ کم ہو جاتا ہے شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

تہی از حکمتی بعلت آں   کہ پری از طعام تا بینی

(یعنی حکمت و دانش سے تو اس لیے خالی ہے کہ ناک تک کھانے سے بھرا ہوا ہے) اس لیے سالک کو غذائے جسمانی کی کثرت بھی نہ چاہیئے بلکہ توسط کا لحاظ رکھنا چاہیئے مگر یہ ضرور ہے کہ سب کا اوسط ایک نہیں بلکہ ہر شخص کا اوسط مختلف ہے بعض اوسط سے تجاوز کرنا اور زیادہ کھانا برا ہے اسی طرح اوسط سے کم کھانا بھی مضر ہے ایک ضرر تو جسمانی ہے کہ غذا بہت کم کرنے سے ضعف لاحق ہو جاتا ہے اور کام نہیں ہو سکتا اور ایک ضرر مقصودِ سلوک کا ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ تشبہ بالملائکہ حاصل کرے اور تشبہ بالملائکہ اس شخص کو حاصل ہے جو نہ شبع (سیری) سے بدمست ہو نہ جوع (بھوک) سے پریشان ہو بلکہ معتدل حالت میں رہ کر ذاتِ جمعیتِ قلب سے متصف ہو اور جمعیتِ قلب[1] جیسا کہ زیادہ کھانے سے فوت ہوتی ہے کم کھانے سے بھی فوت ہوتی ہے۔ زیادہ کھانے سے خطرات کا ہجوم ہوتا ہے کیونکہ معدہ کی تبخیر دماغ کی طرف صعود کرتی ہے تو دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور کم کھانے سے ہر وقت روٹیوں کی طرف دھیان لگا رہتا ہے اس لیے عبادت بھی ناقص ہوتی ہے۔ پس کھانے سے اصل مقصود جمعیتِ قلب ہے نہ بہت کھانا مطلوب ہے نہ کم کھانا۔ دلیل اس کی یہ ہے۔

اذا حضر العشاء والعشاء فابدؤا بالعشاء   جب کہ رات کا کھانا اور رات کی نماز جمع ہو جاوے تو پہلے کھانا کھا لو پھر نماز پڑھو۔

فقہاء نے یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر کھانا ٹھنڈا ہونے سے اس کی لذت زائل ہو جانے کا اندیشہ ہو جب بھی نماز کو مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ منشا اس کا وہی تحصیلِ جمعیت ہے کہ بار بار یہ خیال نہ آوے کہ نماز جلدی پڑھ لوں تاکہ کھانا ٹھنڈا نہ ہو جائے۔

---

[1] [illegible] ۔ تشبہ سے مشابہت مراد ہے۔

تقلیلِ طعام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس وقت خوب اشتہا ہو، اس وقت کھانا کھا لے اشتہا و بھوک کو فوت نہ کرنا چاہیے بلکہ اس کو باقی رکھ کر ہاتھ روک لینا چاہیے۔

دوسری فصل تقلیلِ منام

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗ — رات کو کھڑے رہا کرو مگر تھوڑی سی رات
اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا [1] — یعنی نصف رات یا اس نصف سے کسی قدر کم
الآیۃ — کردو (بیان القرآن)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا قَامَ اَحَدُكُمْ مِنَ [2] — جب تم میں سے کوئی شخص رات کو اٹھے پھر
اللَّیْلِ فَاسْتَعْجَمَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی — (غلبۂ نوم سے) قرآن اس کی زبان سے صاف
لِسَانِهٖ فَلَمْ یَدْرِ مَا یَقُوْلُ — نہ نکلے اور یہ خبر نہ ہو کہ کیا زبان سے نکل رہا
فَلْیَضْطَجِعْ — ہے تو اس کو لیٹ جانا چاہیے (مسلم شریف)۔

بعض لوگ تقلیلِ منام وغیرہ اسبابِ مجاہدہ میں بہت غلو کرتے ہیں کیونکہ ضرر (نقصان) کے لاحق ہونے کی طرف بھی التفات نہیں کرتے۔ اس حدیث میں اس کی اصلاح ہے اور راز اس کا دو ہیں۔ ایک یہ کہ غلو سے بعض اوقات ضرر جسمانی لاحق ہو جاتا ہے پھر ضروری عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ جب غلبۂ نوم سے الفاظ صحیح نہیں نکلیں گے تو جو ثواب خاص ان الفاظ سے متعلق ہے وہ حاصل نہ ہوگا۔ پھر ایسے جاگنے سے کیا فائدہ۔ [3]

اور مذکورہ بالا آیت میں جو قیامِ لیل کا حکم اس لیے دیا ہے کہ ریاضت کے خوگر ہو جس سے استعداد نفس اکمل و اقویٰ ہو۔ بے شک رات کا اٹھنا (اور جاگنا) نفس کے کچلنے میں خوب مؤثر

---

[1] کی ا ۔ الترغیب حدیث [2] التکشف ص ۲۴۶ [3] بیان القرآن تفسیر سورۂ مزمل

ہے اور دعا ہو یا قرأت ہو (نماز ہو یا ذکر ہو) ظاہراً و باطناً ہر بات خوب ٹھیک ہوتی ہے ظاہراً تو اس
طرح کہ فرصت کا وقت ہوتا ہے الفاظ خوب اطمینان سے ادا ہوتے ہیں اور باطناً اس طرح کہ جی خوب
لگتا ہے اور موافقت دل و زبان کا یہی مطلب ہے۔

تقلیل منام بھی مجاہدہ کا دوسرا رکن ہے (۲) رمضان میں نماز تراویح کا اہتمام کرنا شریعت کا حکم ہے اور تراویح
تقلیل منام کو مستلزم ہے جس طرح صوم کو تقلیل طعام میں دخل ہے اسی طرح تراویح کو تقلیل منام میں دخل
ہے اور جیسے روزہ میں تبدیل عادت کی وجہ سے مجاہدہ کی شان آگئی تھی اسی طرح یہاں بھی شریعت نے
محض تبدیل عادت سے مجاہدہ کا کام لیا ہے کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ اکثر لوگ عشاء کے بعد فوراً سو
جاتے ہیں تو نیند کے وقت میں تراویح کا امر کر کے عادت کو بدل دیا جس سے نفس پر گرانی ہوتی ہے جو کہ
مجاہدہ ہے (کیونکہ تقلیل کے ساتھ جاگنے سے مجاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اور دوسرے متأخرین تکیے
چھوڑتے تھے چھت میں رسیاں باندھتے تھے کہ جب نیند آئی اس میں ٹیک لگاتے جس سے نیند اڑ جاتی تھی
ان دونوں مجاہدوں میں ایسا فرق ہے جیسے ... شیر ... ان کو دیکھ کر شرعی مجاہدہ کو دیکھا جائے تو معلوم
ہوتا ہے کہ شریعت نے نہایت ملائم علاج کیا ہے کہ نہ تکیہ چھوڑنے کی ضرورت ہے نہ رسیوں میں لٹکنے کی
ضرورت ہے) پھر اس تقلیل کو تہجد سے اور تقویت ہو جاتی ہے تراویح اور تہجد کے اہتمام سے تقلیل منام
ہو جاتی ہے اور یہ خود بھی مجاہدہ بھی ہے۔

غرض شریعت نے تقلیل منام میں محض بیداری پر اکتفا نہیں کیا کہ خالی بیٹھے جاگتے رہو بلکہ اعمال کی
تلقین فرمائی کیونکہ حق تعالیٰ نیک بندوں کی تعریف (اس طرح) فرماتے ہیں۔

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ وَ...
وہ رات کو کم سویا کرتے ہیں اور پچھلے حصہ رات میں استغفار کیا کرتے ہیں یہاں تو استغفار کی تصریح ہے
دوسری جگہ ارشاد ہے۔

تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ	ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں
الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ	اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ
خَوْفًا وَطَمَعًا الآیۃ	پکارتے ہیں

لے تقلیل المنام ص ۱۹، ۲۱، ۲۴-۲۸، ۳۲، ۳۷، ۳۹، ۴۰ ملخصاً۔

مطلب یہ کہ رات کو نماز پڑھتے ہیں مگر طرزِ کلام سے عموم ظاہر ہے۔ لہٰذا مطلق دعا و ذکر بھی مراد ہو سکتا
ہے۔ اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو تہجد کی توفیق نہ ہو تو رات کو کسی وقت جاگ کر تھوڑی دیر اللہ اللہ
کہہ کر سو رہا کرے وہ بھی یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا میں داخل ہو جائے گا۔

غرض شریعت نے سب گھنٹے کے ساتھ ذکر و استغفار و صلوٰۃ کو بھی مشروع فرمایا ہے محض بیداری
پر اکتفا نہیں کیا۔ پھر اس میں بھی کوئی قید نہیں کہ دو بجے اٹھو یا تین بجے اٹھو بلکہ صبح سے پہلے اٹھنا چاہیے
حق تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے:۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ	آپ کے پروردگار کو معلوم ہے کہ آپ کبھی دو تہائی
اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ	رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی
وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ	رات جاگتے ہیں اور ایک جماعت بھی ان لوگوں میں سے
مَعَكَ ۭ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ	جو آپ کے ساتھ ہے اور رات اور دن کا پورا
وَالنَّهَارَ ۭ (آیہ)	اندازہ حق تعالیٰ ہی کرتے ہیں۔

مطلب یہ کہ تم اندازہ ٹھیک طور پر نہیں کر سکتے کہ ہمیشہ ایک ہی وقت پر اٹھو۔ اس لیے کسی خاص وقت
کی تعیین لازم نہیں کی جاتی۔ جب آنکھ کھل جائے اسی وقت اٹھ جانا چاہیے۔ پھر بیماروں اور مسافروں کی رعایت
کرنے والوں کو رخصت تھی۔ ان کی آنکھ بعض وقت صبح کے قریب ہی کھلتی تھی۔ تو ارشاد ہوتا ہے
کہ:۔

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ڮ فَاقْرَءُوْا

مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ اس میں بیماروں اور مسافروں کو زیادہ بیداری معاف ہے ان کی جب بھی
آنکھ کھل جائے۔ صبح سے پہلے پہلے وہ جتنا بھی قرآن پڑھ سکیں نماز میں پڑھ لیا کریں۔ چاہے دو ہی
رکعت پڑھ لیا کریں۔ اس سے بھی ثواب کامل مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو حدیث میں آتا ہے کہ بعد
وتر کے دو رکعت پڑھ لیا کریں۔ جس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے بھی تہجد کا ثواب مل جاتا ہے

پھر اس میں دینی فوائد کے علاوہ دنیوی فوائد بھی ہیں چنانچہ نیند کم ہونے سے رطوبت فضلیہ کم
ہوتی ہے جو صحت کے لیے معین ہے۔ نیز اس سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک محدث کا

قول ہے۔

من کثرت صلوته باللیل حسن وجهه فی النهار — جو رات کو نماز زیادہ پڑھے گا دن میں اس کا چہرہ خوبصورت ہو جائے گا۔

مطلب یہ کہ تہجد سے چہرہ پر نور پیدا ہوتا ہے ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بیں باشی اگر اہل دلی

مرد حقانی کی پیشانی کا نور — کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور زیادہ سونے سے برودت بڑھ جاتی ہے جس سے قوت فکریہ کم ہو جاتی ہے اور قوت فکریہ کی کمی سے دنیا اور دین دونوں کے کام خراب ہوتے ہیں نیز اس سے اکثر امراض میں بہت خلل پڑتا ہے ایسے شخص کو پابندی اوقات کبھی نصیب نہیں ہوتی۔[1]

نیند[2] کا اصل علاج یہ ہے کہ پانی کم پئیں بعض اہل تجربہ کا قول ہے کہ نیند کا مادہ پانی ہے اس کو حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ پھر بھی اگر نیند آوے تو سو رہنا چاہئے۔ اور اگر مرتبہ ہے تو دن کو سو رہا کریں۔ (اور[3] اگر نیند بہت غالب ہو تو اس کو دفع نہ کیا جاوے۔ نیند میں سو رہنا چاہئے پھر دوسرے وقت پورا کر لیا جاوے۔ اور اگر زیادہ غالب نہ ہو تو ہمت کر کے جاگنا چاہئے (اور خطرہ کی صورت میں اگر نیند کو زبردستی روکا جائے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے۔ عقل میں اشتعال بڑھ جاتا ہے سوداویت ترقی ہو جاتی ہے۔ خیالات فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ ان کو الہام سمجھ کر اپنے کو بزرگ جاننے لگتا ہے۔ آخر یہ ہوتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمی نیند کی بہت رعایت کی ہے چنانچہ ارشاد ہے لا تفریط فی النوم (سونے میں کوئی تفریط نہیں)

---

[1] تفصیل الکلام صـ۲۹ [2] کمالات اشرفیہ صـ۳۱۰ [3] انفاس عیسیٰ صـ۱۰۲ [4] کمالات اشرفیہ صـ۱۲۲

اس کی یہ صورت تجویز کی کہ تلاوت قرآن مجید میں مشغول رہو (یا ذکر کرتے رہو) جس سے مجاہدہ تقلیل کلام کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے۔ فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہو جاتی اور اس کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے۔ جو خاموش رہنے میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

شریعت[1] کی یہ بہت بڑی تعلیم ہے کہ بے ضرورت باتوں میں نہ پڑنا چاہیے (چنانچہ حدیث شریف میں ہے)

من حسن اسلام المرء ترکه ما لا یعنیه۔ — آدمی کے حسن اسلام میں سے یہ ہے کہ مقصد سے غیر متعلق باتوں کو چھوڑ دے۔

اور ارشاد فرمایا:

ایاك وكثرة الضحك فانه يميت القلب۔ — زیادہ ہنسنے سے بچو کیونکہ زیادہ ہنسنا قلب کو مردہ کر دیتا ہے۔

تجربہ[2] سے معلوم ہوا کہ کثرت سے قلب میں حجابات پیدا ہوتے ہیں وہ گفتگو کے بعد باقی نہیں رہتے اگرچہ گفتگو ضروری ہی کیوں نہ ہو لیکن ضرورت سے زائد سو شیخ فرید الدین عطار فرماتے ہیں ؎

دل ز پر گفتن بمیرد در بدن — گرچہ گفتارش بود در عدن

یعنی[3] کثرت کلام (مباح) سے دل مر جاتا ہے۔ ظلمت اور قساوت قلب پیدا ہو جاتی ہے اور سارے طاعات کا مدار حیات قلب پر ہے۔ نیک کاموں کی توفیق نور قلب سے پیدا ہوتی ہے اور تمام معاصی کا منشا قساوت اور ظلمت قلب ہے۔ جب قلب میں حیات و نور ہی نہ رہا بلکہ اس کے بجائے قساوت و ظلمت پیدا ہو گئی تو اب یہ شخص سب گناہوں کے لیے قابل ہو جاتا ہے۔

کثرت[4] کلام اسی وقت ہوتی ہے جبکہ اپنی برائی ذہن میں نہ ہو۔ اور اپنی برائی نظر میں اسی وقت آتی ہے جب حق تعالیٰ سے غفلت ہو۔ اور حق تعالیٰ سے غفلت ایک مرض نہیں۔ بلکہ مجموعہ امراض ہے۔

---

[1] انفاس عیسیٰ ص ۱۳۸، ۲۹۵ [2] شرف المسائل ص ۱۰ [3] تقلیل الطعام ص ۴۳

[4] کمالات اشرفیہ ص ۳۰۸۔

تو جس شخص کو دیکھیں کہ کثرتِ کلام میں مبتلا ہے تو سمجھ لیں کہ وہ ایک مرض ہی میں مبتلا نہیں، بلکہ بہت سے امراض میں مبتلا ہے اور اس میں وہ تمام امراض موجود ہیں جو ترفّع اور تکبر کی ذریات ہیں۔

(ثانیاً یہ ہے کہ) بات[1] وہ کریں جس کی کچھ غایت ہو جس بات کا کچھ نتیجہ نہ ہو اس کے درپے نہ ہوں۔ کلام و ترکِ کلام دونوں اختیاری ہیں۔ اس میں بھی ہمت کی ضرورت ہے اگر بعض ملنے والے بیکار زیادہ دیر تک مجمع خراشی اور حرج کریں اور ان کو نہ اٹھائیں۔ تو خود کوئی خلوت کی جگہ اپنے لیے تجویز کر کے ان سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ اضیاف (مہمان) بھی اگر غیر ضروری باتیں کرنے لگیں جس سے اپنے کام کا وقت ضائع ہونے لگے یا طبیعت تنگ ہونے لگے، بدوں عذر یا کسی حیلہ سے اٹھ جانا چاہیے۔ مروت میں اپنا دینی ضرر ہرگز گوارا نہ کرنا چاہیے۔

---

[1] انفاسِ عیسیٰ ص ۱۷۲

چوتھی فصل تقلیل اختلاط مع الانام

قیل یا رسول اللہ ای الناس افضل قال مؤمن مجاہد بنفسہ ومالہ فی سبیل اللہ قیل ثم من قال رجل فی شعب من الشعاب یتقی اللہ ویدع الناس من شرہ۔ رواہ الخمسۃ

کسی نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل کون شخص ہے آپ نے فرمایا جو مومن اپنی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو۔ سوال کیا گیا پھر کون افضل ہے فرمایا وہ شخص جو پہاڑ کی گھاٹیوں میں سے کسی گھاٹی میں رہتا ہو۔ اللہ سے ڈرتا ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے فارغ رکھتا ہو۔ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد و نسائی نے روایت کیا

حقیقت اکثر اہل اللہ کی عادت رہی ہے کہ خلق سے اختلاط کم رکھا اور گوشہ نشین رہے ہیں اس حدیث سے اس کی اجازت اور ایک درجہ فضیلت ثابت ہوتی ہے اور حدیث میں اس کے محمل کی طرف اشارہ بھی ہے کہ جب اختلاط میں احتمال شر الی الخلق[۳] کا ہو اور اسی پر قیاس کیا جائے گا وصول شر من الخلق[۴] کو اور نیز حدیث مذکور ہی میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جس شخص سے خیر و نفع عام زیادہ متوقع ہو اس کے لیے اختلاط افضل ہے۔ چنانچہ مومن مجاہد کو صاحب عزلت سے افضل فرمایا اور تحقیق مسئلہ کا خلاصہ یہی ہے کہ جس شخص سے مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہو اس کے لیے جلوت بہتر ہے۔ اور جس سے نفع متعلق نہ ہو اور جلوت میں احتمال اضرار و ضرر پہنچانے یا تضرر (ضرر پہنچنے) کا ہو اس کے لیے خلوت بہتر ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ ماسوی اللہ سے جس قسم کے تعلقات ہیں تعلق محمود جس کا شریعت نے امر فرمایا ہے وہ تو عین تعلق بحق ہے۔ اس کا قطع ناجائز ہے دوسرے تعلق مذموم جس سے شرع نے

۱ے التکشف ص۲۵۹ ۲ے اشرف المسائل ص۱۲۱ ۳ے مخلوق کو شر پہنچنے کا احتمال۔ ۴ے مخلوق سے شر کو پہنچنا۔

نہی خرابی ہے اس کا قطع واجب ہے تیسرے تعلق مباح جو نہ طاعت ہے نہ معصیت۔ اس میں
قطع کی ضرورت نہیں بلکہ تقلیل بہر حال اچھا ہے کرنا۔ (یعنی تقلیل کرنا) مزید کا سبب ہے جہاں قطع تعلق
کی تعلیم ہے۔ مراد تعلق محمود نہیں بلکہ مذموم و مباح ہے مگر مذموم بطور ترک کے اور مباح بطور تقلیل کے
اور وجہ یہ ہے کہ نسبت مع الخالق اور تعلق مع الخلق بلا ضرورت سراسر مضرت ہے اور جو منفعت
سمجھی جاتی ہے کہ ادائے حق خلق ہے وہ حق خلق بھی جب ہی ادا ہوتا ہے کہ نسبت مع الخالق تام ہو جائے
ورنہ نہ حق خالق ادا ہو سکتا ہے نہ حق خلق۔ یہ ایک کا نہیں۔ بلکہ ہزاروں اہل بصیرت کا تجربہ ہے ہم اور
آپ سے زیادہ اہل تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا۔ حضرت ابراہیم بلخی و حضرت شاہ شجاع کرمانی
کے واقعات معلوم ہیں اور حضرات خلفائے راشدین پر اپنے آپ کو قیاس نہ کیا جائے۔ ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

قول[1] تفصیل خلوت کے باب میں یہ ہے کہ جس شخص کو کوئی ضروری حاجت دینی یا دنیوی دوسروں
سے متعلق ہو۔ نہ دوسروں کا کوئی ایسی ہی حاجت اس شخص سے متعلق ہو اس کے لیے خلوت جائز بلکہ
افضل ہے۔ خصوصاً جبکہ فتن و شرور سے یا جبکہ مخالطت کے غلبات و تشویشات اور ایذاؤں پر صبر
کرنے کی توقع و ہمت نہ ہو۔ احادیث میں جو ترغیب خلوت کی آئی ہے وہ ایسے ہی حالت پر ہے
جیسے حدیث میں ہے۔

ورجل معتزل فی شعب جبل — ایک وہ آدمی جو پہاڑ کی کسی گھاٹی میں،
له غنيمة يؤدي حقها ويعبد — اس کے پاس غنیمت ہے کہ اس کا حق ادا کرے
الله او كما قال — اور اللہ کی عبادت کرے۔ او کما قال

اور جس شخص کو دوسروں سے یا ان کو اس سے کوئی حاجت ضروری ہو۔ خواہ دنیوی ہو جیسے تحصیل نفقہ عیال جبکہ
توکل پر قادر نہ ہو۔ خواہ دینی ہو مثل تحصیل علوم ضروریہ یا ان کے لیے خلوت جائز نہیں۔ اسی طرح
اگر اس کے ساتھ خلائق کی حاجات دینیہ یا دنیویہ متعلق ہوں تو بھی خلوت جائز نہیں اور بعض احادیث
سے جو نہی خلوت کی مفہوم ہوتی ہے وہ محمول ایسی ہی دونوں حالتوں پر ہے۔ جیسے حضرت عثمان

---

[1] کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۰ [2] التکشف صفحہ ۴۲۔

بعض لوگوں کو قتل سے منع فرمایا گیا کہ اس وقت ان کو بھی تحصیل علوم دین کی حاجت تھی۔ اور مسلمانوں کو بھی ان کی طرف دینی حاجت تھی۔ بالخصوص اعلاء کلمۃ اللہ و ترقی اسلام میں نہایت بڑی ضرورت تھی۔ یہ تفصیل تو اس خلوت میں ہے جس کو بطریق عادت دائمی کے لیے تجویز و اختیار کرے۔ ایک خلوت چند روزہ ہے جس کی ضرورت اس وقت مبتدی سلوک کے لیے واقع ہوتی ہے اور صحابہؓ کو اس کی حاجت نہ تھی۔ وجہ یہ کہ مقصود اصل تو تحصیل نسبت مع اللہ ہے اور وہ بدون یکسوئی قلب کے میسر نہیں ہوتی پس صحابہ کو بوجہ وسعت قلب کے مشاغل خلوت اس یکسوئی سے مانع نہ تھے کما قال اللہ تعالیٰ :-

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ... نہیں غافل کرتی ہے ان کو خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے۔

اور ہم لوگوں کے قلوب اس قدر وسیع نہیں۔ لہٰذا جب تک تعلقات خلوت کی تقلیل نہ کی جائے اس وقت تک یکسوئی جو موقوف علیہ تحصیل نسبت کا ہے حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے اس کی ضرورت چند روز کے لیے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جب یادداشت راسخ ہو جاتی ہے پھر اس تفصیل مذکور میں یہ شخص بھی داخل ہو جاتا ہے۔

اختلاط کے فائدے

۱:۔ تعلیم و تعلم اسی پر موقوف ہے۔ عزلت سے تعلیم و تعلم کا باب مسدود ہو جائے گا۔

۲:۔ اختلاط میں خدمت خلق کا موقع ملتا ہے۔

۳:۔ جماعت کی فضیلت اختلاط ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو شخص عزلت گزین ہوگا۔ وہ جماعت کے ثواب اور خدمت خلق کی فضیلت سے محروم رہے گا۔

۴:۔ اس سے تواضع پیدا ہوتی ہے۔

۵:۔ بزرگان دین سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ بدون اختلاط کے بزرگوں سے فیض حاصل کرنا دشوار ہے۔

لہ اشرف المسائل ص ۱۴۲

خلوت کے فائدے

گناہوں سے اجتناب ہوتا ہے بشرطیکہ ایسی عزلت ہو جس میں نگاہ کی بھی حفاظت کرے، کان کی بھی حفاظت کرے دل کی بھی حفاظت کرے۔ قصداً کسی غیر کا خیال دل میں نہ آنے دے۔ اگر آ جائے تو ذکر میں مشغول ہو کر اسے دفع کر دے۔ ایسی عزلت میں واقعی گناہوں سے بہت حفاظت ہوگی اور ظاہر ہے کہ دفع مضرت جلب منفعت پر مقدم ہے تو عزلت اختلاط پر مقدم ہے کیونکہ اختلاط میں گو منافع بہت ہیں مگر ساتھ ہی یہ مضرت بھی ہے کہ اس میں اکثر گناہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اختلاط کے ساتھ تحفظ کا کام بہت دشوار ہے یہ کام صدیقین و کاملین کا ہے ورنہ اکثر اختلاط میں فضول باتیں بہت کرنا پڑتی ہیں۔ جن لوگوں کا وقت خلوت کے لیے مخصوص نہیں ہوتا رفتہ رفتہ ان کا قلب انوار سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔

طریق کار

ہر کام کو اپنے اوقات مقررہ پر کریں۔ دنیا کا کام اپنے وقت میں، ورد و وظائف اپنے وقت میں۔ حتیٰ کہ گاہ گاہ خفیف اور مختصر مزاح بھی اپنے اور دوسرے مسلمانوں کی تفریح اور تطییب قلب کے لیے اپنے موقع میں کر لینا چاہیے۔ اس طرح سب کام چلتے رہیں گے۔ ورنہ بالکل گوشہ نشین ہونے سے بعض اوقات طبیعت میں شوق اور امنگ کا مادہ ضعیف ہو جاتا ہے اور بدون اس کے کام چلنا دشوار ہے۔

خدمت خلق اللہ سالک کے لیے از بس نافع ہے۔ مگر ضرورت خدمت سے زیادہ اختلاط نہ کرے کہ وہ مضرت باطن ہے۔ سالک کے لیے عزلت ضروری ہے۔ تعلقات بڑھانا نہ چاہیے۔ نہ دوستی کے نہ دشمنی کے۔ یہ ذکر اللہ میں مخل انداز ہوگا۔ دوست مل جاویں تو ان سے جان بچانا ہو رہے اور دشمن مل جاوے تو اس سے ظاہری اخلاق ہو سکتے کہ کسی کا ہیجان نہ بڑھے، ورنہ وہ اس کی ایذا کے درپے ہوگا۔

جب تک خلوت میں دل خدا کے ساتھ لگا رہے تو خلوت میں رہیں اور جب خلوت میں انتشار اور ہجوم خطرات ہونے لگے تو مجمع میں جا بیٹھیں مگر نیک مجمع میں۔ اس سے خطرات دفع ہو جاویں گے اس وقت یہ جلوت ہی خلوت کے حکم میں ہے۔

۱؎ انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۵۴ ۲؎ دعوات عبدیت صفحہ ۱۸۹ ۳؎ التکشف صفحہ ۲۹، ۱۲۲ ۴؎ کمالات اشرفیہ صفحہ ۵۹

پہلی فصل۔ اذکار کا بیان

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

اَلَّذِیْنَ[1] یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ	وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی، اور
قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی	زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں۔
جُنُوْبِھِمْ آیۃ	کھڑے بھی، بیٹھے بھی، لیٹے بھی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

[2] لِکُلِّ شَیْءٍ صِقَالَۃٌ وَصِقَالَۃُ	ہر شے کا صیقل (چمکانے والا) ہے اور
الْقُلُوْبِ ذِکْرُ اللّٰہِ رواہ البیہقی	قلوب کا صیقل اللہ کا ذکر ہے۔

[3] ذکر کے معنی لغت میں "یاد رکھنا" ہے۔ اس کا مقابل نسیان یعنی بھول جانا ہے۔ یاد رکھنا دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک صوری اور ایک حقیقی۔ صوری زبان سے یاد کرنے اور نام لینے کو کہتے ہیں اور حقیقی۔ ادائے حقوق کو کہتے ہیں۔ ذکر لسانی (یعنی زبان سے یاد کرنا) بھی ذکر اللہ کا ایک فرد ہے مگر ناقص اور ذکر حقیقی، ذکر اللہ کا فرد کامل ہے۔ اگر دونوں جمع ہو جاویں۔ یعنی ادائے حقوق کے ساتھ ذکر لسانی بھی ہو تو سبحان اللہ درجہ اکمل ہے۔ غرض کوئی خیر دنیا و آخرت کی نہیں جو ذکر اللہ میں نہ آگئی ہو کیونکہ حقوق اللہ کی بہت قسمیں ہیں۔ جیسے عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات اور حقوق الناس وغیرہ۔ اس میں تمام احکام شریعت آگئے۔ گویا ذکر اللہ کا اصل مطلب، اللہ تعالیٰ سے پورا تعلق پیدا کر لینا ہے[4]

تعلق کے معنی ہیں لگاؤ۔ اور لگاؤ سے مراد دل کا لگاؤ۔ اور دل کے لگانے کے معنی یہی ہیں کہ دل اسی کی طرف متوجہ رہے اور دل میں، اس وجہ سے اسی کی یاد رہے۔ جس کو عرف میں "دل میں بس جانا" کہتے ہیں اور غفلت عن اللہ تمام امراض کی اصل ہے جو کہ ضد ہے۔ اس تعلق مذکورہ کی، جو قلب کی غذا ہے اور غفلت کی ضد ہے یاد۔ تو یاد کو اختیار کرنا چاہیئے اور یاد سے (اصل) مراد کسی لفظ کو زبان سے رٹنا

---

[1] بیان القرآن ص۸۰ ج ۲ [2] التکشف ص۴۳۳ [3] تفصیل الذکر ص۴ ، ص۵ ۔
[4] وعظ ص۲۷ ، ۲۹ ، ۲۸ ، ۴۰ ، ۴۲ ملخصاً ۔

نہیں ہے۔ بلکہ ہر کام میں یاد رکھنا ہے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔
لیکن[۱] ذکر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صورت ذکر ایک حقیقت ذکر۔ جو لوگ پورے اعمال شرعیہ بجا نہیں لاتے
اور صرف ذکر لسانی یا قلبی کرتے ہیں ان کو صورت ذکر تو حاصل ہے لیکن حقیقت ذکر حاصل نہیں۔ مگر
ذکر اس کی بھی بیکار نہیں۔ بلکہ نافع و مفید ہے۔ جس کو کوئی اعلیٰ درجہ حاصل نہ ہو وہ اسی کو غنیمت سمجھے۔
کیونکہ ؎

از صفت وز نام چہ زاید خیال وان خیالش ہست دلال وصال

اور ذکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور دل سے بھی اور اس کے متعلق مختلف احکام ہیں۔ بعض لفظ کے ساتھ
متعلق ہیں۔ ان میں ذکر لسانی افضل ہے۔ باقی ذکر قلبی جس سے ہر وقت قلب میں یاد رہے۔ اجر اس
پر بھی ہے۔ مگر اس میں قلب سے ذہول کا قوی اندیشہ رہتا ہے کیونکہ زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا
دل ادھر ادھر چلا جاتا ہے۔ اور وہ اکثر یہ سمجھتا ہے کہ میں ذکر میں مشغول ہوں اور ذکر لسانی میں یہ اندیشہ نہیں
اس لیے ذکر لسانی کرنا چاہیے اور اس میں توجہ قلبی رکھنا چاہیے۔ اگر کچھ دیر ذکر قلبی نہ رہے گا تو لسانی
تو باقی رہے گا اور وقت ضائع نہ ہوگا اور اگر صرف قلب سے ذکر کرے گا تو زبان خالی رہے گی۔ اس
اعتبار سے ذکر قلبی سے ذکر لسانی افضل ہے۔ مگر اس ذکر لسانی کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ اس
ذریعے سے قلب میں مذکور کی یاد رچ اور بس جائے۔ اور اللہ کی نافرمانی ترک ہو جائے اور فرمانبرداری پر کمر
ہمت چست کر دے۔ یہی ذکر اکمل ہے اور جس کو یہ چیز یعنی معاصی سے نہ روکیں۔ اس کے لیے یہ حقیقی
ذکر نہ ہوگی۔ بلکہ ذکر کی صورت ہوگی۔

محققین صوفیہ[۲] نے اس راز کو سمجھا ہے کہ اشراقہ کرنا گو ذکر نہیں مگر مقصود کے لیے تیار ہونا
ہے۔ اس واسطے بحکم ذکر ہے اور اصل مقصود اس ذکر سے اس کے مدلول کا رسوخ فی القلب ہے
اور قاعدہ ہے کہ رسوخ کے لیے تکرار مؤثر ہوتا ہے اور اس لیے تجربہ کافی ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ رسوخ
کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ طریقہ سنت سے ثابت ہو۔

محققین[۳] کا قول ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات و کمالات خود ایسے ہیں کہ اس کا کمال اس کو مقتضی

---

۱ ذکر الاعمال صفحہ ۲۲ ۔ ۲ تصوف و سلوک صفحہ [illegible] ۔ ۳ انفاس عیسیٰ صفحہ [illegible]

کرتا ہوں اور ان آیات کے ذکر سے مقصود یہ دکھلانا ہے کہ تمام اعمال سے مقصود ذکر ہے اور وہی تمام اعمال کی روح اور اساس ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔

(۱) اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الیٰ قولہٖ وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ

اس آیت میں اسلام و ایمان و قنوت و صدق و صبر و خشوع و تصدق و صوم و حفظ فروج کا ذکر ہے اور ان سب کو ذکر پر ختم کیا ہے۔ جس میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان سب میں بصورت ذکر اللہ سے ہو جاتی ہے۔

(۲) رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

اس میں ذکر اللہ سے عدم غفلت کو اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ سے عدم غفلت پر مقدم فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ عدم غفلت عن الذکر مقدم ہے اس کے بعد عذاب و ثواب کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ خوف عذاب و رجاء ثواب بھی ذکر اللہ میں داخل ہیں۔

(۳) اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ صلوٰۃ سے مقصود ذکر ہے۔

(۴) اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۔ اس کا مطلب قریب یہ ہے کہ یہ جملہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى علت ہے یعنی نماز میں یہ خاصیت اس لیے ہے۔ اِنَّ فِيْهَا ذِكْرَ اللّٰهِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ فلا جل تاثیرالذکر تنہی الصلوٰۃ عن الفحشاء والمنکر اھ۔

(۵) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى الآیۃ اس میں صلوٰۃ کو ذکر پر مرتب فرمایا گیا ہے جس سے ذکر کا دخل نماز میں معلوم ہوا اور روزہ کے بارہ میں ارشاد ہے :۔

(۶) وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ الآیۃ اس کا روزہ میں دخل ہونا مذکور ہے۔

(۷) حج کے بارہ میں ارشاد ہے :۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ

(۸) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ

(۹) فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ

(۱۰) فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ الآیۃ۔ یہ حج کہ مرکب ہے اعمالِ متعددہ سے باجماع ذکر کا حکم ہوا ہے تاکہ ہر عمل میں اس سے اعانت ہو۔

(۱۱) لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ الآیۃ۔ یہ انفاق سے پہلے ذکر کا امر ہے اور پھر انفاق کا۔ یہ ترتیب ظاہر کر رہی ہے کہ ذکر کو انفاق میں دخل ہے جیسا اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی جابجا ترتیب اسی پر دال ہے۔

(۱۲) لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ الآیۃ۔ اس میں قربانی کو بھی ذکر اللہ سے خالی نہیں چھوڑا کہ اس کے سب احکام و حدود کا اہتمام و رعایت سہل ہو۔ اور اگر غور کیا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود ملے گا۔ یہ تو اعمالِ ظاہرہ کی چند مثالیں تھیں۔ اب اعمالِ باطنہ میں غور کیجئے تو وہاں بھی ذکر موجود ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

(۱۳) اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا الآیۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ خوف و خشیت وہی معتبر ہے جس کا منشا ذکر اللہ ہے نیز معلوم ہوا کہ ذکر کو خوف میں جو کہ اعمالِ باطنہ سے ہے دخل ہے۔

(۱۴) وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ الآیۃ۔ اس میں استغفار کو ذکر پر مرتب فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ ذکر استغفار کا سبب ہو جاتا ہے۔ وھذا مشاہد۔

(۱۵) فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ الآیۃ۔ ظاہر ترتیب سے ذکر کا دخل شکر میں معلوم ہوتا ہے۔

(۱۶) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ الآیۃ۔ ثبات عن الانفعال صبر کا اعلیٰ فرد ہے۔ اس کی سہولت کے لیے ذکر کا امر اس پر دال ہے کہ ذکر کو صبر میں بھی دخل ہے۔

(۱۷) يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیۃ۔ اس میں دلالت ہے کہ ذکر کو فکر میں بھی دخل ہے۔

(۱۸) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ الیٰ قولہ تعالیٰ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ الآیۃ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کو عدم انہماک فی الدنیا میں بھی دخل ہے۔

(۱۹) یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا الآیۃ۔ اس میں دلالت ہے کہ ریا کا علاج ذکر ہے۔

یہ مقامات کا بیان تھا کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے اب احوال میں غور کیا جائے تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

(۲۰) اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُہُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ الآیۃ کہ ذکر اللہ کا دخل اطمینان میں جو کہ منقسم ہے مقام و حال کی طرف معلوم ہوا۔

(۲۱) اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ الآیۃ۔ کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلوب کو اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان کے دو درجے ہیں۔ ایک تو مقام ہے جو تصدیق و اذعان کا درجہ ہے دوسرا ایک حال ہے جس کو سکون و انس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کیلئے ذکر اللہ کو سبب بتلایا ہے۔ اس لیے اس کے عموم میں مقام و حال دونوں داخل ہیں۔

(۲۲) اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّہُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ہُمْ مُّبْصِرُوْنَ الآیۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کو اضمحلال وساوس و نزغات شیطانیہ میں دخل ہے نیز ارشاد ہے۔

(۲۳) وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ الآیۃ

(۲۴) وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطٰنًا۔ سے معلوم ہوا کہ ذکر کو عدم تسلط شیطان میں دخل ہے۔

(اعمال و احوال کے علاوہ دیگر معاملات میں بھی ذکر کو دخل ہے چنانچہ) ارشاد ہے۔

(۲۵) اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَکُ شَیْئًا مع الآیۃ السابقۃ واللاحقۃ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کو اعتقاد بعث میں دخل ہے

(۲۶) اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ الآیۃ اس میں دلالت ہے کہ صحت استدلال میں بھی ذکر اللہ کو دخل ہے اس طرح سے کہ ذکر اللہ سے قلب میں نورانیت آجاتی ہے اس نورانیت کی بدولت خطا فی الاستدلال سے حفاظت رہتی ہے۔

(۲۷) فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ الآیۃ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ مشغولی معاش کے وقت بھی ذکر سے غفلت نہ چاہیے نیز اس طرف بھی کہ ذکر سے معاش میں برکت بھی ہوتی ہے لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ میں فلاح کی یہ تفسیر ہو سکتی ہے۔

(۲۸) وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ الآیۃ اس میں دلالت ہے کہ حقوق نفس ادا کرنے میں ذکر کو دخل ہے۔

(۲۹) اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ الآیۃ اس سے معلوم ہوا کہ امم سابقہ کی ہلاکت سے عبرت حاصل کرنے میں بھی ذکر کو دخل ہے۔

(۳۰) فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِکُمْ الآیۃ اس میں اشارہ ہے کہ نماز ادا کر کے اپنے کو ذکر سے فارغ نہ سمجھیں بلکہ ذکر میں برابر مشغول رہیں۔

(۳۱) وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی الآیۃ اس سے اعراض عن الذکر کا موجب خسران دارین ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

(۳۲) فَاذْکُرُوْا اٰلَآءَ اللّٰهِ الآیۃ۔

(۳۳) وَاذْکُرُوْا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ الآیۃ۔

(۳۴) وَذَکِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ الآیۃ عامۃ للنعم والنقم

(۳۵) وَاذْکُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ

لہ یعنی ذکر [illegible] نعمتوں اور نقمتوں کو عام ہے۔

أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ الآیہ۔

ان آیات میں نعمت و نصرت یاد دلائی ہیں۔

(۲۶) فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا الآیہ اس میں یوم قیامت کو کہ یوم ثواب و عقاب ہے یاد دلایا ہے۔

(۲۷) لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ الآیہ۔ اس میں بھی یوم حساب کو یاد نہ رکھنے پر وعید فرمائی ہے۔

(۲۸) فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَٰذَا الآیہ اس میں یوم لقا کو یاد دلایا ہے۔

(متوسط تنبیہ[1]) ذکر کی کوئی حد نہیں، حالانکہ نماز کے واسطے ایک حد ہے کہ اوقات مکروہ میں حرام ہے۔ روزہ کے واسطے حد ہے کہ ایام نحر میں حرام ہے۔ زکوٰۃ و صدقہ کے واسطے حد ہے کہ خیر الصدقۃ ما کان عن ظہر غنی (یعنی بہترین صدقہ وہ ہے جو غنی کے بعد ہو) حج کے واسطے حد ہے، شتو فرض ادا کرنے کے بعد ایسے شخص کے لیے حج نفل جائز نہیں جس کے اہل و عیال کے حقوق ضائع ہوں، [illegible] ذکر حقیقی کے لیے کوئی حد نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کان یذکر اللہ فی کل احیانہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور اس کا غیر محدود ہونا [illegible] ہے کہ بیت الخلاء میں زبان سے ذکر کرنا منع ہے کیونکہ زبان بیت الخلاء میں ہے [illegible] سے خدا کو یاد کرنا، کہ وہی ذکر حقیقی ہے، ممنوع نہیں کیونکہ قلب بیت الخلاء میں نہیں اور یہاں سے صوفیہ کے اس قول کی ایک لطیف تائید ہوتی ہے کہ لطیفۂ قلب جسم سے باہر ہے وہ دوسرے عالم میں ہے۔ اسی واسطے پاخانہ میں ذکر قلبی ممنوع نہیں کیونکہ قلب یہاں نہیں ہے۔ اور اگر کوئی اس تحقیق کو نہ مانے یا نہ سمجھے تو وہ یوں کہہ لے کہ یہ مثل تعویذ ملفوف کے ہے اور تعویذ ملفوف پاخانہ میں لے جانا جائز ہے اور گو زبان بھی ملفوف

---

[1] کبریت احمر صفحہ [illegible]۔

ہے۔ مگر زبان سے ذکر جبھی ہو سکتا ہے جبکہ لبوں اور دانتوں کو حرکت ہو۔ اور جب لب و دنداں کو
حرکت ہوگی تو زبان مستور نہ رہے گی مکشوف ہو جائے گی۔ اور اگر کوئی شخص بدون لب و دنداں کی
حرکت کے یا خاموشی اسی طرح ذکر اللہ کرے کہ زبان مکشوف نہ ہو تو یہ صورت جائز ہے۔ مگر وہ
ذکر لسانی نہیں۔ کیونکہ ذکر و تلاوت کے لیے تصحیح حروف ضروری ہے۔ اور بعض کے نزدیک سماع
صوت بھی لازم ہے ادا کرنے کے لیے کشف لسان لازم ہے اور بغیر اس کے جو ذکر ہوگا۔ وہ حکماً
ذکر ہے نہ حقیقتہً۔

خلاصہ[1] یہ کہ الی اللہ کا کل دو چیزیں ہیں۔ طاعت اور ذکر، معصیت سے طاعت فوت ہو
جاتی ہے اور غفلت سے ذکر فوت ہو جاتا ہے۔ اس لیے اپنا اصل کام طاعت و ذکر پر دوام رکھنے
اور معصیت سے بچنے کو سمجھے (اور شریعت کے تمام احکام کو بجا لائے) کیونکہ اللہ تعالیٰ[2] کی
اطاعت احکام کے واسطے ہی سے ہوگی۔ پس ذکر اللہ کے مختلف مراتب ہیں۔ اسی واسطے مشائخ
نے ذکر میں تدریج اختیار رکھی ہے۔ چنانچہ ہمارے مشائخ چشتیہ ذکر لسانی میں بھی تدریج
اختیار کرتے ہیں کہ بارہ تسبیح میں اول لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم ہے۔ یہ مبتدی کے لیے مناسب ہے
کیونکہ اس کے دل میں ابھی اغیار بھرے ہوئے ہیں۔ تو اس کو چاہیے کہ ان کو ذہن میں پیش کر کے
تیغ لا سے نفی کرے۔ جب ان کی نفی ہوگئی اور دل اغیار سے خالی ہوگیا تو صرف ذکر اثبات
الا اللہ مناسب ہے۔ مگر اثبات میں بھی اغیار کا ایک گونہ استحضار ہے۔ اس لیے اس کے بعد
اللہ اللہ بتلاتے ہیں جس میں محض ذات حق پر توجہ ہے مگر اس میں بھی توجہ بواسطہ اسم کے
ہے۔ اس لیے بعض مشائخ اس کے بعد ذکر ھو ھو کی تعلیم کرتے ہیں جس میں ذات پر توجہ ہوتی
ہے۔ اسم کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

اقسام ذکر اور ان کا دستور العمل

ابتداء میں[3] اسم ذات کی کثرت دوسرے اذکار و اشغال سے زیادہ مناسب ہے۔

اگرچہ زیادہ ثواب لا الٰہ الا اللہ میں ہے کیونکہ ماثور ہے اور دوسرے اذکار الا اللہ یا

---

[1] [illegible] ص[illegible]۔ [2] [illegible] ص[illegible]۔ [3] کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۳۱۔
[4] الافاضات [illegible] ص[illegible]۔

حضرات نے یکسوئی کی مصلحت کے لیے تجویز ہوتے ہیں۔ واقعی تجربہ ہے ذکر ماثورہ اوفق بالطبائع ہے۔
اور اس میں اتباع بھی ہے۔

ایک مختصر دستور العمل[1] جو کہ نہایت نافع ہونے کے اعتبار سے میرے نزدیک حفظ تصوف کے قابل ہے۔ اپنے دوستوں کے لیے ہمیشہ کے لیے عمل کرنے کے واسطے ضبط کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ جو اس کے موافق عمل کرے گا محروم نہ رہے گا۔

طالب کی چار قسمیں ہیں۔ ایک عامی **مشغول**، دوسرا عامی فارغ، تیسرا عالم مشغول، چوتھا عالم فارغ۔ ان میں ہر ایک کے لیے ایک دستور العمل خاص ہے۔

عامی مشغول کا خاص دستور العمل

اوّل عقائد و مسائل ضروریہ سیکھے اور بہت اہتمام سے اس کا پابند رہے۔ اور جو نئی بات پیش آئے علماء سے پوچھے۔ اگر ممکن ہو تو تہجد آخر شب میں پڑھے۔ ورنہ عشاء کے بعد وتر سے پہلے کچھ نفلیں بجائے تہجد کے پڑھے اور بعد پانچوں نمازوں کے یا جس کے بعد فرصت ہو۔ سبحان اللہ سو بار اور لا الٰہ الا اللہ سو بار۔ اور اللہ اکبر سو بار اور سوتے وقت استغفار سو بار پڑھا کرے۔ اور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے درود شریف زبان سے جاری رکھے اور اگر قرآن مجید پڑھا ہوا ہو تو روزانہ کسی قدر قرآن کریم کی تلاوت بھی کیا کرے۔

عامی فارغ کا خاص دستور العمل

عامی فارغ کا خاص دستور العمل بھی وہی ہے جو عامی مشغول کے لیے بیان کیا گیا۔ مگر اتنے امور اور زائد ہیں۔ اگر ممکن ہو تو پیر کی خدمت میں جا بیٹھے۔ اگر پیر کے پاس نہ رہ سکے تو اپنے وطن ہی میں رہ کر

---

[1] قصد السبیل صفحہ ۱۲

طریقِ ذکر دوازدہ تسبیح

بعد نمازِ تہجد[1] کے توبہ و استغفار، عجز و انکساری سے کر کے اور ہاتھ اٹھا کے یہ دعا بحضورِ قلب پڑھے اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ عَنْ غَیْرِكَ وَ نَوِّرْ قَلْبِیْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ یَا اَللّٰهُ یَا اَللّٰهُ یَا اَللّٰهُ تین بار یا سات مرتبہ تکرار کرے۔ اور گیارہ بار استغفار و گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ کر چار زانو بیٹھے اور داہنے پاؤں کے انگوٹھے سے اور جو انگلی اس کے پاس ہے اس سے رگ کیماس کو، کہ بائیں زانو کے اندر ہے، پکڑ لے۔ اور کمر کو سیدھا رکھے [illegible] جمعیت اور حرمت اور تعظیم تمام کے ساتھ خوش الحانی سے ذکر شروع کرے۔ بعد اعوذ و بسم اللہ کے باخلاص تمام تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت پڑھ کے سر کو قلب کی طرف کہ زیر پستانِ چپ بفاصلہ دو انگشت کے واقع ہے۔ جھکا کے کلمۂ لا کو قوت اور سختی سے دل کے اندر سے کھینچے اور آواز کو دل سے منہ ہوتے ہوئے لے جا کر سر کو پشت کی طرف مائل کر کے تصور کرے کہ غیر اللہ کو دل میں سے نکال کر پس پشت ڈال دیا اور دم کو چھوڑ کر لفظ اِلَّا اللّٰهُ کو تعداد اور سختی سے دل پر ضرب مارے اور تصور کرے کہ عشق اور نورِ الٰہی کو دل میں داخل کیا۔ اسی طرح اس نفی و اثبات کو فکر اور ملاحظہ اور ربط کے ساتھ دو سو بار کہے۔ اور ذکر میں نو بار لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور دسویں مرتبہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہے۔ بعد اس کے بطور سابق تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہے لیکن ابتدائی کلمۂ لَا اِلٰهَ میں لا معبود اور متوسط لا مقصود اور منتہی لا موجود ملاحظہ کرے۔ اس کے بعد لمحہ دو لمحہ مراقب ہو کے تصور کرے کہ فیضانِ الٰہی عرش سے میرے سینے میں آتا ہے۔

طریقِ ذکر اثبات مجرد

پھر دو زانو بیٹھے اور کمر سیدھی کرے اور سر کو داہنے مونڈھے پر لے جا کے لفظ اِلَّا اللّٰهُ کو زور اور سختی سے دل پر ضرب کرے۔ اس کو چار سو بار و بادم کرے پھر بطور سابق تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہے اور لمحہ دو لمحہ مراقب رہے۔

---

[1] تعلیم الدین صفحہ [illegible]

طریقِ ذکرِ اسمِ ذات

پھر ذکرِ اسمِ ذات اَللّٰہُ اَللّٰہُ کا کرے۔ اس طرح سے کہ اوّل حرف ہائے لفظ اَللّٰہُ کو پیش اور دوسرے ہائے لفظ اَللّٰہُ کو ساکن کرے۔ یعنی جزم دے اور آنکھیں بند کر کے اور سر کو داہنے مونڈھے پر لا کر لفظ مبارک اَللّٰہُ اَللّٰہُ کی دونوں ضرب جہر اور قوت سے دل پر لگائے اس ذکرِ اسمِ ذات دو ضربی کو چھ سو بار دوام کرے۔ لیکن دسویں یا دسویں بار اَللّٰہُ حَاضِرِیْ۔ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ۔ اَللّٰہُ مَعِیْ (ترجمہ۔ اللہ تعالیٰ میرے پاس ہے اور مجھے دیکھ بھال رہے ہیں اور میرے ساتھ ہیں) مع ملاحظۂ معنی کے کہتا رہے۔ تاکہ کیفیت اور لذت ذکر کی اور دفع غفلت و خواب حاصل ہو۔ بعد اس کے بطور سابق تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہے پھر ایک ضربی اسی طرح سر کو داہنے مونڈھے کی طرف موڑ کر لفظ مبارک اللہ کو دل پر سو بار دوام کرے بعد تین بار کلمۂ طیب اور ایک بار کلمۂ شہادت کہہ کر درود شریف اور استغفار گیارہ گیارہ بار پڑھ کر دعا مانگے اور مناجات کرے۔

اس ذکر کے بعد اگر نیند کا تقاضا ہو، ذرا سو جاوے، پھر بعد نماز صبح تلاوت قرآن مجید اور ایک منزل مناجات مقبول پڑھنے کے بعد بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جس قدر سہل ہو۔ اسم ذات خفیف جہر اور معتدل ضرب سے خلوت میں بیٹھ کر کرے اور دوپہر کو قیلولہ کرے بعد ظہر اسی طرح بارہ ہزار سے چوبیس ہزار تک جس قدر سہولت کے ساتھ عصر کے قبل قبل ہو جاوے اسم ذات کا ورد کرے اور عصر کے بعد اگر شیخ فارغ ہو تو مغرب تک شیخ کی خدمت میں حاضر رہے اور اگر فارغ نہ ہو یا وہاں موجود ہی نہ ہو یا اس کے قلب میں زیادہ اشتیاق نہ ہو تو جنگل باغ ندی نہر وغیرہ کی سیر کو چلا جاوے۔ اگر شیخ موجود ہو تو اس سے اجازت لے کر جاوے۔

ذکرِ جہر اور ضرب

ان[2] اذکار مذکورہ بالا اذکار میں خفیف سا جہر اور معتدل ضرب قلب کرے۔ مگر جہر مقصود بالذات اور قربت کی خصوصیت نہیں۔ ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے اور حدیث میں وارد ہے اِنَّکُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَلَا غَائِبًا (ترجمہ۔ بیشک تم بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو) میرے نزدیک اسی اعتقاد کی نہی پر

---

[1] قصد السبیل صفحہ [illegible] [2] قصد السبیل صفحہ [illegible]

معمول ہے اور بعض نے جہر مفرط کو اسی کا محمل بنایا ہے جس سے دوسرے لوگ متاذی ہوں۔ مثلاً نائمین کو تشویش ہو اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے فرمانے کی بھی ایسی توجیہات ہیں۔ ورنہ جہر فی نفسہ جائز ہے۔ جیسا بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے رفع الصوت بالتکبیر کا علامت انصراف عن الصلوٰۃ (نماز کا ختم ہونا) عہد نبوی میں اور سنن میں وتر کے بعد سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ تین بار میں رفع صوت مروی ہے۔ معلوم ہوا کہ جہر کی حیثیت ہو۔ جہر اس حیثیت سے کہ وہ جہر ہے عبادت نہیں اور اگر مقصود تو ذکر کو سمجھیں اور جہر کو کسی مصلحت سے اختیار کریں جیسے دفع خواطر و حصول جمعیت وغیرہ تو یہ صورت ممنوع نہیں۔ بشرطیکہ کوئی اور عارض مانع نہ ہو۔ بہر حال جہر مفرط تو مطلقاً ناجائز ہے جس سے خود کو مشقت ہو یا دوسروں کو اور جہر معتدل میں تفصیل ہے۔ اگر خود جہر کو بقصد ثواب اختیار کرے۔ تو یہ بھی ناجائز اور بدعت ہے (در) اِلَّا فِيمَا وَرَدَ الشَّرْعُ بِالْجَهْرِ فِيهِ كَالْحَجِّ بِالتَّلْبِيَةِ وَالْجَهْرِ بِتَكْبِيرَاتِ التَّشْرِيقِ وَنَحْوِهِ. (۱۲) اور اگر مقصود غیر ذکر ہو اور جہر معتدل سے ہو اور اختیار للمصلحت ہو تو وہ بدعت نہیں۔ کیونکہ ایسا جہر شریعت سے ماذون فیہ بلکہ احادیث میں وارد ہے۔

جہر[۳] میں یہ حکمت بھی کہی گئی ہے کہ اس سے وسوسوں و خطرات کم آتے ہیں۔ سو یہ فائدہ خفیف جہر سے بھی حاصل ہے اسی طرح ضرب بھی قربت نہیں ہے اس میں ایسی ہی حکمت طبیہ ہے وہ یہ کہ حرکت سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور حرارت سے رقت اور رقت سے تاثر اور تاثر معین ہوتا ہے اطاعت اور محبت میں اور وہ مقاصد میں سے ہیں۔ پس ضرب ذریعہ مقصود ہونے سے مقصود بالغیر بن جاتا ہے۔ لیکن زیادہ ضرب سے قلب میں خفقان پیدا ہونے کا ڈر ہے۔ لہٰذا اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔

ذکر کے فائدے

آخرت میں ثمرہ تو یقینی ہے اور اصل وعدہ عطائے ثمرات کا آخرت ہی میں ہے۔ لیکن دنیا میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو اس کے قلب پر علوم مجیدہ و معارف حقہ کے باب میں مولانا کا ارشاد ہے۔ ؎

۱؎ بعید والا عید صفحہ ۔ ۲؎ قصداً سینہ میں ضرب ۔ ۳؎ تکبیر کے ساتھ آواز کا بلند کرنا۔

مگر چونکہ یہ ان کا مذہبی شعار نہیں، اور خطرات دفع کرنے کیلئے نافع ہے اس لیے اس کو ہم اپنے ہاں لے لیتے ہیں اور اس میں کچھ حرج نہیں۔ تشبہ اس میں ممنوع ہے کیونکہ جو چیز کسی دوسری قوم کا مذہبی شعار ہو یا قومی، محض تدبیر کے درجہ میں ہو اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کے لیے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے چونکہ حبس دم بھی دفع خواطر کی محض ایک طبعی تدبیر ہے۔ اس لیے اس کا استعمال جائز ہے۔ کیونکہ یہ اخذ تدبیر ہی سے ہے نہ کہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں۔ اور اس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے تو یہ انتظام و تدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا محض ایک تدبیر تھی۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی۔

طریق کار

ذکر کرنے کے وقت اگر قلب میں جمعیت و خشوع معلوم ہو اور وہ بدرجۂ تمام پڑھتی جائے۔ اور وساوس و خطرات میں کمی ہوتے رہے اور دل لگا کر کرے تب تو اشغال کی ضرورت نہیں اور اگر ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی و خشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل بھی کر لیا جائے۔

شغل انحد، سرمدی اور سلطان الاذکار

اشغال تو بہت ہیں مگر میرے نزدیک انفع اور اسہل و سب سے زیادہ مفید اور آسان (شغل) انحد ہے۔ وہ آواز کو سرمدی و سلطان الاذکار سے گویند (اور اس کو ذکر سرمدی اور سلطان الاذکار کہتے ہیں)

عَنْ أَبِیْ بَکْرٍ[1] قَالَ عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ	حضرت ابوبکر صدیق رضی سے روایت ہے کہ
اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عِنْدَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو
الدُّعَاءِ وَ فِیْہِ أَنْ تَرْزُقَنِیْ	دعا سکھلائی اور اس دعا میں یہ بھی ہے کہ
الْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ وَالْعِلْمَ	مجھ کو قرآن مجید اور نافع علم عطا

---

[1] [illegible]

وَاَنْ تَخْلِطَہٗ بِلَحْمِیْ وَدَمِیْ — فرمائیے اور اس کو میرے گوشت اور خون اور
وَسَمْعِیْ وَبَصَرِیْ الحدیث — کان اور چشم میں پیوست اور مخلوط کر دیجئے

(رواہ رزین)

پس حدیث میں تخلیط القرآن بجمیع الاعضاء والاجزاء کی دعا ہے اور حدیث میں ہے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ الدُّعَاءَ — بے شک اللہ غیر متوجہ قلب کی دعا قبول نہیں
عَنْ قَلْبٍ لَاہٍ۔ — فرماتے۔

پس اس حدیث سے اس دعا کے وقت اس خلط کا تصور و استحضار ضروری ہوا۔ اور اللہ کا کلام اور اللہ کا نام اس تصور میں مساوی ہیں۔ پس ہر بن مو سے "اللہ ہو" کے جاری ہونے کا تصور اس سے نافع ہونا ثابت ہو گیا جو اس شغل کا طریقہ ہے[1] اور وہ یہ ہے کہ

از سر تا قدم بہر بن موئے وجود خود بجمیع — سر سے قدم تک اپنے وجود کے ہر بن مو سے
ہمت متوجہ شود یعنی چنانکہ در آمد و — پوری ہمت کے ساتھ متوجہ ہو یعنی یہ سمجھے
رفت نفس از ہر بن موئے اللہ ہو جاری — کہ نفس کے آنے جانے میں ہر بال کی جڑ
است۔ (ضیاء القلوب) — سے اللہ ہو جاری ہے۔

شغل[1] کا اچھا وقت آخر شب ہے۔ بارہ تسبیح کے بعد۔ دوازدہ تسبیح پر جب ایک چلہ گزر جاوے اس وقت شروع کرنا چاہیے لیکن حبس نہ کرے۔ آجکل اکثر اس سے قلب و دماغ دونوں ماؤف ہو جاتے ہیں۔ صرف آنکھیں ویسے ہی بند کر لے۔ اور کانوں کو انگشت شہادت سے ذرا زور سے بند کر لے۔ اس سے کان میں ایک صوت لا تعینی جنہ جنہ پیدا ہوگی۔ پس آواز کی طرف قلب کو متوجہ رکھے۔ اور زبان سے یا قلب سے اسم ذات کا ورد رکھے۔ تاکہ اتنا وقت غفلت میں نہ گزرے۔ کیونکہ اس صوت میں مشغول ہونا ذکر نہیں۔ کیونکہ یہ صوت نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی صفت تو ہے نہیں۔ جیسا بعض کو دھوکہ ہو گیا۔ بلکہ عالم غیب میں سے کسی مخلوق کی بھی نہیں۔ صرف اسی کے دماغ میں ہوا بند ہو کر متموج ہونے لگتی ہے۔ باوجود اس کے پھر اس کی طرف مشغول کرنا صرف اس لیے تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ صوت محو کن ہے اور لذیذ ہے۔

---

[1] تصد السبیل ص۱۹

بلکہ بعض اوقات اس کے اندر نہایت دلربا و دلفریب آوازیں پیدا ہوتی ہیں کہ شاغل کو محو کر دیتی ہیں۔ اور محسوس و لذیذ چیز کی طرف متوجہ ہونے سے طبعاً دوسرے خطرات گم ہو جاتے ہیں۔ تو اس سے ذہن کو ایک طرف توجہ تام کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ پھر شغل چھوڑ کر اس توجہ کو مقصود حقیقی کی طرف منصرف کر دیتے ہیں جس کی طرف اولاً متوجہ ہونا بوجہ اس کے غائب عن الحواس ہونے کے احیاناً محتاج تکلف تھا

شغل اسم ذات

آنکہ در یک پارچہ کاغذ شکل قلب صنوبری برنگ سرخ یا نیلگوں کشیدہ و دراں لفظ اللہ بآب طلا یا نقرہ بنویسد و پیوستہ نظر براں دارد۔ تاکہ نقش ایں اسم در دل پدید آید یا صورت وی را بر صفحۂ دل بنویسد و مدام مترقب آں باشد تا غیب از حواس پدید آید۔[1]

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر قلب صنوبری کی شکل سرخ یا نیلگوں کھینچ کر اس پر آب زر یا نقرئی پانی سے لفظ اللہ لکھے اور ہمیشہ اس پر نظر رکھے تاکہ اس نام کا نقش دل پر رونما ہو جائے یا اس کی صورت صفحۂ دل پر لکھ لے اور ہمیشہ اس طرف متوجہ رہے تاکہ غیب حواس سے رونما ہو جائے۔

حبس بصر

فی صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یجاوز بصرہ اشارتہ۔[2] اخرجہ ابوداؤد

نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ آپ کے اشارہ بابہ سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

قال یا انس اجعل بصرک حیث تسجد۔ رواہ البیہقی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے انس اپنی نگاہ کو سجدہ کی جگہ رکھو۔

حبس البصر، ربط النظر لاجتماع الخاطر ایک شغل ہے کہ کسی چیز کی طرف نگاہ جما کے دیکھے جاوے مقصود اس سے اور جمیع اشغال سے اجتماع خاطر و یکسوئی ہوتی ہے۔ ان دونوں حدیثوں

---

[1] تفہیم منیرن صفحہ ۔ [2] الکشف صفحہ ۳۶۹، ۴۴۳

فیراک رواہ مسلم۔ احفظ اللہ تجدہ تجاھک رواہ احمد والترمذی — کو نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھو اپنے مقابل پاؤ گے۔

ماہیت و حقیقت

حق تعالیٰ کی ذات و صفات۔ یا کسی مضمون کا دل سے کثرت سے دوران میں یا ایک محدود وقت تک اس غرض سے کہ اس کے غلبہ سے اس کے مقتضا پر عمل ہونے لگے۔ تدبر سے متوجہ ہو۔ اور اس کا تصور مراقبت کے ساتھ رکھنا مراقبہ کہلاتا ہے جو کمال مقصود قلب میں سے ہے۔ ان مراتب سے تصور نفس راسخ ہو جاتا ہے اور اس رسوخ میں مشائخ عوام سے ممتاز ہیں۔

مراقبہ کے متعلق دو چیزیں اور ہیں۔ ایک مشارطہ مراقبہ سے پہلے ہے۔ دوسری محاسبہ جو مراقبہ کے بعد ہے۔ مشارطہ یہ کہ روزانہ صبح کو اٹھ کر تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے نفس کو خوب فہمائش کرے کہ دیکھو فلاں فلاں کام کرو۔ فلاں فلاں مت کیجو۔ اس کے بعد مراقبہ یعنی نگہداشت اس معاملہ کی رکھنا جب دل حضور ہو۔ پھر سونے کے وقت محاسبہ کرے یعنی صبح سے شام تک جو اعمال کیے ہیں ان کو تفصیلاً یاد کرے جو نیک کام کیے ہوں۔ ان پر شکر الٰہی بجا لائے۔ جو برے کام کیے ہوں یا نیک کاموں میں کوئی آمیزش ہو گئی ہو۔ اس پر نفس کو ملامت و زجر و توبیخ کرے اور اگر خالی زجر و توبیخ کافی نہ ہو تو کچھ سزا بھی تجویز کر کے عملدرآمد کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ — چاہیے کہ دیکھ بھال لے ہر شخص کہ کل قیامت کے لیے کیا چیز آگے بھیجی ہے۔

مراقبہ محبت حق

یہ مراقبہ کیا کرے کہ حق تعالیٰ کو مجھ سے محبت ہے اور حق تعالیٰ مجھ کو چاہتے ہیں۔ یہ مراقبہ بہت مفید ہے۔ اس سے بندہ خواہ کیسی ہی مصیبت اور پریشانی میں ہو۔ مگر جہاں یہ مراقبہ کیا۔ ساری پریشانی رفو چکر۔ کیونکہ یہ یقین کرے گا کہ جب اللہ تعالیٰ کو مجھ سے محبت ہے تو اس مصیبت میں ضرور میرا کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ ورنہ محبت میں محبوب کو کون تکلیف دیتا ہے۔

ـه تکشف ص ۲۷۴-۲۷۵ ـه [illegible] ص [illegible] ـه [illegible] ص [illegible] ـه [illegible] ص [illegible]

مراقبہ رویت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی[1] کیا اس کو خبر نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

یا ملاحظہ معنی صورت رویت حق تعالیٰ خود را در ملاحظہ دار و بداں مراقبت نماید تا وجدان حق متحقق گردد۔

یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ میرے ظاہر و باطن پر مطلع ہے اور کوئی بات کسی وقت اس سے پوشیدہ نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی عظمت و قدرت وجلال اور اس کے عذاب وعقوبت کو بھی یاد کرے اس کی مواظبت سے وہ دھیان بندھنے لگے گا۔ پھر کوئی کام اللہ کی مرضی کے خلاف اس سے نہ ہو گا۔

مراقبہ ارض

ہماری اصل تو خاک ہے۔ لہٰذا ہم کو خاک بن کر رہنا چاہیئے۔ مٹی ہو کر تکبر کرنا بہت ہی نازیبا ہے۔ پھر آخر میں بھی ہم مٹی ہی میں ملنے والے ہیں۔ یہ جسم سب خاک خوردہ ہو جائے گا اور ایک دن ہم زمین کے اوپر سے اس کے اندر پہنچ جائیں گے تو اس کیلئے ہم کو ایسے اعمال کرنے چاہئیں جو اس وقت کارآمد ہوں۔ اس مراقبہ کو اصلاح حال میں بہت ہی تاثیر ہے۔

مراقبہ تفویضیہ عبدیہ

یہ مراقبہ اور استحضار کہ ہم کون ہیں۔ اپنے اپنے تصرف کرنے والے یا تجویز کرنے والے تصرف اور تجویز کا مجوب حقیقی ہی کو حق ہے اور وہ جو تصرف اور تجویز فرماتے ہیں سب خیر محض ہے۔ گو اس وقت ہماری سمجھ میں نہ آوے۔ بلعد میں آ بھی جاتا ہے۔ البتہ جن اعمال کا ہم کو امر فرمایا ہے وہ خود ان کا تصرف ہے۔ اس کا اہتمام بیا اپنا تصرف نہیں بلکہ ان کے تصرف کو تسلیم کرنا ہے اور اس کے ساتھ اس یقین کا تازہ اور قوی کرنا کہ اگر ان کے کسی تصرف سے جس کا بندہ کو تحمل نہ ہو سکے صحت برباد ہو جائے بلکہ جان بھی ختم ہو جائے تو ایسا تصرف سب سے بڑی رحمت ہے نیز یہ بھی پیش نظر رکھا جائے۔

زاں بلا ہا کانبیاء برداشتند | سر بچرخ ہفتمیں افراشتند
سپر دم بہ تو مایۂ خویش را | تو دانی حساب کم و بیش را

وانبیاء نے مصائب برداشت کیے۔ ان کے باعث آسمان ہفتم تک سر بلند ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو تیرے

---

[1] آئینہ معرفت ص ۹۰ ۔ [2] انفاس عیسیٰ ص ۲۴۳، ۲۴۲، ۲۴۳

حوالہ کرتا ہوں کم و بیش کا حساب تو خود جانتا ہے۔

مراقبۂ فنا

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ

جو کچھ زمین پر ہے فانی ہے اور تیرے رب کی ذات باقی رہے گی جو صاحب بزرگی اور عزت والا ہے۔

ملاحظہ معنی صورت یقینی فنا جملہ موجودات وبقائے آں ذات بے کیف تصور نماید وبچشم دل آنرا بہ بیند و دراں محو شود۔ تاکہ ایں معنی بوجہ احسن جلوہ گر گردد و فنائے سالک واضمحلال عقل وعلم رو نماید۔

(تمام موجودات کی فنا اور اس ذات بے کیف کی بقا کا تصور کرے اور دل کی آنکھوں سے اس کو دیکھے۔ اور اس میں مستغرق ہو جائے تاکہ یہ معنی احسن طریقہ سے جلوہ گر ہو جائیں اور فنا سالک اور عقل وعلم کا اضمحلال حاصل ہو جائے)

مراقبۂ سفر آخرت

جس طرح اسفار دنیا میں موانع سفر سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ الغرض نقصان پر طبیعتوں میں آتا نظر پاتے ہیں۔ اور جو امور معین ہوتے ہیں۔ ان کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو چاہیے کہ اپنی ہر ہر نقل و حرکت کو تنقیدی نظر سے دیکھیں کہ آیا یہ ہمارے سفر آخرت کے واسطے عائق ہے یا معین۔ اگر کوئی حالت یا فعل ہمارا مانع سفر ہے تو اس سے احتراز کریں۔ اور جو امور اس سفر میں ہمیں معین ہیں۔ رغبت کے ساتھ بطیب خاطر اختیار کریں۔ یہ خیال رکھیں کہ کہیں کوئی خار راہ ہمارے اس شاہراہ پر رونما نہ ہو۔ خدا کا راستہ طویل ہے اور ہم اس پر چل رہے ہیں۔ تو ہم ہر وقت سفر میں رہتے۔ اس لیے صاحب ہمت کو ہر وقت سفر در پیش ہو۔ وہ کیونکر مطمئن ہو کر بیٹھ سکتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اسی باب میں اس طرح بیان کی گئی ہے کان دائم الفکرۃ متواصل الاحزان کہ آپ ہمیشہ فکر و سوچ اور رنج و غم میں رہتے تھے اور اسی فکر و غم کا یہ اثر تھا کہ آپ کبھی کھل کر نہ ہنستے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کان جل ضحکہ التبسم کہ آپ کا ہنسنا یہ ہوتا تھا کہ تبسم فرما لیتے تھے۔[2] اور یہ بھی ہماری خاطر سے تاکہ لوگوں کا کلیجہ پھٹ نہ جائے اور

۱؎ نعیم ادب ص ۔۔ ۲؎ انفاس عیسیٰ ص ۳۸۲ ح ۸۶

وہ پوچھا نہ کہیں کہ جب حضور ہر وقت مگین رہتے ہیں تو پھر ایک جہاں تھکانہ ہے لوگ اس سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ انسان کو چاہئیے کہ یہ تصور پیشِ نظر رکھے کہ میں ہر وقت سفر میں ہوں اسے بے چینی اور عدم اطمینان جس کے لوازم سے ہے کیونکہ مسافر کو منزل پر پہنچنے سے پہلے اطمینان نہیں ہوا کرتا بلکہ مسافر کیلئے غیر منزل کے ساتھ اطمینان اور رضا مزاحم سفر ہے۔ جو مسافر غیر منزل سے دل لگائے گا۔ اور اسی میں قیام کر کے بیٹھ جائے گا یقیناً منزل پر نہ پہنچ سکے گا تو آپ کو مسافر کی طرح فکر مند اور بے چین رہنا چاہئیے۔ بے فکر نہ ہوئیے بلکہ برابر عمل میں لگے رہئیے اور اپنی طرف سے راستہ قطع کرنے کی برابر ہمت کیجئے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات و اعانات کا لطف دیکھئے کہ وہ کیونکر طویل مسافت کو قصیر اور دشوار گزار طریق کو سہل بنا دیتے ہیں۔ اگر کبھی سستی ہو جائے تو پھر از سرِ نو تجدید کی فکر کیجئے۔ اگر گناہ ہو جائے فوراً توبہ کر لیجئے۔ اس سے پھر بندہ راستہ ہی پر آ جاتا ہے۔

مراقبۂ ترغیب مجاہدہ

صاحبو! اپنے وطن جا رہے ہو۔ اور اتنی سست رفتار کہ بیٹھے بیٹھے گزر رہے ہو۔ اصل مکان کی طرف تو جانور بھی تیزی سے چلا کرتے ہیں۔ بیلوں کو دیکھئے کہ وطن کی طرف کس شوق سے قدم اٹھا کر چلتے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ انسان ہو کر بھی اپنے اصلی وطن کی طرف تیزی کے ساتھ قدم نہیں اٹھاتے۔ صاحبو! سستی نہ کرو۔ تیزی کے ساتھ چلو تمہارا اصلی وطن اصلی مستقر آگے ہے تم دنیا میں کہاں پھنسے رہ گئے اس کے ساتھ کیوں دل لگا لیا۔

مراقبۂ موت

اکثروا ذکر ھاذم اللذات الموت لذت کے مٹانے والی شئ یعنی موت کو بہت یاد کیا کرو۔

آدمی تھوڑی دیر بیٹھ کر سوچ لیا کرے کہ مجھے مرنا ہے اور مر کر قبر میں جانا ہے وہاں سانپ بچھو ہیں یا جنت کے باغ ہیں۔ اگر اچھے عمل ہیں تو قبر باغ ہے اور اگر برے ہیں تو سانپ اور بچھو ہیں پھر قبر سے اٹھنا ہے اور حساب کتاب کے لیے پیش ہونا ہے اور پل صراط پر چلنا ہے اسی طرح تمام واقعات قیامت کو یاد کر لیا کرے۔ جب یہ مراقبہ صحیح ہو جائیگا تو غلطی سے بھی گناہ نہ ہوگا

ـه ملفوظات الاحکام ص ... ـه ذکر الموت ص ۲۰۲

انشاء اللہ تعالیٰ ۔

نفع مراقبۂ موت مراقبہ موت و مابعد الموت حالات قبر اور قیامت کے سوچنے سے جو خوف پیدا ہوتا ہے، عین مطلوب ہے کہ معین آخرت ہے۔ لیکن اگر اس کے تصوراً استحضار سے کوئی مرض یا جسمانی ہونے کا خوف ہو تو روزانہ نہ کریں گے، گاہ گاہ جب غفلت محسوس ہو کر لیں ۔

مراقبۂ حیات اگر موت کے سوچنے سے دل گھبراوے تو حیات کو سوچو کہ اس حیات کے بعد ایک دوسری حیات ہے جو خیر ہی خیر ہے۔ ابقیٰ بھی، الذ بھی اور اشہی بھی ۔

مراقبۂ عذاب آخرت عذاب آخرت کا سوچنا تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے، اس سے کلفت اور کدورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس فکر سے قلب میں نورانیت وانشراح ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس فکر سے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور تعلق ہو جاتا ہے اور تعلق مع اللہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے۔ حدیث شریف میں ہے ۔

من جعل الهموم همًّا واحدًا هم	جس نے تمام غموں کو ایک غم بنا لیا یعنی
آخرة كفاه الله هم دنياه	آخرت کا غم تو اللہ تعالیٰ اس کے دنیوی غموں
ومن تشعبت الهموم احوال	کے لئے کافی ہوگا اور جس نے مختلف غموں کو اپنے
الدنيا لم يبال الله فى اى	اوپر حاوی کر لیا تو اللہ کو کوئی پروا نہیں کہ کس
اودية هلك الخ	وادی میں ہلاک ہوتا ہے ۔

۱؎ انفاس عیسیٰ ص۳۰۳ ۲؎ کمالات اشرفیہ ص۱۲۴ ۳؎ انفاس عیسیٰ ص۸۲ ۴؎ یا تصور

۵؎ زیادہ لذیذ ۶؎ زیادہ پسندیدہ ۔

باب سوم - فاعلہ مفیدہ مع الخطر

پہلی فصل - تصورِ شیخ

عن ابن مسعود[1] قال کانّی انظر الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یحکی نبیا من الانبیاء ضربہ قومہ فادموہ وھو یمسح الدم عن وجھہ ویقول اللّٰھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔ متفق علیہ

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ نبیوں میں سے ایک نبی کی حکایت فرماتے ہیں جن کو ان کی قوم نے مارا تھا اور خون آلود کر دیا تھا اور وہ اپنے چہرہ سے خون پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ اے اللہ میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ جانتے نہیں

گو تصورِ شیخ کی نسبت یہ بات زائد ہے کہ وہ اس کی نفس حقیقت سے خارج ہیں اور اسی طرح جو اس کے عوارض ہیں ان سے بھی اس حدیث میں تعرض نہیں مگر اس کی جو نفس حقیقت ہے یعنی غائب کی صورت مثل حاضر کے نظر کے سامنے آجانا وہ اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہے البتہ اس کی بعض خصوصیات پر جو بوجہ جہل اہل زمانہ کے کچھ مفاسد مرتب ہوتے دیکھ کر محققین اکثر اس سے منع کرنے لگے ہیں۔

حقیقت تصورِ شیخ | اس[2] کو برزخ، رابطہ اور واسطہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے یہ معنی تو آج کل کسی محقق نے نہیں فرمائے کہ معاذ اللہ پیر کی شکل میں حق ہے یہ تو محض باطل ہے اگر اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ سے دھوکا ہو

---

[1] مشکٰوۃ صفحہ [illegible] [2] تعلیم الدین صفحہ [illegible]

دے۔ پس یہی دوسری صورت تصورِ شیخ کی ہے کہ سب تصورات کو ایک تصور میں جمع کر کے جب یکسوئی حاصل ہو جائے تو اس کو بھی ترک کر دیا جائے۔ تو وہ مقصود بالذات نہ تھا۔ بلکہ مقصود بالغیر تھا۔ اس لیے جب یہ غرض حاصل ہو جائے تو شیخ کا تصور بھی دل سے نکال دے۔ اور صرف ذاتِ حق کی طرف متوجہ ہو جائے۔ پھر اگر خیالات آجائیں تو پھر شیخ کا تصور کرے جب خیالات دفع ہو جائیں۔ پھر ذاتِ حق کی طرف متوجہ ہو جائے کیونکہ مقصود حقیقتاً ذاتِ رب اور خود حق تعالیٰ کا براہِ راست تصور کرے تو وہ بہتر ہے۔

بہرحال اس شغل میں جو کچھ حکمت اور فائدہ ہو۔ راقم (حضرت مجدد تھانوی[1]) کا تجربہ ہے کہ یہ شغل خواص کو تو مفید ہوتا ہے اور عوام کو سخت مضر کہ صورت پرستی کی نوبت آجاتی ہے۔ اسی واسطے حضرت امام غزالیؒ وغیرہ محققین نے عوام اور اغبیاء کے لیے ایسے ایسے اشغال کی تعلیم سے منع فرمایا ہے جس سے کشف وغیرہ ہوتا ہو۔ اس لیے عوام کو تو بالکل اس سے بچانا چاہیئے اور خواص بھی اگر کریں تو احتیاط کی حد تک محدود رکھیں۔ اس کو حاضر ناظر اور ہر وقت اپنا معین و دستگیر نہ سمجھیں کیونکہ کثرتِ تصور سے کسی صورتِ مثالیہ روبرو حاضر ہو جاتی ہے۔ کبھی تو وہ محض خیال ہوتا ہے اور کبھی کوئی لطیفۂ غیبی اس شکل میں متمثل ہو جاتا ہے اور شیخ کو اکثر اوقات خبر تک بھی نہیں ہوتی۔ اس مقام پر اکثر ناواقف کو لغزش ہو جاتی ہے۔

(لہٰذا) مجدد کو اس[2] (تصورِ شیخ) سے سخت انقباض ہے۔ اس طرح اجمالاً کسی کے ساتھ کسی مخلوق کی طرف توجہ کرنا توحید کے خلاف ہے اس سے غیرت آتی ہے کہ غیر کی صورت ایسے طریق پر ذہن میں جمائیں جو حق تعالیٰ کے لیے زیبا تھا۔

دوسری فصل۔ عشق مجازی

مولانا جامیؒ[3] فرماتے ہیں:

متاب از عشق رو گرچہ مجازیست ✦ کہ آں بہر حقیقت کارسازیست

ترجمہ: عشق سے اعراض نہ کر اگرچہ وہ مجازی ہو۔ کیونکہ وہ عشقِ حقیقی کے لیے سبب ہے۔

---

[1] تعلیم الدین صـ۱۶۱ ۔ [2] الکلام الحسن صـ۷۵ ۔ [3] نوادر النوادر صـ۶۹۹ ج ۲ ملخصاً۔

اور مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

عاشقی گر زیں سر و گر زاں سر است　　عاقبت ما را بداں شہ رہبر است

ترجمہ: عشق اگر اس شے کا ہو یا اس شے کا، آخر کار ہمارے لیے اس شاہ (محبوب حقیقی) کی طرف رہبر ہے اور مثلاً بعض بزرگوں کی طرف ایسے واقعات کو منسوب کرنا۔ یہ وہ دلائل ہیں جو عشق مجازی کے جواز میں پیش کیے جاتے ہیں اور مدعیانِ تصوف کی ایک کثیر جماعت اس میں مبتلا ہے مگر چونکہ بعض کو اس میں اتنا غلو ہو گیا ہے کہ بجائے معصیت سمجھنے کے اس کو واسطۂ مشاہدۂ حق سمجھ کر طاعت سمجھنے لگے ہیں۔ پس اس اعتبار سے یہ غلطی ہے۔ اس کی رد دو طرح ہیں ایک اجمالی ایک تفصیلی۔ اجمالی تو یہ ہے کہ ان ہی حضرات کے دوسرے اقوال اس کے خلاف بھی ہیں۔ مولانا جامیؒ کا قول اس کے بعد یہ ہے ؎

ولے باید کہ در صورت نمانی　٭　وزیں پل زود خود را بگذرانی

ترجمہ: لیکن یہ ضرور ہے کہ تو صورت (یعنی عشق مجازی) میں نہ رہ جائے (کیونکہ یہ مثل پل کے ہے) اور اس پل سے بہت جلد گزر جانا چاہیے۔

اور مولانا رومیؒ کا قول اسی قول کے قریب یہ بھی ہے ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود　　عشق نبود عاقبت ننگے بود
عشق با مردہ نباشد پایدار　　عشق را باحی و باقیوم دار
زانکہ عشق مردگاں پایندہ نیست　　چونکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست
عشق آں زندہ گزیں کو باقی ست　　وز شراب جانفزایت ساقی ست

(ترجمہ: جو عشق رنگ روپ کی وجہ سے ہوتا ہے وہ حقیقت میں عشق نہیں۔ بلکہ اس کا انجام ندامت ہے (کیونکہ) عشق فانی شے کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ عشق حی و قیوم (یعنی خداوند تعالیٰ) کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ کیونکہ فانی چیزوں کا عشق دائمی نہیں۔ کہ فانی چیزیں (فنا ہو کر) ہمارے پاس واپس نہیں آتیں۔ پس عشق اس زندہ کا اختیار کر جو ہمیشہ باقی ہے اور تجھ کو روح تازہ کرنے والی (محبت کی) شراب پلاتا ہے)۔ اور چونکہ محققین کے اقوال ان کے دوسرے اقوال و احوال سے متعارض نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کے اقوال و احوال مزعومہ شاہد بالنسبت کے محامل وہ نہیں ہیں جو متمسکین

نے سمجھے ہیں۔ یہ تو اجمالی بحث ہے اور تفصیلی بحث یہ ہے کہ ان کے کامل مسیحی کو بتلا دیا جائے
اور وہ محامل عشقِ مجازی ہم کے موصل الی الحقیقۃ ہونے کے طرق ہیں۔ اگر ایسا اتفاق ہو کہ عشق
مجازی میں بلا قصد مبتلا ہو جائے تو اول عفت و پارسائی اختیار کرے۔ یعنی کوئی امر خلافِ شرع
اس کے ساتھ نہ کرے۔ حتیٰ کہ اس کو قصداً نہ دیکھے۔ نہ اس سے باتیں کرے نہ اس کی باتیں
کرے اور نہ دل میں قصداً اس کا خیال کرے۔ کیونکہ مخالفتِ شرع عشقِ حقیقی کے منافی ہے اور
منافی کے ہوتے ہوئے کب امید ہے کہ عشقِ حقیقی حاصل ہو۔ دوسرے اس سے ظاہراً دوری اختیار
کرے کہ تلاقی و مقابلہ تو کبھی اس پر نظر نہ پڑے۔ نہ اس کی آواز کان میں پہنچے تاکہ اس سے
قلب میں سوز و گداز پیدا ہو۔ اور اگر قصداً یا لغزشاً و اتفاقاً امر سے متمتع رہا تو عمر بھر اسی شغل میں
رہے گا۔ کبھی نوبت نہ آوے گی کہ ادھر سے مطلبِ حقیقی کی طرف توجہ ہو۔ تیسرے یہ کہ خلوت و
جلوت میں یہ سوچا کرے کہ اس شخص کا کمال یا حسن و جمال کہاں سے آیا اور کس نے عطا کیا۔ جب
موصوفِ مجازی کی یہ دلربائی ہے تو موصوفِ حقیقی کی کیا شان ہوگی۔ بقول ع

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا

(یعنی کیا شان ہوگی اس محبوب کی جس نے یہ تمام نگار بنائے ہیں) اس سے اس کا عشق مخلوق سے
خالق کی طرف مائل ہو جاوے گا۔ یہی معنی ہیں اس قول کے کہ شیخ کامل عشقِ مجازی کا ازالہ نہیں
کرتا بلکہ امالہ کر دیتا ہے۔ جس طرح انجن گرم ہو کر اٹھ چلتا ہو تو قطع مسافت کرنے والے کو مناسب نہیں کہ
اس کو بجھا دے۔ بلکہ آگ تو روشن رکھنا چاہیے۔ اور اس کی کل کو پھیر کر سیدھا چلا دیا جائے اور
بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو قصداً عشقِ مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ مراد اس سے
عشقِ حلال ہے۔ نہ حرام کیونکہ معصیت تو موصل الی اللہ ہو ہی نہیں سکتی۔ اور جو اس مشورہ سے
غرض ہے وہ عشقِ حلال (اولاد و بیوی وغیرہ) سے بھی حاصل ہے۔ کیونکہ عشق میں گو وہ مجازی ہو۔
یہ خاصیت ضرور ہے کہ اس سے قلب میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس میں باقی تعلقات
قلب سے دفع ہو جاتے ہیں اور خیال میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب صرف ایک کام باقی رہ جاتا
ہے کہ اس تعلق کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دیا جائے۔ تو بہت آسانی سے قلب خالی ہو جاتا ہے جیسے
گھر کی جھاڑو دے کر تمام خس و خاشاک ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں۔ پھر ٹوکرے میں اٹھا کر باہر

دیا ہے۔ مرتے ہیں جیسے کہ دیکھتے ہیں۔ یہ مثل مریض کے ہے کہ اگر ایک ایک تنکا غیرت سے اٹھا کر باہر پھینکا جائے
زخموں سے بہت مرتب ہو۔ اور پھر بھی اس قدر مناسبت نہ ہو غرض اصلی مقصود ترک تعلقات یا
طلب میں رقت و سوز و گداز پیدا کرنا ہے اور اگر طریق سے حاصل ہو جائے تو بھی کافی ہے بعض
نے اس طریق مجازی کو اختیار کرایا مگر چونکہ اس زمانہ میں اس طریق میں خطرہ شدید ہے کیونکہ
نفوس میں شہوت پرستی و رغبت ہوائی زیادہ ہے۔ اس لیے قصداً ایسے طریق کا چلانا جائز نہیں۔ لہٰذا اگر
اتفاقاً مبتلا ہو جانے پر بطریق بالا اس کا امالہ عشق حقیقی کی طرف کر دینا چاہیئے۔ اور طریقوں کا بدلا
جانا زمانہ کے بدل جانے سے کوئی امر عجیب نہیں اور غضب یہ ہے کہ بعض اس کو ذریعہ قرب الٰہی سمجھتے ہیں
نہ کہ بنا بر مگر معصیت ذریعہ قرب الٰہی کا ہو تو سارے رنڈی بھڑوے کامل دل ہوا کریں۔

طریق علاج

اول یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ بدون ہمت کے آسان سے آسان کام بھی نہیں ہوتا۔ دیکھئے امراض ظاہری کے علاج کیلئے دوا نہیں تلخ و ناگوار پینا پڑتی ہے چونکہ صحت مطلوب ہوتی ہے اس لیے ہمت کر کے پی جاتے ہیں اور امراض باطنی میں تو اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ جب یہ امر معلوم ہو جائے تو اب اس کا علاج سنئے اور ہمت کر کے بنام خدا اس کا استعمال کیجئے۔ انشاءاللہ تعالیٰ شفائے کامل عطا ہوگی۔ علاج اس کا چند اجزا سے مرکب ہے۔

[illegible]

(۱) اس مرد یا عورت سے قطعاً تعلق ترک کر دیجئے یعنی اس (محبوب مجازی) سے ملنا جلنا، آنا جانا، سننا کہ دوسرا شخص بھی اگر اس کا تذکرہ کرے تو قطعاً روک دیا جائے۔ بلکہ قصداً بلا تکلف کسی بہانہ سے اس کو خوب برا بھلا کہہ کر اس سے مخالفت و خصومت کی جائے۔ اس طور پر کہ اس کو ایسی نفرت ہو جائے کہ اصلاً اس کو ادھر میلان و توقع رام ہونے کی باقی نہ رہے اور کسی سے ظاہر اس قدر دوری اختیار کی جائے کہ کبھی غلطی سے بھی اس پر نظر نہ پڑے۔ غرض اس سے کلی انقطاع ہو جائے۔

(۲) ایک وقت خلوت کا مقرر کر کے غسل تازہ کر کے صاف کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر تنہائی میں روبقبلہ ہو کر اول دو رکعت نماز توبہ کی نیت سے پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے روبرو خوب استغفار و توبہ کی جائے اور اس بلا سے نجات دینے کی دعا و التجا کی جائے اور پھر بیٹھ کر ہزار مرتبہ تک لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر اس طرح کیا جائے کہ لَا اِلٰہَ کے ساتھ تصور کیا جائے کہ میں نے سب غیر اللہ کو قلب سے

نکال دیا اور إِلَّا اللّٰه کے ساتھ خیال کیا جائے کہ میں نے محبت الٰہی کو قلب میں جمالیا۔ یہ ذکر ضرب کے ساتھ ہو۔

(۳) جس بزرگ سے عقیدت ہو اس کو اپنے قلب میں تصور کیا جائے کہ بیٹھے ہیں اور سب خرافات کو قلب سے نکال نکال کر پھینک رہے ہیں۔

(۴) کوئی حدیث کی کتاب یا ویسے ہی کوئی کتاب جس میں دوزخ اور غضب الٰہی کا نافرمانوں پر ہونے کا ذکر ہو۔ مطالعہ کثرت سے کیا جائے۔

(۵) ایک وقت جس کو کسی خلوت میں یہ تصور باندھا جائے کہ میں حق تعالیٰ کے روبرو میدانِ قیامت میں حساب کے لیے کھڑا ہوں اور حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اے بے حیا تجھ کو شرم نہیں آئی کہ ہم کو چھوڑ کر ایک مردار کی طرف مائل ہوا۔ کیا تجھ پر ہمارا یہی حق تھا۔ کیا ہم نے تجھ کو اسی لیے پیدا کیا تھا۔ اے بے حیا تو نے ہماری ہی دی ہوئی چیزوں کو آنکھ کو دل کو ہماری نافرمانی میں تو نے استعمال کیا۔ کچھ شرم بھی آئی۔ غرض دیر تک اسی مراقبہ میں غرق و مشغول رہنا چاہیے۔

تنبیہ:۔ اگر ان تدبیروں کا اثر مرتب ہونے میں کسی عارض سے تاخیر ہو جائے تو پریشان نہ ہوں اس کوشش میں بھی اجر ملتا ہے جو اصل مقصود ہے حتیٰ کہ اگر اسی میں جان بھی جاتی رہے تو شہادت کا ثواب ملتا ہے۔ من عشق فعف فکتم فصبر فمات فھو شھید (یعنی جو شخص عاشق ہوا پس پاکدامن رہا اور چھپایا اور صبر کیا۔ پھر مر گیا تو وہ شخص شہید ہے) اور یہ جو مشہور ہے کہ بدون عشق مجازی کے عشق حقیقی حاصل نہیں ہوتا، یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ حظوظ نفسانیہ اور لذات شہوانیہ حاصل کرنے کے لیے بزرگوں کے اقوال کو آڑ بنا رکھا ہے۔ اور دل کا حال اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے ورنہ اللہ سے بھی پوشیدہ نہیں۔ العیاذ باللہ اور حسن پرستی ہو تو سب کچھ اپنے۔

(نوٹ: اسی مقام پر حسن پرستی کے مضمون کو بھی ملاحظہ فرمالیا جائے۔ (مرتب))

تیسری فصل۔ سماع

(غزوۂ خندق یا احزاب میں)

فلما رأى ما بهم من النصب	جب آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
والجوع قال اللهم ان	ان (صحابہ) کی مشقت اور فاقہ کی حالت
العيش عيش الآخرة فاغفر	دیکھی تو ان کے دل بڑھانے کو یہ دعا کی
للانصار والمهاجرة فقالوا	اے اللہ عیش تو آخرت ہی کا ہے، سو انصار
مجيبين له	اور مہاجرین کی مغفرت فرما دیجئے صحابہ نے
نحن الذين بايعوا محمدا	جواب میں یہ کلام منظوم عرض کیا ہم وہ ہیں
على الجهاد ما بقينا ابدا	کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد پر بیعت کی ہے
اخرجه الشيخان والترمذي	جب تک ہم زندہ رہیں گے۔

بعض اہل طریق کا یہ مذاق ہوا ہے کہ جب اسباب عارضہ سے طبیعت میں ملال یا تشویش یا انقباض ہوا ہے اس کے رفع کرنے کے لئے موافق شرائط اباحت کے قدرے سماع سن لیا ہے تاکہ نشاط پیدا ہو کر طاعت مقصودہ سہل ہو جاوے۔ پس مقصود طاعت ہوتی تھی۔ اور سماع اس مقصود کا معین۔ اس حدیث سے اس کا اثبات ہو رہا ہے کہ خندق کا کھودنا جو اس وقت طاعت تھی اور جو کہ در نصب مقصود کا تھا اس میں کلام منظوم سے نشاط افزائی و تسہیل کا کام لیا۔ ایسا کرنے سے دینی مصلحت معلوم ہوتی ہے۔ باقی سماع کو خود مقصود بنا لینا یا اس میں رعایت شرائط کی نہ کرنا مذہب باطل ہے۔ ہرچند یہ مسئلہ اختلافی ہے لیکن اگر مانعین کے دلائل سے بالکل قطع نظر کر کے اس کو مباح سمجھا جاوے تب بھی تو جواز کے بہت سے شرائط ہیں۔ نہ اخوان ہیں۔ نہ زمان نہ مکان۔ صرف ایک رسم رہ گئی ہے۔ ہر قسم کے لوگ مختلف نفسانی اغراض سے جمع ہوتے ہیں۔ اور بزرگوں کے طریق کی بدنامی ہوتی ہے۔ اس مقام پر حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ کے ارشادات فوائد

چنانچہ حضرت سلطان جیؒ کا سماع شرعاً جائز تھا۔ کیونکہ وہ آداب اور شرائط کی رعایت کے ساتھ تھا مگر آج بازاری لوگ بھی رخصت کہتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اور حرام کو اباحت دینا کیسا سخت ہے۔ حضرت سلطان جیؒ کے زمانہ میں قاضی ضیاء الدین سنامی قاضی سنت وہ ہمیشہ حضرت سلطان جیؒ کے سماع پر نکیر کرتے تھے۔ قاضی صاحب کا جب انتقال ہو گیا تو حضرت سلطان جیؒ پر گریہ طاری ہو گیا اور فرمانے لگے کہ افسوس آج شریعت کا ستون منہدم ہو گیا

(بزم رشید ص۱۱۳)

(تفصیل بالا پر غور فرمائیں اور خود انصاف کریں کہ اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے نیز اگر آپ اس مسئلہ کے متعلق بالتفصیل معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو رسالہ "حق السماع" مصنفہ حکیم الامت مجدد الملت مولانا محمد اشرف علی صاحب حضرت قدس سرہ العزیز کو ضرور ملاحظہ فرمائیں)

دو درخواست کرنے والے کی عرضی قبول کر لیتا ہوں جب وہ میرے حضور میں درخواست کرے۔ حدیث
شریف میں آیا ہے۔ دعا مانگتے وقت اجابت کا یقین رکھو۔ جب شک اور شبہ کی ملاوٹ ہے تو پھر
دعا مقبول کیونکر ہوگی۔ البتہ صورت اجابت بعض اوقات یہ ہوتی ہے کہ بلا سے محفوظ ہو گیا۔ تیسری
صورت یہ ہے کہ شے مطلوب ذخیرہ رکھ دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی نادان لڑکا اشرفی یا روپیہ مانگے تو بعض
اوقات اس کے نام سے کسی تجارت کی کوٹھی میں جمع کر دیتے ہیں اور بوجہ نادانی خود اس کو نہیں دیتے کہ
جب ہوشیار ہوگا اسے حسب مصلحت خرچ کرے گا۔ اب دے کر کیونکر اسکو خراب کریں اور کیا کرے گا
حق تعالیٰ بھی اپنے بندے کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں کہ اس سوال سے اچھی نعمت آخرت میں ذخیرہ
فرما دیتے ہیں۔

مذہب حق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل بااختیار ہے۔ جب یہ ہے تو اس کی قدرت جس کی وجہ سے
ممکن کا وجود ہوا اور ظہور ہوا۔ ممکنات کی تاثیرات کو ظاہر بھی کر سکتی ہے اور روک بھی سکتی ہے اسی وجہ سے
دعا کی جاتی ہے کہ آپ اپنی مشیت کا تعلق اس سے فرمائیں۔ یہ تو عجیب ہے کہ اسباب خاصہ سے وہ
سبب پیدا ہو لیکن یہ خود بھی ضروری نہیں کہ تمام اسباب جمع ہونے پر ہی ترتب اثر ہو۔ بلکہ بعض
دفعہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و عنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا و زاری پر نظر فرما کر محض اپنی
قدرت سے تھوڑے سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ حدیث
شریف میں یہ قصہ موجود ہے کہ ایک نیک بی بی نے تنور میں سوختہ جھونک کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی
اللھم ارزقنا اے اللہ ہم کو رزق دے۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھا کہ تنور روٹیوں سے بھرا ہے
اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں میں قوت یقینیہ زیادہ تھی۔ پورا یقین اس کی رزاقی پر تھا۔ چنانچہ اس کا
ظہور بلا اسباب ہوا۔ ورنہ جتنے اسباب اس کی وسعت میں تھے اختیار کیے اور باقی کے لیے اللہ تعالیٰ
پر بھروسہ کیا اور یہ حضرات تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ تھے۔ ابلیس کے یقین اور توقع اجابت دعا کی کیفیت
دیکھئے کہ عین غضب اور قہاری کے موقع پر بھی اس کو پورا بھروسہ تھا کہ غضب الٰہی اجابت دعا کے لیے
مانع نہیں۔ ان رحمتی سبقت علی غضبی (بے شک میری رحمت میرے غضب پر سبقت
رکھتی ہے) حالانکہ یہ سوال ایسا بعید ہے کہ غیر انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی خلود اور دوام نہیں ہے

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں کوئی برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور تین بار اعوذ باللہ پڑھ لے اور جس کروٹ پر تھا اس کو بدل دے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

بعض ناواقفان سلوک کو دیکھا ہے کہ خواب پر ان کو بہت ہی نظر ہوتی ہے۔ اچھے خوابوں کی کمی ہو جاتی ہے تو اس کو علامت بعد کی سمجھ کر مغموم اور متفکر ہوتے ہیں۔ اچھے خواب نظر آ جاتے ہیں تو اس کو خود اپنے مقصود سمجھ کر ناز کرتے ہیں۔ کوئی واقعہ نظر آجاتا ہے تو اس پر پورا اعتماد کر لیتے ہیں۔ کوئی برا خواب نظر آجاتا ہے۔ تو اس پریشانی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حدیث میں ان سب خیالات کا غلط ہونا صراحۃً معلوم ہو گیا اور برے خواب کے ضرر سے بچنے کا طریقہ بھی بتلا دیا گیا۔ غرض خواب اتنی بڑی چیز نہیں جتنا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ اصل فکر حالت بیداری کی چاہیئے کہ وہ مرضی خداوندی ہے یا غیر مرضی۔ کسی کا شعر بہت پسند آیا ہے ؎

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

(ترجمہ: نہ رات ہوں، نہ رات کا پرستار ہوں کہ خواب کی باتیں کہوں۔ آفتاب کا غلام ہوں، آفتاب کی باتیں کرتا ہوں)

اور یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینا کہ خواب مؤثر تو ہوتا نہیں (کہ قرب یا بعد میں اس کو دخل ہو) البتہ اگر واقعی خواب ہو تو اثر (یعنی کسی فعل نیک و بد کا) ہو سکتا ہے اور ہم جیسوں کے خواب واقعی تو نہیں ہوتے اس لیے نہ وہ مؤثر ہیں نہ اثر اس لیے وہ اصلاً قابل التفات نہیں۔

چوتھی فصل۔ فراستِ صادقہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ تعالیٰ۔ اخرجہ الترمذی۔ — مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ نور الٰہی سے دیکھتا ہے۔

۱؎ ... تعلیم الدین ...

کل ممکنات تو موجود ظاہری ہیں اور حقیقت میں کوئی موجود حقیقی یعنی موصوف بکمال ہستی نہیں
بلکہ ذات حق کے اسی مضمون کو ہمہ اوست سے تعبیر کرتے ہیں معاذاللہ ہمہ اوست ہونا ہمہ مرتبہ کے یکی
جملہ ہے جس طرح کوئی حاکم کسی فریادی خواہ مخواہ سے کہے کہ تم نے پولیس میں رپٹ لکھوائی تم نے کسی وکیل سے
مشورہ بھی کیا اور وہ عرض کرے کہ جناب پولیس اور وکیل سب آپ ہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ ہرگز
مطلب نہیں ہوتا کہ حاکم اور پولیس اور وکیل سب ایک ہی ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ بلکہ مطلب یہ
ہوتا ہے کہ پولیس اور وکیل کوئی چیز قابل شمار نہیں۔ آپ ہی صاحب اختیار ہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھ لینا
چاہیے کہ ہمہ اوست کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سب اور وہ ایک ہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہماری ہستی قابل اعتبار
نہیں۔ صرف اسی کی ہستی لائق شمار ہے اور باقی جتنے موجودات ہیں ہستی تو ان کی بھی واقعی ہے مگر ان کی
ہستی ہستی کامل کے سامنے محض ایک ظاہری ہستی ہے حقیقی ہستی کامل نہیں تفصیل اس کی یہ ہے کہ
ہر صفت میں دو مرتبے ہوتے ہیں۔ ایک کامل ایک ناقص۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ کامل کے روبرو ناقص
ہمیشہ کالعدم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ کوئی ادنیٰ عہدہ کا حاکم اپنے اجلاس میں شان حکومت
رکھتا تھا اور عہدیداران سب سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا کہ ناگہاں بادشاہ وقت برسر اجلاس
بطریق دورہ آپہنچا۔ اس کے دیکھتے ہی ہوش اڑ گئے اور سب عہدہ و وقار کی رفتہ رفتہ و غرور ہرن ہو گیا
اب جو اپنے اختیارات کو اقتدار شاہی کے روبرو دیکھتا ہے تو اس کا کہیں نام و نشان نہیں پاتا۔ سمجھ
کو گڑ جاتا ہے۔ نہ آواز نکلتی ہے نہ سر اٹھا سکتا ہے۔ اس وقت گو اس کا منصب و عہدہ معدوم نہیں
ہوا۔ مگر کالعدم ضرور ہے۔ پس اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ گو ممکنات موجود ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے
ان کو وجود دیا ہے۔ موجود کیوں نہ ہوتے۔ مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص و ضعیف
و حقیر ہے۔ اس لیے وجود ممکن کو وجود حق کے روبرو گو معدوم نہ کہیں گے۔ مگر کالعدم ضرور کہیں گے۔
جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتدبہ ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی وحدۃ الوجود کے ہیں کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ
ہے۔ وجود کا ایک ہونا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ گو دوسرا بھی ہے مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں ہے
اسی کو سب لغۃً وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے۔ حضرت حق کو مثل زندہ کے سمجھو اور ممکن کو مثل مردہ کے۔ کہ گو
نعش مردہ بھی کسی درجہ کا وجود رکھتی ہے بلکہ جسم تو ہے مگر زندہ کے روبرو اس کی ہستی قابل اعتبار
نہیں۔ کیونکہ مردہ کی ہستی ناقص ہے اور زندہ کی ہستی کامل کامل کے روبرو ناقص بالکل مضمحل اور

ناچیز معتوب ہے۔ اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توحید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں فنا کہلاتا ہے۔ یہاں البتہ مطلوب و مقصود ہے اور یہی حال وحدۃ الشہود کا ہے، جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کا ترجمہ ہے۔ ایک ہونا شہود کا یعنی واقع میں تو ہستی متعدد ہے مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں جیسا اوپر کی مثالوں سے واضح ہو چکا ہے۔ ایک اور مثال جسے واضح تر شیخ سعدی نے بیان فرمائی ہے ؎

گہ دیدہ باشی کہ در باغ و راغ ٭ بتابد بہ شب کرمکی چوں چراغ

یکے گفتش اے مرغک شب فروز ٭ چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز

ببیں کاتشیں کرمک خاک زاد ٭ جواب از سر روشنائی چہ داد

کہ من روز و شب جز بصحرا نیم ٭ ولے پیش خورشید پیدا نیم

(یعنی جگنو جو رات کو مانند چراغ کے چمکتا ہے۔ اس سے کسی نے کہا کہ تو دن میں باہر کیوں نہیں نکلتا تو اس نے بہت ہی اچھا جواب دیا کہ میں رات دن جنگل ہی میں ہوتا ہوں لیکن سورج کی روشنی کے سامنے میری ہستی ظاہر نہیں ہوتی)

پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے کما قال مرشدی۔ مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے اس لیے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا۔ جو بہ نسبت عنوان متروک کے اس معنی میں زیادہ ظاہر ہے کیونکہ لفظ وحدۃ الوجود کی دلالت معنی مذکور پر بعید تر تھی اور وحدۃ الشہود کی دلالت اس معنی پر حقیقی ہے اور دلیل نقلی اس مسئلہ کی یہ ہو سکتی ہے کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْہَہٗ جیسا شارح عقائد نسفی نے تفسیر کی ہے۔

ظاہر ہے[1] کہ تمام کمالات حقیقۃً اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہیں اور مخلوقات کے کمالات عرضی طور پر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا و حفاظت سے سب ان میں موجود ہیں۔ ایسے وجود کو اصطلاح میں وجود ظلی کہتے ہیں اور ظل کے معنی سایہ کے ہیں۔ مسئلے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ جو کوئی جسم ہے یہ عالم اس کا سایہ ہے بلکہ سایہ کے معنی وہ معنی ہیں جیسے کہا کرتے ہیں ہم آپ کے زیر سایہ رہتے ہیں۔

---

[1] تعلیم الدین صفحہ ۱۵۔

یعنی آپ کی حمایت اور پناہ میں۔ اور ہمارا امن و حفاظت آپ کی توجہ کی بدولت ہے اسی طرح چونکہ
ہمارا وجود بدولت عنایت خداوندی ہے اس لیے اس کو وجود ظلی کہتے ہیں۔ پس یہ بات یقینی
ثابت ہوئی کہ ممکنات کا وجود حقیقی اور اصلی نہیں ہے۔ عارضی اور ظلی ہے۔ اب وجود ظلی کا اگر اعتبار نہ
کیا جائے تو صرف وجود حقیقی کا ثبوت ہوگا اور وجود کو واحد کہا جاوے گا۔ یہ وحدۃ الوجود ہے اور اگر
اس کا بھی اعتبار کیجئے کہ آخر کچھ تو ہے۔ بالکل معدوم تو ہے ہی نہیں۔ مگر غلبۂ نور حقیقی سے کسی مقام پر
سالک کو وہ نظر نہ آوے یہ وحدۃ الشہود ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ نور ماہتاب نور آفتاب سے
حاصل ہے۔ اگر اس نور ظلی کا اعتبار نہ کیجئے تو صرف آفتاب کا نور ماہتاب کو نہ کہا جاوے گا یہ
مثال وحدۃ الوجود کی ہے اور اگر اس کے نور کا بھی اعتبار کیجئے کہ آخر کچھ تو آثار مستقل ہیں۔ مگر
وقت ظہور نور آفتاب کے وہ بالکل مغلوب النور ہو جاوے۔ یہ مثال وحدۃ الشہود کی ہے۔ یہاں
سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہے۔ مآل کار دونوں کا ایک ہے اور چونکہ اصل ظل میں
نہایت قوی تعلق ہوتا ہے اس کو اصطلاح صوفیہ میں عینیت سے تعبیر کرتے ہیں اور عینیت کے یہ
معنی نہیں کہ دونوں ایک ہو گئے۔ یہ تو صریح کفر ہے جیسا کہ وہی صوفیہ محققین اس عینیت کے بعد
غیریت کے بھی قائل ہیں۔ مگر یہ غیریت اصطلاحی ہے۔ بالغرض مسئلہ کی تحقیق تو اسی قدر ہے اس
سے زیادہ اگر کسی کے کلام منثور یا منظوم میں پایا جاوے وہ کلام حالت سکر کا ہے۔ قابل مذمت نہ
لائق نقل و تقلید۔

مسئلہ وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود مسائل کشفیہ سے ہیں کسی نص کے مدلول نہیں۔ نیز
مسائل کشفیہ کے لیے یہی غنیمت ہے کہ وہ کسی نص سے معارض نہ ہوں۔ یعنی کوئی نص ان کی نافی نہ ہو۔ باقی
اس کی کوشش کرنا کہ نصوص کو ان کا مثبت بنایا جائے۔ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر نص اس کی
محتمل ہو تو درجہ احتمال میں اس کا رکھ دینا تو جائز نہیں مگر تکلف ہے اور اس کو درجۂ احتمال سے بڑھا
دینا غلو ہے اور اگر وہ محتمل بھی نہ ہو تو اس کا دعویٰ کرنا احتمالاً یا جزماً صریح تحریف ہے نص کی۔ البتہ
اگر وہ دعویٰ بطور تفسیر یا مدلول کے نہ ہو محض بطور علم اعتبار کے ہو تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ جگہ
اگر کسی اور نص سے ثابت ہو تب تو وہ اعتبار داخل محمود ہے اور اگر وہ کسی اور نص سے ثابت نہ ہو تو

بوادر النوادر [illegible]

فصل اوّل۔ استغراق

لوگوں نے[1] حضرت ابو زرعہ غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ لڑکی (آپ کی صاحبزادی کی طرف اشارہ کر کے) جو آپ کے ساتھ جا رہی تھیں آپ کی ہے تو آپ بہت غور سے اس کو دیکھ کر فرماتے ہیں کہ ہاں گھر والے کہتے تو ہیں کہ یہ میری لڑکی ہے یعنی یہ بھی یاد نہیں رہا کہ یہ میری لڑکی ہے گھر والوں کے قول سے استدلال کیا۔

کیفیت[2] استغراقیہ جو حضرات صوفیہ سے متوسطین کو حاصل ہوتی ہے کوئی بڑا کمال نہیں ہے۔ جیسا کہ عام لوگ سمجھ رہے ہیں۔ اگر استغراق بڑا مرتبہ ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد صادر نہ ہوتا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نماز کو طول دوں۔ مگر نماز میں کسی بچہ کی آواز سن کر تخفیف کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت آپ کو استغراق نہ ہوتا تھا۔ البتہ محمود ضرور ہے۔ (بشرطیکہ اس استغراق سے کوئی شرعی عیب پیدا نہ ہو)

دوسری فصل تصرف و تاثیر (توجہ)

حضرت ابی بن کعبؓ[3] (ایک لمبی حدیث میں روایت ہے۔)

فلما رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم ما قد غشيني ضرب في صدري ففضت عرقا وكأنما انظر الى الله خوفا۔ الحديث رواه مسلم۔	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ حالت دیکھی جو مجھ پر غالب ہو رہی تھی۔ آپ نے میرے سینہ میں ہاتھ مارا میرے پسینہ پسینہ ہو گیا اور خوف سے میری یہ حالت ہوئی کہ گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں

اثر مانا جس سے یہ حالت پیدا ہوئی تصرف ہے بعض لوگ[4] غلطی سے سالک کو متصرف سمجھ لیتے

---

[1] طریق القصد صفحہ ۹۴ ، [2] مقالات حکمت نمبر ۔ ، [3] التکشف صفحہ ۳۲۲ ،

[4] خصائل نبوی صفحہ ۱۰۴

اگر یہ مختصر جماعت ہلاک ہو گئی جو اس وقت آپ کے ساتھ ہے تو پھر آج کے بعد کوئی آپ کا نام نہ لیگا.
کوئی آپ کی پرستش نہ کرے گا۔ اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر غلبہ حال تھا۔ اسی طرح
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ کوہ طور پر گئے تھے۔ وہاں ان پر صاعقہ نازل ہوئی جس سے
سب ہلاک ہو گئے۔ اس وقت موسیٰؑ نے دعا کی جس میں یہ جملہ بھی ہے

إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ — یہ تیری آزمائش ہے۔ اس کے ذریعہ جس کو چاہتا ہے
تَشَاءُ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ — بے راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ پر ڈال دیتا ہے

فرماتے ہیں کہ یہ عبارت مجمل (دیکھ پڑے) کا قصہ آپ ہی کا تو کرشمہ ہے۔ یہ بھی غلبہ حال ہی تھا۔ ورنہ بدون
غلبہ حال کے انبیاء کرام علیہم السلام ایسی بات نہیں فرماتے۔ اسی طرح بعض کاملین پر بھی غلبہ
حال ہوتا ہے جس میں وہ معذور ہوتے ہیں مگر ان کو غلبہ حال ایسا نہیں ہوتا کہ مسلوب الحواس ہو
جائیں بلکہ ان کے حواس غلبہ حال میں بھی درست رہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حالتِ سکر بدلا
بصحو ہو جاتی ہے۔ مگر اس حالتِ سکر کے (اقوال و اعمال) میں ان کی تقلید نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ
یہ باتیں غلبہ حال اور بوجہ معذوری میں کرتے ہیں۔ اور معذوری کی حالت کا اتباع نہیں ہو سکتا
صاحبِ حال عادتاً جب تک عذر غالب نہیں ہوتا بہت ضبط سے کام لیتا ہے۔ جب ضبط کی
طاقت نہیں رہتی اور اختیار سلب ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس سے ایسی حرکات اور ایسے اقوال شطحیہ
صادر ہونے لگتے ہیں۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

بہ تسلیم سر در گریباں برند — چو طاقت نماند گریباں درند

حالتِ صحو میں ضبط واجب ہے اور ایسی حالت میں اخفاء حال میں کوشش کرے۔ کیونکہ
اہلِ زمانہ فتنہ انگیز ہیں اور ایسے امور میں فتنہ بپا کرتے ہیں اور لوگوں کو فتنہ میں ڈالنا یا خود فتنہ میں
پڑنا درست نہیں اور زمانہ سکر میں جو کچھ اظہار اسرار ہو گیا ہے۔ اب اشک ندامت سے سکر کے اس
دھبہ کو خوب دھو دینا چاہیئے یعنی اس سے عذر اور توبہ چاہیئے۔ کیونکہ صحو میں ورع و تقویٰ
واجب ہے۔ اور ندامت کی تلافی لوازم تقویٰ سے ہے اور رہا یہ کہ سکر میں تو گناہ ہوا ہی نہ تھا۔
پھر توبہ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ بعض اوقات تو سکر بھی ناقص ہوتا ہے جس

؎ الکشف ص ۳۲۳

جبریل فقال یا محمد إنك رسول الله حقا فیسكن لذلك جاشه وتقر نفسه۔ (رواہ البخاری)

پہاڑ کی کسی چوٹی پر گرنے کی غرض سے چڑھتے تو جبرئیل آپ کو نظر آتے اور فرماتے اے محمدؐ! مغموم مت ہو آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور سچ مچ اس سے آپ کے قلب کو سکون ہو جاتا اور جی ٹھہر جاتا۔

واردات کا انقطاع جو کسی مصلحت سے ہوتا ہے قبض ہے۔ حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے۔ خوف و رجا جب بڑھ جاتا ہے قبض و بسط ہوتا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ خوف و رجاء آئندہ کی حالت یاد کرنے سے ہوتا ہے اور محبوب کی تجلی جلال یعنی آثار عظمت و استغناء کے فی الحال وارد ہونے سے قلب کا گرفتہ ہونا قبض کہلاتا ہے۔ اسی حالت کو حدیث عبداللہ بن کعب واقعہ تخلف عن تبوک میں ضیق ارض و ضیق النفس سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور قبض کے مقابل حالت بسط ہے۔ یعنی آثار لطف و فضل کے ورود سے قلب کو سرور و فرحت ہونا۔

کبھی سوء اعمال کی وجہ سے سالک سے لذت فی الطاعات مفقود ہو جاتی ہے اور کبھی بوجہ فتور و کسل و ملال کے طبعاً پیش آتی ہے اور کبھی بمصلحت امتحان کہ آیا یہ حق کا طالب ہے یا لذت کا منجانب اللہ وارد کی جاتی ہے۔

قبض کا سبب صرف عدم رضائے حق نہیں۔ بلکہ بعض دفعہ حکمتوں کی وجہ سے قبض طاری کیا جاتا ہے۔ سالک کی اصلاح کے لیے یا سنبھالنے کے لیے کبھی بسط کو سلب کر لیا جاتا ہے تاکہ عجب و کبر میں مبتلا نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ جب بندہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص مرتبہ مقدر ہوتا ہے۔ جس کو وہ اپنے عمل سے حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے جسد و اس کے اہل اور اس کے مال کو کسی بلا میں مبتلا کر دیتا ہے پھر وہ صبر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہوا تھا۔ حضرت مرشدی و مولائی یعنی شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ العزیز نے فرمایا کہ قبض حقیقۃً بصورت قہر لطف ہے۔

ے تعلیم الدین صفحہ ۔ ے التکشف صفحہ ۳۳۳ ے القضائی صفحہ ۱۹۹ [illegible]

چونکہ قبضے آمد ست اے راہرو آں صلاح تست آئس دل مشو

(ترجمہ: اے سالک جب تجھے قبض پیش آئے تو تو اس سے دل گرفتہ نہ ہو کہ وہ تیرا اصلاح کا ذریعہ ہے)۔

قبض منافع میں بسط سے بھی زیادہ ہے۔ گو عین قبض کے وقت وہ منافع معلوم نہ ہوں مگر بعد میں اکثر معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اگر معلوم بھی نہ ہوں تب بھی حاصل تو ہوتے ہیں اور حصول ہی مقصود ہے نہ کہ حصول کا علم۔ چنانچہ غایت انکسار اور عبدیت کے آثار مثلاً مشاہدۂ عجز و ضعف اور غلبۂ انکسار و افتقار و فنا کے دعویٰ حالاً کا ترتب ہوتا ہے۔ جیسا کہ اکابر کا الہام ہے۔ انا عند منکسرۃ القلوب {میں (خدا تعالیٰ) شکستہ دلوں میں ملتا ہوں}

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ مے نگیرد فضل شاہ

(ترجمہ: عقل و سمجھ کو تیز کرنا حقیقت میں راہ نہیں یعنی اس سے اسرار اور مقاصد حاصل نہیں ہوتے شکستہ دل کے سوا بادشاہ حقیقی کا فضل کوئی حاصل نہیں کر سکتا یعنی اس کا فضل متواضع لوگوں پر متوجہ ہوتا ہے)۔

قبض سے عجب کا علاج ہوتا ہے۔ عبدیت کی حقیقت کا اس میں مشاہدہ ہوتا ہے۔ خدا اور بندہ ہستی کی اتنی ہو جاتی ہے۔ اختیاری کام کی پابندی ایسے ہی وقت دیکھنے کے قابل ہے اصل امتحان ہے۔ اگر اس امتحان میں پاس ہو گیا اعلیٰ درجہ کے نمبر کا مستحق ہوگا۔

قبض فی نفسہ تو مضر نہیں مگر جب اس کا سبب کوئی فعل قبیح ہو تو وہ قبض مضر ہے اس کی اصلاح یہی ہے کہ اس فعل کا تدارک کیا جائے۔

جو امر غیر اختیاری ہو محمود ہے۔ قبض خود حالت نافعہ ہے۔ اس کا علاج ضروری نہیں۔ اور جو علاج کے عنوان سے بزرگوں نے کچھ لکھا ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں کہ اس کا ازالہ کیا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ قبض کے وقت یہ عمل کیا جائے۔ گویا یہ اعمال آداب و حقوق ہیں قبض کے۔ پھر اس کے بعد خواہ قبض رہے یا جائے دونوں حالتوں میں رضا و تفویض چاہیے۔ غسل تازہ کر کے کپڑے بدل کر عطر لگا کر دو رکعت نفل پڑھ کر استغفار کرنا اور ایک ہزار بار یا باسط پڑھنا قبض کے لیے نافع ہے۔ ذکر جس قدر ہو سکے کر لیں۔ اگرچہ کسی قدر تکلیف بھی کرنی پڑے

اور اگرچہ اس میں دلچسپی بھی نہ ہو اور جس حد سے زیادہ کلفت ہو اس کو تخفیف کر دیں اور استغفار کی کثرت رکھیں اور جب تک یہ حالت رہے ایک بار یا دو بار ہفتہ میں ذریعہ خط شیخ کو اطلاع دیتے رہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد یہ حالت رفع ہو جائے گی۔ سب کو یہ حالت پیش آتی ہے یہ راہ قطع ہونے کی علامت ہے اور یہ سب راستے کی گھاٹیاں ہیں۔

پانچویں فصل ۔ مشاہدہ

عن حنظلة فی حدیث طویل قلت نکون عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم یذکرنا بالنار والجنة کانا رأی العین الخ اخرجہ مسلم والترمذی۔

حضرت حنظلہؓ سے ایک لمبی حدیث میں روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو رہتے ہیں اور آپ ہم کو دوزخ بہشت یاد دلاتے ہیں تو اس وقت ایسے ہوتے ہیں گویا ہم آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے ہیں۔

کسی امر کے استحضار اور خیال کا قلب پر غالب اور قوی ہونا مشاہدہ کہلاتا ہے۔ اس حدیث میں اسی کا ثبوت ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے جنت دوزخ کی یاد کی نسبت یہ فرمایا کہ گویا کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں۔ مراد اس سے یہی غلبہ استحضار ہے اور مشاہدہ کے قوی معنی مراد نہیں ہوتے۔ بعضے ناواقفی سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔

مشاہدۂ حق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مشاہدہ تام یعنی رویت۔ تو جنت میں ہوگا دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مشاہدہ ناقص یعنی استحضار تام یہ دنیا میں ہوتا ہے۔ گو مشاہدہ تام کے سامنے یہ دوسری قسم استتار ہی میں داخل ہے۔ مگر چونکہ حجاب میں سالک کو اس سے بہت تسلی ہو جاتی ہے اس لئے یہاں کے اعتبار سے استحضار تام ہی کو مشاہدہ کہا جاتا ہے یہ مشاہدہ خواہ تام ہو یا ناقص۔ اس کا دوام بندہ کی مصلحت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ وہاں سے کبھی کبھی

ــ التکشف صفحہ ۲۰ کتاب الشریعۃ ...

عربی	اردو
عن ابی ھریرۃ فی الحدیث الطویل عن بعض بنات الحارث کانت تقول لقد رأیتہ یأکل من قطف عنب وما بمکۃ یومئذ ثمرۃ وانہ لموثق بالحدید الخ (اخرجہ البخاری)	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں حارث کی ایک بیٹی سے منقول ہے وہ کہتی تھیں کہ میں نے ان (حضرت خبیبؓ) کو انگور کا خوشہ کھاتے ہوئے دیکھا اور اس وقت مکہ میں میوہ یا پھل کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور خود وہ لوہے میں مقید تھے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا۔
عن انس قال کان اسید بن حضیر و عباد بن بشر عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ مظلمۃ فخرجا من عندہ فاذا نور بین ایدیھما فلما افترقا صار مع کل واحد منھما نور اخرجہ البخاری۔	حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تاریک رات میں حاضر تھے۔ جب دونوں آپ کے پاس سے نکلے تو ان دونوں کے آگے دو نور نمودار ہو گئے جب دونوں جدا ہوئے تو ایک ایک نور ہر ایک کے ساتھ ہو گیا۔
اھتز العرش لموت سعد بن معاذ۔ اخرجہ الشیخان والترمذی۔	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عرش سعد بن معاذ کی موت سے ہل گیا۔
فقال ان الملائکۃ کانت تحملہ۔ اخرجہ الترمذی۔	(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے) ارشاد فرمایا کہ فرشتے (بھی ان کے جنازہ) کو اٹھائے ہوئے تھے۔

(قرآن اور احادیث) میں عظیم کرامتیں مذکور ہیں جو کہ بشرط اتباع شریعت اہل امت کے حالات رفیعہ میں سے ہیں۔

لہ التکشف صفحہ ۳۸۲، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۸۷، ۳۸۶، ۹۰ تا ۱۱۶

کرامت کی حقیقت

کرامت اس امر کو کہتے ہیں جو کسی نبی کے کسی متبع کامل سے صادر ہو اور قانون عادت سے خارج ہو۔ پس اگر وہ امر خلاف عادت نہ ہو تو کرامت نہیں ہے اور جس شخص سے وہ امر صادر ہوا ہے اگر وہ کسی نبی کا متبع اپنے کو نہیں کہتا۔ وہ بھی کرامت نہیں ہے۔ جیسے جوگیوں، ساحروں وغیرہم سے بعض ایسے امور سرزد ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ شخص مدعی اتباع کا تو ہے۔ مگر واقع میں متبع نہیں ہے۔ خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو جیسے طرح طرح اہل بدعت۔ یا فروع میں۔ جیسے فاسق و فاجر۔ اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو وہ بھی کرامت نہیں ہے۔ بلکہ استدراج ہے۔ جس کا ضرر یہ ہے کہ یہ شخص بوجہ خرق عادت کے اپنے کو کامل سمجھتا ہے اور اس دھوکا میں کبھی حق کے طلب کرنے اور اتباع کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نعوذ باللہ کس قدر خسران عظیم ہے۔ لیس کرامت اس وقت کہلانے گی جبکہ اس کا فعل صدور ہو کسی متبع سنت کامل التقویٰ ہو۔ اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی فعل عجیب سرزد ہو جاتا ہے۔ اس کو غوث و قطب قرار دیتے ہیں۔ اس شخص کے کیسے ہی عقائد ہوں اور کیسے ہی اعمال و اخلاق ہوں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی شخص کو ہوا میں اڑتا ہوا یا پانی پر چلتا ہوا دیکھو مگر وہ شریعت کا پابند نہ ہو تو بالکل ہیچ سمجھو۔

(۲) جاننا چاہیے کہ کرامت کیلئے نہ اس ولی کو اس کا علم ہونا ضروری ہے اور نہ اس کے قصد کا متعلق ہونا ضروری ہے۔ کبھی علم ہوتا ہے اور قصد نہیں ہوتا اور کبھی علم و قصد دونوں امر ہوتے ہیں اس بنا پر کرامت کی تین قسمیں ٹھہریں۔ ایک قسم وہ جہاں علم بھی ہو قصد بھی۔ جیسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے فرمان مبارک سے دریائے نیل کا جاری ہونا۔ اور دوسری وہ جہاں علم ہو اور قصد نہ ہو۔ جیسے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بے فصل میووں کا آجانا۔ تیسری قسم وہ جہاں نہ علم ہو۔ نہ قصد۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانا اور کھانے کا دو چند۔ سہ چند ہو جانا۔ چنانچہ خود حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو تعجب ہوا جس سے ان کے علم و قصد کا پہلے سے متعلق نہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور ایک احتمال عقلی ان میں سے خلاف واقع ہے کہ قصد ہو اور علم نہ ہو کیونکہ بدوں علم قصد ممکن نہیں

اور لفظ تصرف و ہمت کا صرف قسم اول پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ قسم ثانی و ثالث کو تصرف نہیں کہتے البتہ برکت و کرامت کہلاتی ہے۔

(۳) اور جاننا چاہئے کہ ایک اور اعتبار سے کرامت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حسی ایک معنوی۔ عوام لوگ اکثر حسی کو جانتے ہیں۔ اور اسی کو کمال شمار کرتے ہیں۔ جیسے مافی الضمیر پر مطلع ہو جانا۔ پانی پر چلنا، ہوا پر اڑنا وغیرہ اور خواص کے نزدیک بڑا کمال کرامت معنوی ہے یعنی شریعت پر مستقیم رہنا۔ مکارم اخلاق کا خوگر ہونا۔ نیک کاموں کا پابندی بے تکلفی سے صادر ہونا۔ حسد و کینہ و دیگر صفات مذمومہ سے قلب کا طاہر ہونا۔ کوئی سانس غفلت میں نہ گذرنا۔ یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا احتمال نہیں۔ بخلاف قسم اول کے کہ اس میں یہ احتمال موجود ہے۔ اسی واسطے کاملین صدور کرامت کے وقت بہت ڈرتے ہیں۔ کہ یہ استدراج نہ ہو۔ یا خدانخواستہ اس سے نفس میں عجب پیدا نہ ہو جائے۔ یا اس کی وجہ سے عوام میں شہرت و اعتبار پیدا ہو کر موجب ہلاکت نہ ہو۔ بلکہ بعض نے فرمایا ہے کہ بعض اولیاء نے مرتے وقت تمنا کی ہے کہ کاشکے دنیا میں ہماری کوئی کرامت صادر نہ ہوتی۔ تاکہ اس کا عوض و اجر بھی آخرت میں ملتا۔ کیونکہ یہ امر مقرر ہے کہ جس قدر دنیا میں کسی نعمت میں کسی کو کمی رہے گی۔ اس کا بدلہ آخرت میں عنایت ہوگا۔

(۴) اور جاننا چاہئے کہ بعض علماء نے کرامت کی قوت ایک خاص حد تک معین کی ہے۔ اور جو امور نہایت عظیم ہیں۔ جیسے بدون والد کے اولاد پیدا ہونا۔ یا کسی جماد کا حیوان بن جانا۔ یا ملائکہ کا باتیں کرنا۔ ان کا صدور کرامت سے ممتنع قرار دیا ہے۔ مگر محققین کے نزدیک کوئی حد نہیں۔ کیونکہ وہ فعل پیدا کیا ہوا اللہ تعالیٰ کا ہے۔ صرف ولی کے ہاتھ پر اس کا ظہور ہو گیا ہے۔ واسطے اظہار کرامت و قرب و مقبولیت اس ولی کے۔ سو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جب کوئی حد نہیں۔ پھر کرامت محدود کیسے ہو سکتی ہے۔ رہا یہ شبہ کہ معجزہ کے ساتھ مساوات لازم آنے کا احتمال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب صاحب کرامت خود کہتا ہے کہ میں نبی کا غلام ہوں تو جو کچھ اس سے ظاہر ہوا ہے بہ تبعیت اس نبی کے ہے استقلالاً نہیں جو اس سے شبہ کی گنجائش ہو۔ البتہ جس خرق عادت کی نسبت نبی علیہ السلام

سکا ارشاد ہو کہ جس کا صدور مطلقاً محال ہے وہ بطور کرامت کے سرزد نہیں ہو سکتے۔ جیسے قرآن مجید کا مثل لانا۔

(۵) اور جاننا چاہیئے کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفا واجب ہے مگر جہاں اظہار کی ضرورت ہو۔ یا غیب سے اذن ہو یا حالت اس قدر غالب ہو کہ اس میں قصد و اختیار باقی نہ رہے۔ یا کسی طالب حق و مرید کے یقین کا قوی کرنا مقصود ہو۔ وہاں اظہار جائز ہے۔

(۶) اور جاننا چاہیئے کہ بعض اولیائے کاملین کا مقام غلبہ عبودیت و رضا کا ہوتا ہے۔ اس لیے کسی شے میں وہ تصرف نہیں کرتے۔ اس وجہ سے ان کی کرامتیں ظاہر نہیں معلوم ہوتیں۔ اور بعضوں کو قوت تصرف ہی عنایت نہیں ہوتی تسلیم و تفویض ہی ان کی کرامت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ ولایت کیلئے کرامت کا ظہور یا وجود ضروری نہیں۔

(۷) اور جاننا چاہیئے کہ بعض اولیاء اللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرفات و خوارق سرزد ہوتے ہیں اور یہ امر معنیً حد تواتر تک پہنچ گیا ہے۔

(۸) اور جاننا چاہیئے کہ کرامت کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ اسباب طبعیہ سے وہ اثر پیدا نہ ہوا ہو خواہ وہ اسباب جلی ہوں یا خفی۔

اس مقام پر لوگوں کو دو غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ بعض تو مطلق عجیب امور کو کرامت سمجھتے ہیں اور عامل کے کمال کے معتقد بن جاتے ہیں۔ آجکل اس قسم کے بہت قصے واقع ہوتے ہیں مسمریزم، فری میسن، حاضرات، ہمزاد کا عمل، عملیات و نقوش، طلسمات و شعبدات، تاثیرات عجیبہ، ادویات، سحر، چشم بندی وغیرہ کہ اس میں بعض کے آثار تو محض خیالی ہیں اور بعض کے واقعی بھی ہوں تو اسباب طبعیہ خفیہ سے مربوط ہیں۔ کرامت ان سب خرافات سے منزہ ہے اور بعض کرامات کو بھی قوت طبعیہ پر محمول کر کے سب کو ایک لکڑی ہانکتے ہیں صاحب بصیرت طالب حق کو قرائن قویہ سے بنظر انصاف فرق معلوم ہو جاتا ہے کہ اس فعل میں قویٰ طبعیہ کو دخل ہے۔ یا محض قدرت قدیمہ ہے، یا کسی قوت کو بھی دخل نہیں محض کان من الغیب ہے۔

(۹) اور جاننا چاہیئے کہ جس فعل کا ظاہری قویٰ سے کرنا ممنوع ہے۔ باطنی قویٰ سے بھی ممنوع ہے، جیسے کسی بے گناہ کو قتل کر دینا۔ یا کسی کے قلب پر زور ڈال کر اس سے کچھ روپیہ لے لینا یا کسی کا

کشف[1] دو طرح سے ہے۔ کشف کونی، کشف الٰہی، کشف کونی یہ کہ بُعد مکانی یا زمانی اس کے لیے حجاب نہ رہے کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے۔ کشف الٰہی یہ کہ علوم و اسرار و معارف متعلق سلوک کے یا متعلق ذات و صفات کے اس کے قلب پر وارد ہوں یا عالم مثال میں یہ چیزیں متمثل ہو کر منکشف ہوں۔ واردات[2] سے غرض ہے مواجید مثل ذوق و شوق، محبت و انس و ہیبت و انکشاف اسرار احکام و حسن معاملہ فیما بینہ و بین اللہ وغیرہ و نفس عمل میں کی لذت کے سامنے جنت تیسیر کی سلطنت گرد ہے اور یہ نور حالات کہلاتے ہیں اور یہی علوم کشف الٰہی کہلاتے ہیں۔ کشف کونی مذہب میں اس کی گرد کو پہنچتا ہے۔ تقرب میں اس کو کوئی دخل نہیں ہے۔

بعض[3] اوقات اہل کشف کو خود اپنے کشف کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا۔ چنانچہ (حدیث بخاری شریف میں) حضرت اسید بن حضیر کو فرشتوں کا کشف تو ہوا مگر یہ اطلاع نہ ہوئی کہ یہ فرشتے ہیں محققین نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔ جو شخص اس تحقیق سے آگاہ ہو جاوے گا وہ کشف بلکہ ہر قسم واردات پر ہرگز اعتماد نہ کرے گا اور ایسا شخص بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہے گا۔

بزرگوں[4] کو جو کشف ہوتا ہے یہ ان کے اختیار میں نہیں بلکہ ان کے اختیار سے باہر ہے دیکھا گیا کہ نبیوں کے اختیار میں بھی نہیں۔ دیکھو حضرت یعقوب علیہ السلام کو مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کی خبر نہ ہوئی حالانکہ اس قدر بے خبری تھی کہ ان کو رنج و غم ایسا ہوا مشہور ہے کہ روتے روتے نابینا ہو گئے۔ تو اگر کشف امر اختیاری تھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو کیوں خبر نہ ہوئی اور جب خبر ہونے کا وقت آیا تو میلوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے کی خوشبو آنے لگی۔ غرض جب کشف اختیاری چیز نہیں تو یہ بھی ضروری نہیں کہ بزرگوں کو ہر وقت کشف ہوا ہی کرے۔ (بلکہ[5] حقیقت تو یہ ہے کہ کشف ہونا کوئی بڑا کمال نہیں۔ اگر کافر بھی مجاہدہ اور ریاضت کرے تو اس کو بھی کشف ہونے لگتا ہے۔ نیز مجنونوں کو بھی کشف ہو

---

[1] تعلیم الدین صفحہ ۱۰ [2] تصوف و سلوک صفحہ ۶۲ [3] التکشف صفحہ ۲۳۱
[4] گناہوں کی مغفرت صفحہ ۱۴ [5] علم و عمل کی فضیلت صفحہ ۳۴۔

ہے۔ میں نے خود ایک مجذوب عورت کو دیکھا کہ اس کو اس قدر کشف ہوتا تھا کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا لیکن جب اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ کشف بھی نکل گیا۔

کشف[1] والہام سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے اگر موافق قواعد شرعیہ کے ہے قابل عمل ہوگا ورنہ واجب الترک ہے اور اگر قواعد شرعیہ کے خلاف نہ ہو لیکن دو کشف میں باہم اختلاف ہو تو اگر وہ دونوں کشف ایک شخص کے ہیں تب تو آخیر کشف کا اعتبار ہوگا اور اگر وہ دونوں کشف دو شخصوں کے ہیں تو صاحب صحو کا کشف بہ نسبت صاحب سکر کے قابل عمل ہوگا اور اگر دونوں صاحب صحو ہیں تو جس کا کشف اکثر شرع کے موافق ہوتا ہو وہ قابل اعتبار ہے اور اگر اس میں بھی دونوں برابر ہیں تو جس شخص میں آثار قرب الٰہی و مقبولیت کے زیادہ پائے جائیں اس کے کشف کو ترجیح ہوگی اور اگر اس میں بھی برابر ہیں تو جس کو اپنا دل قبول کرے اس پر عمل جائز ہے اور اگر ایک کشف ایک شخص کا دوسرا کشف کئی شخصوں کا ہو تو جماعت کے کشف کو قوت ہوگی۔ البتہ اگر وہ تنہا سب سے اکمل ہے تو اس کے کشف کو ترجیح ہوگی۔

---

[1] تعلیم الدین ص ۱۳

۸ معارف وحقائق

باقی رہا علوم اور ان کی حقیقت معلوم ہونے کے بعد یہ معلوم ہونا چاہیے کہ معارف و حقائق میں بھی شیخ الطائفہ جنید کا مذاق ہے مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حقائق و معارف وہ مقبول ہیں جن کو شریعت رد نہ کرے۔ رسالہ قشیریہ میں ابو سلیمان دارانیؒ کا قول منقول ہے۔

ربما یقع فی قلبی النکتة — بعض مرتبہ میرے دل میں کوئی نکتہ اسرار صوفیہ
من نکت القوم ایاما فلا — میں سے آتا ہے مگر میں اس کو جب تک دو
اقبل منه الا بشاهدین — عادل گواہوں کے کہ وہ کتاب اللہ اور
عدلین الکتاب والسنة۔ — سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں
قبول نہیں کرتا۔

ابو خراز رحمہ کا قول ہے:۔

کل باطن یخالفه ظاهر فهو — جو باطن کہ ظاہر کے خلاف ہو وہ باطل
باطل۔ — اور مردود ہے۔

اور ان علوم کی دلیل کشف ہے اور بس۔ اور قرآن وحدیث کے اندر ان مسائل کا داخل کرنا تکلف سے خالی نہیں (البتہ) اگر کسی کو شوق ہو تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں لگ جائے تو خود ہی سب حقائق و معارف منکشف ہو جائیں گے اور یہ حال ہوگا ؎

بینی اندر دل علوم انبیا — بے کتاب و بے معید و اوستا

(بغیر کسی تعلیم و معلم کے انبیاء کے علوم منکشف ہو جائیں گے۔)

اور جن کو یہ حقائق حاصل ہوتے ہیں محض عمل اور اطاعت ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔

۱؎ تعلیم الدین صفحہ ۹۵ ۲؎ تفصیل الدین صفحہ ...

فہم و عقل تیز کردن نیست راہ / جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

یہ اسرار عقل پرستی اور فہم کے تیز کرنے سے معلوم نہیں ہوتے، بلکہ شکستگی اور انکسار سے خدا کا فضل متوجہ ہو جاتا ہے (یعنی ان حقائق و معارف کی معرفت اطاعت اور عبدیت ہی سے حاصل ہوتی ہے، عقل پرستی اور زیادہ قیل و قال سے حاصل نہیں ہوتی) جیسے کوئی شخص بادشاہ کا مطیع و محبوب ہو تو بادشاہ اسے کبھی اپنے محل کی سیر بھی کرا دیتا ہے کہ دیکھو یہ خزانہ ہے اور یہ چور دروازہ ہے اور یہ ہماری بیگمات کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ آرام گاہ ہے لیکن اگر وہ از خود یہ پوچھنے لگے کہ حضور کی بیگم کہاں رہتی ہے اور خزانہ کہاں ہے؟ تو الٹی بے نقط سنائی جائے گی کہ ہوش باختہ ہو جائیں گے۔ پس اسرار (اور حقائق و معارف) کے دریافت کرنے کی درخواست بھی ایسی ہی ہے کہ آدمی اپنے کو شاہ حقیقی کے سامنے بالکل فنا کر دے اور اپنی عقل و فہم کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دے۔ فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش / آزموں را یک زمانے خاک باش

یعنی عقل کی اطاعت میں سنگدل بنے ہوئے تو بہت دن ہو گئے۔ اس نے کچھ بھی حقیقت نہ بتلائی۔ اب ذرا کچھ دنوں خاک ہو کر دیکھو پھر کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں ؎

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ / خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(یعنی بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتا ہے۔ خاک ہو تاکہ پھر رنگا رنگ پھول کھلیں) پھر تمہارے اندر عجیب عجیب علوم القا ہوں گے۔

(معلوم ہونا چاہئے کہ حقائق اور معارف حسب اختلاف مذاق بے شمار ہیں مگر اس مقام پر چند معارف اختصار کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں جو زیادہ مشہور ہیں (مثلاً تجدد امثال، تنزلات ستہ اور وحدۃ الوجود۔ اب ہر ایک کو الگ الگ فصل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

لہ کلید مثنوی ص ۹۵، ۹۰، ۹۶

پہلی فصل ـ تجدد امثال

مخلوقات ہر وقت اپنے وجود میں فیضانِ الٰہی کی محتاج ہیں۔ اگر ادھر سے وجود کی حفاظت نہ ہو تو فوراً نیست و نابود ہو جائے۔ اب اہلِ کشف کی تحقیق یہ ہے کہ یہ وجود ہر آن میں جدا آتا ہے۔ مگر اتصال و تشابہ وجودات کی وجہ سے جس کو امتیاز تغائر کا نہیں ہوتا درمیان کا عدم معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے تاگے کے سرے پر جو آگ کا شعلہ ہے اس میں چراغ سے ہر وقت نیا تیل آتا ہے اور وہ فنا ہو کر دوسرا آتا ہے۔ اسی طرح تمام تیل ختم ہو جاتا ہے۔ مگر جس میں ہرگز معلوم نہیں ہوتا۔ کہ پہلا کب فنا ہو گیا اور دوسرا کب آیا۔ اسی کو تجدد امثال کہتے ہیں۔

دوسری فصل تنزلات ستہ

یہ ظاہر ہے کہ مصنوعات سے صانع کا ظہور ہوتا ہے ورنہ کیونکر پتہ لگے۔ پھر خود صانع میں ایک مرتبہ ذات کا ہوتا ہے۔ ایک صفات کا۔ پھر صفات میں بھی ایک مرتبہ جامعیت اور اجمال کا ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ تفصیل کا، اور ہمیشہ ذات کا نشان صفت سے لگتا ہے اور اجمال کا پتہ تفصیل سے۔ جب یہ سب باتیں سمجھ میں آگئیں تو اب سمجھیے کہ مخلوقات سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا ہم کو علم ہوا۔ تو ظہور علمی کے اعتبار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظہور اللہ تعالیٰ کا مخلوقات سے ہوا۔ پھر اسی قاعدہ مذکورہ کے موافق اللہ تعالیٰ کی صفاتِ تفصیلیہ سے صفات اجمالیہ کا اور ان سے ذات کا پتہ لگے گا اس لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اول ظہور اللہ تعالیٰ کا صفت جامعیت و اجمالیہ سے ہوا۔ پھر صفات تفصیلیہ سے ہوا پھر مخلوقات سے ہوا۔ اب مخلوقات میں ایک عالم ارواح ہے۔ ایک عالم اجسام اور چونکہ

؎ تفصیل کے لیے تنزلات ستہ وحدۃ الوجود کا بیان ملاحظہ ہو۔

ان میں بوجہ غایت لطافت و کثافت کے مناسبت نہ تھی۔ ان کے تعلق کے لیے ایک ایسی چیز پیدا کی جس کو دونوں سے مناسبت ہے۔ اسی کو عالم مثال کہتے ہیں۔ تو مخلوقات کی ترتیب میں روح پہلے ہوئی۔ پھر عالم مثال۔ پھر عالم اجسام۔ پھر عالم اجسام میں سب سے آخر انسان پیدا ہوا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی صفتیں پیدا کر دیں۔ اسی وجہ سے اس کو جامع کہتے ہیں۔ جس ترتیب سے مخلوقات پیدا ہوتی گئیں ظہور صانع کا بڑھتا گیا۔ تو اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد ظہور در مرتبہ صفات تفصیلیہ کے عالم ارواح سے ظہور ہوا۔ پھر عالم مثال سے پھر عالم اجسام سے۔ پھر انسان سے۔ پس دو مرتبے ظہور کے تو صفات میں ہوئے اور چار مخلوقات میں۔ تو یہ چھ ظہور علی الترتیب[1] اعتباری کیے گئے۔ ان ہی چھ ظہور کو تنزلات ستہ کہتے ہیں۔ اور تنزل ان کی اصطلاح میں ظہور کو کہتے ہیں۔ نہ آسمان سے زمین پر یا انسان کے اندر آنے کو۔[2] سو تنزلات کے تو چھ مرتبے ہوئے اور وجود کے سات مرتبے۔ کیونکہ ایک مرتبہ وجود کا خود ذات حق ہے۔ سو مرتبۂ ذات حق کو **ھاھوت** کہتے ہیں۔ اور مرتبہ صفات اجمالیہ کو **لاھوت** اور **حقیقت محمدیہ** اور مرتبۂ صفات تفصیلیہ کو **جبروت** اور اعیان ثابتہ اور حقیقت آدم اور عالم ارواح و مثال کو **ملکوت** اور عالم اجسام کو **ناسوت** اور عالم انسان کو **مرتبۂ جامعہ** کہتے ہیں۔ یہ سب اصطلاحی الفاظ ہیں ورنہ یقینی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آدم مخلوقات الٰہی سے ہیں۔ نہ کہ صفات

---

[1] کہ ذات و صفات میں تو ترتیب محض اعتباری ہے۔ یہ نہیں کہ کسی وقت میں صفات نہ تھیں پھر صفتیں پیدا ہو گئیں ورنہ صفات کا حادث اور مخلوق ہونا لازم آوے گا۔ یہ عقیدہ محض باطل ہے۔ البتہ مخلوقات تو ہر طرح مؤخر اور حادث ہیں ۱۲

[2] یہ قول باطل ہے جس کا اعتقاد کفر ہے۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے رشحات شریف میں منقول ہے۔ من زعم ان اللہ فی شیء او من شیء فقد اشرک اذ لو کان فی شیء لکان محصورا ولو کان من شیء لکان محدثا ۱۲

الجنید سے۔ تحقیق اس مسئلے کی اسی قدر ہے اس سے آگے اہل سکر کا غلبہ ہے جس میں ان کی زبان ذوقسم سے موہم الفاظ نکلے اور ناواقف لوگ اصطلاح کو نہ سمجھ سکے۔

تیسری فصل۔ وحدۃ الوجود

(تفصیل کے لیے احوال کے باب میں وحدۃ الوجود کا بیان مع وصیت نامہ صفحہ ۳۰۹ تا ۳۱۴ ملاحظہ ہو۔)

۹۔ اصطلاحات

تصوف[1] کی اصطلاحات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو مقاصد کے متعلق ہیں وہ تو شریعت سے الگ نہیں ہیں بلکہ مقاصد میں تصوف کی اصطلاحات کی حقیقت وہی ہے جو شریعت میں مذکور ہے اور دوسری وہ اصطلاحات ہیں جو امور زائدہ کے متعلق ہیں۔ وہ شریعت سے جدا ہو سکتی ہیں۔ جیسے تجدد امثال۔ توحید وجودی۔ شغل رابطہ وغیرہ۔ یہ صوفیہ[2] کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لیے اصطلاحیں مقرر کر لی ہیں۔ ورنہ وہ قرآن وحدیث سے جدا ہو کر کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ جاں علماء خشک جو ان کی اصطلاحات کو نہیں سمجھ سکتے ان پر اعتراض کر دیتے ہیں جو واقع میں ان پر نہیں ہوتا بلکہ اپنی فہم پر ہوتا ہے۔

اصطلاحاتے ست مر ابدال را

(ترجمہ۔ ابدال کی خاص اصطلاحات ہوتی ہیں۔)

ان اصطلاحات کو دو فصلوں میں لکھا جاتا ہے۔ اول اقسام اولیاء اور دوم متفرق اصطلاحات۔

پہلی فصل۔ اولیاء اللہ اور ان کے اقسام

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ الآیۃ[3]

(اللہ تعالیٰ نے فرمایا) آگاہ ہو جاؤ کہ بے شک اللہ کے ولیوں پر کچھ خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۱؎ اشرف المسائل ص۲۳۳ ۲؎ الشریعت ص۱۰

۳؎ تعلیم الدین ص۲۰۰

عن شريح بن عبيد قال ذكر أهل الشام عند علي وقيل العنهم يا أمير المؤمنين قال لا إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول الأبدال يكونون بالشام وهم أربعون رجلا كلما مات رجل أبدل الله مكانه رجلا يسقى بهم الغيث وينتصر بهم على الأعداء ويصرف عن أهل الشام بهم العذاب رواه احمد

شریح بن عبید سے روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روبرو اہلِ شام کا ذکر کیا گیا کسی نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! ان پر لعنت کیجئے فرمایا نہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، فرماتے تھے کہ ابدال جو ایک قسم ہے اولیاء اللہ کی، شام میں ہوتے ہیں اور وہ چالیس آدمی ہوتے ہیں، جب کوئی شخص ان میں سے مر جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا شخص بدل دیتا ہے۔ ان کی برکت سے بارش ہوتی ہے اور ان کی برکت سے اعداء پر غلبہ ہوتا ہے اور ان کی برکت سے اہلِ شام سے عذاب (دنیوی) ہٹ جاتا ہے۔

مکتوبات و ملفوظات صوفیہ میں ابدال و اقطاب و اوتاد و غوث وغیرہم الفاظ وارد اُن کے مدلولات کے صفات و برکات و تصرفات پائے جاتے ہیں۔ حدیث میں جب ایک قسم کا اثبات ہے تو دوسرے اقسام بھی مستبعد نہ رہے۔ ایک نظیر سے دوسری نظیر کی تائید ہونا امر مسلم و معلوم ہے۔ برکات تو اس حدیث میں منصوص ہیں۔ اور تصرفات تکوینیہ قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ سے ثابت ہوتے ہیں۔

اقسامِ اولیاء اللہ — اس باب میں بزرگوں کی مختلف عبارتیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ سب بارہ گروہ ہیں۔ ابدال، ابرار، اخیار، اقطاب، امامین، اوتاد، عمد، غوث، مفردان، مکتومان، نجباء، نقباء۔

١۔ ابدال — چالیس ہوتے ہیں۔ بائیس یا بارہ شام میں اور اٹھارہ یا اٹھائیس عراق میں رہتے ہیں۔

ــــ کشف ص ٣٣ بہ تعلیم الدین ص ١۔

۲۔ ابرار | اکثر نے ان ہی کو ابدال کہا ہے۔

۳۔ اخیار | پانچ سو یا سات سو ہوتے ہیں۔ ان کو ایک جگہ قرار نہیں۔ سیاح ہوتے ہیں۔ ان کا نام حسین ہوتا ہے۔

۴۔ اقطاب | قطب العالم ایک ہوتا ہے۔ اس کو قطب العالم و قطب اکبر و قطب الارشاد و قطب الاقطاب و قطب المدار بھی کہتے ہیں اور عالم غیب میں اس کا نام عبداللہ ہوتا ہے۔ اس کے دو وزیر ہوتے ہیں جو امامین کہلاتے ہیں وزیر یمین کا نام عبدالملک وزیر یسار کا نام عبدالرب ہوتا ہے۔ اور بارہ قطب اور ہوتے ہیں۔ سات تو سات اقلیم میں رہتے ہیں۔ ان کو قطب اقلیم کہتے ہیں اور پانچ یمن میں ان کو قطب ولایت کہتے ہیں۔ یہ عدد تو اقطاب معینہ کا ہے اور غیر معین ہر شہر اور ہر قریہ میں ایک ایک قطب ہوتا ہے۔

۶۔ اوتاد | چار ہوتے ہیں۔ عالم کے چار رکن میں رہتے ہیں۔

۷۔ عمد | چار ہوتے ہیں۔ زمین کے چاروں گوشوں میں رہتے ہیں۔ سب کا نام محمد ہوتا ہے۔

۸۔ غوث | ایک ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قطب الاقطاب ہی کو غوث کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ اور ہوتا ہے۔ اور مکہ میں رہتا ہے [illegible]

۹۔ مفرداں | غوث ترقی کر کے فرد ہو جاتا ہے اور فرد ترقی کر کے قطب وحدت ہو جاتا ہے۔

۱۰۔ مکتوماں | مکتوم تو مکتوم ہی ہیں یعنی پوشیدہ اور چھپے ہوئے۔

۱۱۔ نجبا | ستر ہوتے ہیں اور مصر میں رہتے ہیں۔ سب کا نام حسن ہے۔

۱۴۔ نقباء تین سو ہوتے ہیں۔ ملک مغرب میں رہتے ہیں۔ سب کا نام علی ہوتا ہے۔

قطب الارشاد و قطب التکوین

اولیاء[1] اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کے متعلق خدمت ارشاد و ہدایت و اصلاح قلب و تربیت نفوس و تعلیم طرق قرب و قبول عنداللہ ہے اور یہ حضرات اہل ارشاد کہلاتے ہیں اور ان میں سے اپنے عصر میں جو اکمل و افضل ہو۔ اور اس کا فیض تمام و عام ہو۔ اس کو قطب الارشاد کہتے ہیں۔ اور یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے حقیقی نائب ہوتے ہیں۔ لوگوں کے قلوب میں انوار و برکات ان کی وجہ سے آتے ہیں۔ برکات سے متمتع ہونے کی شرط ان کے ساتھ اعتقاد ہے۔

اور[2] ان کا طرز طرز نبوت ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جن کے متعلق خدمت اصلاح معاش و انتظام امور دنیویہ و دفع بلیات ہے کہ اپنی ہمت باطنی سے باذن الٰہی ان امور کی درستی کرتے ہیں۔ اور یہ حضرات اہل تکوین کہلاتے ہیں۔ جن کو ہمارے عرف میں اہل خدمت کہتے ہیں اور ان میں سے جو اعلیٰ اور ارقی اور دوسروں پر حاکم ہوتا ہے۔ اس کو قطب التکوین کہتے ہیں اور ان کی حالت مثل حضرات ملائکہ علیہم السلام کے ہوتی ہے۔ جن کو مدبرات امر فرمایا گیا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام اسی شان کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے مقام و منصب کے لیے ایسے تصرفات عجیبہ کا ہونا لازم ہے بخلاف اہل ارشاد کے کہ ان کا خود صاحب خوارق ہونا بھی ضروری نہیں۔ البتہ ان حضرات کی کرامات اور غور کی ہوتی ہیں کہ ان کا ادراک عوام کو نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ امور ذوقی و وجدانی ہیں کہ اکثر اوقات ان کی خدمت و صحبت سے جو شخص مستفید ہوتا ہے۔ اسی کو معلوم ہوتے ہیں۔ باقی یہ کہ جب نفع طریقت اہل ارشاد ہی سے ہوتا ہے تو اہل تکوین کے کمالات بیان کرنے سے کیا فائدہ۔ تو اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک علمی دوسرا عملی

---

[1] التکشف ص[illegible] [2] کرامات اشرفیہ ص[illegible] [3] التکشف ص[illegible]

مثال تو یہ کہ ذیب کو کوئی بات معلوم ہو جائے۔ تاکہ علم ناقص ضرر ہے۔ مجمل یہ کہ اکثر ایسے لوگ ظاہر صورت سے شکستہ حال و شکستہ بال و ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ اگر یہ مسئلہ کسی کو معلوم ہوگا تو ان کی تحقیر و توہین ترک کرے گا۔ خوب سمجھ لو۔

اور جاننا چاہیئے کہ بعض شکوک کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے قطب ہونے کا علم ہو لیکن خود وہ ایک ضرورت ہے۔ جیسا حسن میمندی جو سلطان محمود کا وزیر تھا۔ اس کو تو اپنے وزیر ہونے کا علم تھا۔ مگر ایاز کو اپنے محبوب ہونے کا علم ضروری نہیں۔ کیونکہ محبوبیت کوئی عہدہ نہیں قرب کی ایک قسم ہے۔ پس قطب الارشاد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اپنے قطب ہونے کو جانتا ہو۔ ایک وقت میں قطب متعدد بھی ہو سکتے ہیں۔ شیخ ابن عربی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ہر بستی میں خواہ وہ کفار ہی کی ہو قطب ہوتا ہے۔ اس کلام کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس بستی کے باشندوں میں ہو اور باطن میں مسلمان ہو مگر کسی خاص مصلحت کی وجہ سے اخفا کرے اور یہ صحیح ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اس جگہ مقیم نہ ہو لیکن وہ بستی اس کے تصرف میں ہو۔ جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ اس کا تعلق ولایت سے بھی ہوتا ہے اور وہ خاص مصلحت موجب اخفا رکھتا ہے اور وہ بھی شیخ ابن عربی ہی کے کلام سے مفہوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس میں عقل نہ ہو جیسے کہ مجذوب ہوتے ہیں کہ وہ مکلف نہ ہوں۔ مگر صحیح الحواس ہوں جیسے حیوانات اور صبیان کے حواس درست ہوتے ہیں۔ مگر ان کی ایک خاص علامت ہے اور وہ علامت یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل باطن کا اس کے ساتھ معاملہ دیکھا جائے۔ اگر وہ اس کا ادب کرتے ہوں تو ادب کرے اور اس کے بارے میں کچھ کلام نہ کرے۔ ورنہ ہر کا ذکا معتقد نہ بنے۔ کیونکہ اس طرح تو بہت دعویٰ و صف بند ہو جائے گا

سالک مجذوب و مجذوب سالک

جو شیخ کی مقامات کو جو کتاب لطائف میں مذکور ہوئے ہیں اول طے کرے۔ پھر عالم غیب کشش کیا جاوے وہ سالک مجذوب ہے اور جس کو پہلے کشش ہو۔

۱؎ ملفوظ [illegible] ۲؎ تعلیم الدین صفحہ ۔

وہ[1] ڈاکوؤں سے بچنے کیلئے اپنے اعمال چھپاتے ہیں اور رندوں کی سی وضع بناتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہجوم عوام سے ان کے معمولات میں خلل پڑتا ہے۔ اس لیے وہ عوام کو ڈاکو سمجھتے ہیں۔

مجذوب

مجنون[2] وہ ہے جس کی عقل اخلاط فاسدہ کے غلبہ سے زائل ہو جائے اور مجذوب وہ ہے کہ جس کی عقل کسی وارد غیبی کے غلبہ سے زائل ہو جائے مگر کبھی احوال و واردات کے غلبہ سے اخلاط میں بھی تغیر ہو جاتا ہے۔ اس لیے علامت سے تو اس کی پہچان مشکل ہے۔ مجذوب کے پاس بیٹھ کر قلب کو آخرت کی طرف کشش ہوتی ہے۔ علامت یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہل بصیرت (محققین جامع شریعت و طریقت) اس شخص پر نکیر نہ کرتے ہوں۔

یہ[3] ضروری نہیں کہ ہر مجنون مجذوب ہی ہوا کرے۔ اس میں ایک نکتہ ہے جس کی وجہ سے لوگ مجذوبوں کے طالب ہیں وہ یہ ہے کہ مجذوب جو کچھ کہہ دیتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے کہنے سے نہیں ہوتا ہے وہ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ یعنی جب کوئی کام جانب اللہ ہونے والا ہوتا ہے تو ان کو اس کا انکشاف ہو جاتا ہے نہ کہ وہ کام ان کے کہنے کی وجہ سے ہوتا ہے بلکہ ان کا کہنا اسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ بھی کہتے تو تب بھی ہوتا۔ اس کی ایسی مثال ہے۔ جیسے تار بابو کے پاس تار آتا ہے اور وہ اس کو لکھ کر لوگوں کو تقسیم کر دیتا ہے۔ اس میں ان کو دخل نہیں۔ اگر اس پر یہ آمد نہ ہو تو یہ کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اب اگر کوئی بے وقوف تار بابو کو مٹھائیاں اور نذرانہ پیش کرنے لگے تو اس میں کسی کا کیا نقصان ہے اور ایسی بیوقوفی کا کیا علاج۔ یہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ خبریں اس بابو کے اختیار میں ہیں۔ خواہ اچھی خبر دے خواہ بری خبر سنا دے۔ حالانکہ بابو کو اس کے اخفاء و اظہار میں کوئی دخل نہیں بلکہ تم اگر اس کو برا بھی کہو گے تب بھی وہ اس میں کمی زیادتی نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ مجذوب وغیرہ کے قول کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لوگ ناحق اپنا وقت خراب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ مجذوب[4] سے نہ دنیا کا فائدہ ہوتا ہے۔ نہ دین کا۔ دین کا اس لیے نہیں کہ یہ تعلیم و صحبت پر موقوف

---

[1] کمالات اشرفیہ ص۲۲ [2] القول الجلیل ص۱۷ [3] مزید المجید ص۷۵ [4] علم و عمل کی ... ص۲۵

ہے اور تعلیم و نصیحت اس سے حاصل نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ظاہر ہے اور دنیا کا اس لیے نہیں
کہ وہ دعا سے ہوتا ہے اور مجذوب دعا کرتے نہیں کیونکہ وہ لوگ صاحب کشف ہوتے ہیں۔
ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اس طرح ہوگا تو اس کے موافق دعا کرنا تو فضول و
بیکار ہے اور اس کے خلاف دعا کرنا تقدیر کا مقابلہ کرنا ہے۔ بہرحال وہ لوگ دعا نہیں
کرتے۔ البتہ کشف کی بنا پر کبھی بطور پیشین گوئی کچھ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں معاملہ میں یوں ہوگا
سو اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی اسی طرح ہوتا۔ اس طرح جو ہوتا ہے پھر ان کے کہنے کے سبب
نہیں ہوا۔ غرض کہ مجذوب سے کسی طرح کا نفع نہیں ہوتا۔ اور دوسرے بزرگوں سے ہر طرح
کا نفع ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں تعلیم و نصیحت بھی ہوتی ہے اور دعا بھی دین کا بھی نفع ہوتا
ہے اور دنیا کا بھی۔ بلکہ مجذوبوں کے چکر میں پڑنے سے ضرر یہ ہوتا ہے کہ لوگ شریعت کو
بیکار سمجھنے لگتے ہیں۔ شریعت کی وقعت و عظمت لوگوں کے دلوں سے جاتی رہتی ہے
کیونکہ مجذوب مکلف نہ ہونے کے سبب شریعت کی پیروی تو کرتے نہیں پس ان کی
حسن کرنے والے بھی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ مجذوب لوگ تو بوجہ عقل
جاتی رہنے کے معذور ہیں۔ اور ان لوگوں میں عقل و سمجھ سب کچھ ہے اس لیے یہ معذور
نہیں۔ (لہٰذا یہ اپنا دین برباد کرتے ہیں) تو یہ کتنا بڑا ضرر ہے جو مجذوبوں کی بدولت بجائے
نفع کے پہنچتا ہے اس لیے ان کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ (مطلب یہ کہ ان کی صحبت
اور ان سے کسی غرض کے لیے ملنا جلنا بالکل ترک کر دینا چاہیے۔ البتہ مجذوب کو برا بھلا کہنا
جائز نہیں۔ پس) دعا تو سالک سے کرانی چاہیے کہ ان کی دعا کا اثر ہوتا ہے اور حسب ال
انکشاف بھی دعا کر سکتے ہیں بخلاف مجذوب کے کہ ان کو اس کی اجازت نہیں ہوتی۔ کیونکہ
بوجہ نقصانِ حال بس انکشاف کا یقین ہو گیا ہے اور سالک کو بوجہ کمالِ حال کشف کا
یقین نہیں ہوتا۔

مجذوب[1] کی نظر کبھی تو چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر ہو جاتی ہے اور نہ ہو تو بڑی سے
بڑی بات پر بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ جذب کی وجہ سے استغراقی کیفیت ان حضرات پر

---

[1] کرامات اشرفیہ [illegible] میں کتاب کا بیان ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۳۲۹

غالب رہتی ہے۔ اسی لیے ان کا فعل حجت نہیں۔ مجذوبوں کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سالکین سے کچھ زیادہ نہیں ہوتا وہ صرف معذور ہوتے ہیں۔

مجذوب گو مقبول ہیں مگر کامل نہیں۔ کیونکہ وہ اعمال سے محروم ہیں اور ترقی اعمال ہی سے ہوتی ہے۔ ورنہ ارواح کو عالم ارواح سے عالم اجسام میں نہ بھیجا جاتا کیونکہ عالم ارواح میں ارواح حامل احوال تھیں مگر حامل اعمال نہ تھیں۔ چنانچہ ارواح میں محبت اس درجہ تھی کہ اسی محبت ہی کی وجہ سے حمل امانت پر آمادہ ہو گئیں۔ اس کا منشا محبت و عشق ہی تھا مجذوب کی خدمت اگر ہو سکے کرے لیکن توجہ کا ان سے ہرگز طالب نہ ہو۔ اور اگر ان کے حواس کی درستی میں شبہ ہو تو ان کی دی ہوئی چیز کو بھی نہ لے۔ اگر لے لے تو اس سے حفظ کا اعتبار کرے۔

طالبین کے اقسام اور ان کا طریق

طالب تین قسم کے ہیں۔ مبتدی، منتہی اور متوسط الحال۔ مبتدی اور منتہی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر ہوتا ہے۔ (وہ) حال سے مغلوب ہوتا ہے گویا ایسا مغلوب نہ ہو کہ حد شرع کی محافظت نہ کر سکے۔ کیونکہ ایسا شخص تو معذور ہے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذرا سی بات پر رونے لگتا ہے۔ ذرا سی بات پر وجد آجاتا ہے۔ زبان سے بے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ اسی کو عوام کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کمال نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ حال پر غالب آجائے۔ اور حال اس میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکے۔ ایسے شخص کے پہچاننے کے لیے بڑی بصیرت چاہیے اس کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے۔ عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ منتہی کا پہچاننا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیاء کو تو لوگوں نے پہچان لیا۔ اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کو نہ پہچان سکے (چنانچہ انبیاء کے بارے میں کہا گیا) إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (ترجمہ: نہیں ہو تم مگر ہم جیسے آدمی) متوسط اولیاء [illegible]

۱؎ الانفاس عیسیٰ، ص ۲۶۲-۲۶۳۔ ۲؎ دفتر ... ص ۱۰

میں تو جوش و خروش دیکھتے ہیں۔ لیکن اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغنا رہتا ہے۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا۔ یہ لوگ تو عجب کمال رکھتے ہیں کہ اس کی بابت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے قصداً اظہار تو کہاں۔ ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو گیا اگر کہیں اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ شک کمالات دکھاتے پھرا کرتے ہیں۔ پھر دیکھیئے کہ یہ کمالات شعبدے ہی ہوتے ہیں جس کے اندر کچھ ہے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور جو کچھ دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ بھی نہیں۔ ان لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(ترجمہ: مجھے اپنی آنکھوں سے شرم ہے میں نہیں چاہتا کہ وہ تیرا چہرہ دیکھیں اور کانوں کو بھی تیری باتیں سننا میں پسند نہیں کرتا)

یہ لوگ امتثال امر میں لگے ہوتے ہیں۔ کوئی ان کو پہچانے یا نہ پہچانے۔ کچھ پروا نہیں کرتے۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے۔ ہاں اللہ میاں کبھی ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفاء بے ادبی ہے۔ کیونکہ اطاعت تعمیل حکم اور رضا ہے جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہیئے۔ جب کہیں خاموش رہ خاموش ہو جائے اور جب کہیں کھل جا۔ تو بلا تامل کھل جائے یہ کھل جانا عین طاعت ہے۔ اس وقت اخفاء اتباع نفس ہے اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہو گی جو پہلے اخفاء میں تھی۔ غرض صاحب کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا۔ نہ اخفاء میں نہ اظہار میں۔ بس تعمیل حکم ہی مقصود ہوتا ہے اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرتا پھرتا ہے وہ ابھی تک فنا ہی نہیں ہوا جب صاحب کمال سرتاپا محو ہوا۔ امتثال امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہو رہا یا نہ ہو رہا بلکہ معمولی کی حالت ہوتی ہے اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طلب بھی نہ کرتا مگر حکم ہے۔ اس لیے بغرض اس کی

تحلیل کے طلب کرتا ہے۔

دوسری فصل متفرق اصطلاحات

ابرو و چشم و جمال[1] کلام و الہام غیبی را گویند (کلام اور الہام غیبی کو کہتے ہیں)۔

ابن الوقت و ابو الوقت ابن الوقت کا اطلاق دو معنی پر آتا ہے۔ ایک وہ سالک جو مغلوب الحال ہو یعنی جو حالت اس پر وارد ہو، اس کے آثار میں مضطرب ہو جاوے۔ اس کے مقابل ابو الوقت ہے یعنی وہ سالک جو اپنے حال پر غالب ہو یعنی جس کیفیت و حالت کو چاہے اپنے اوپر وارد کر لے۔ جس کیفیت کی طرف توجہ و قصد کرے اس کے آثار اس میں پیدا ہو جائیں۔ مثل انس و شوق و ذوق و وجد وغیرہ۔ دوسرے معنی ابن الوقت کے دونوں مذکور معنوں کو عام اور شامل ہیں یعنی وہ سالک جو واردات مقتضائے وقت کا حق ادا کرے خواہ وہ واردات اس پر غالب ہوں یا یہ ان پر غالب ہو۔

اتحاد عبارت است از استغراق در ہستی حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ (یعنی خدا تعالیٰ کی ہستی میں مستغرق ہونے کا نام اتحاد ہے)۔

اتصال ماسوی اللہ سے منقطع ہونے کو حق کے ساتھ اتصال کہتے ہیں۔ اور ذات کا اتصال ذات سے نہیں ہوتا۔ یہ جسم کا خاصہ ہے۔ حق تعالیٰ کی شان میں اس کا اعتقاد کفر ہے۔ جیسا جاہل سمجھتے ہیں کہ قطرہ کی طرح سمندر میں مل گیا۔ معاذ اللہ فرقے ہیں سے۔

---

[1] اکثر اصطلاحات تعلیم الدین سے ماخوذ ہیں اور جو دوسری کتب سے منقول ہیں، ساتھ ترجمہ قوسین میں لکھ دیا گیا ہے۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی پروردگار عالم کو لوگوں کے ساتھ جو اتصال ہے وہ کیفیت و قیاس سے بالاتر ہے۔ اور قطرہ و سمندر میں تو بے تکیف و بے کیف اتصال نہیں ہوتا۔ اس سے اس جہل کی تردید ہو گئی جو اور جو کسی شعر وغیرہ میں ایسے الفاظ موجود ہیں۔ وہ قابل تاویل یا تغیر ہیں۔

سأل ابن شاهين الجنيد عن معنى مع، فقال مع على معنيين مع الانبياء بالنصرة والكلاءة قال تعالى انني معكما اسمع وارى ومع العامة بالعلم والاحاطة قال الله تعالى ما يكون من نجوى ثلاثة الا هو رابعهم۔ الآية۔

ابن شاہین نے حضرت جنید سے معیت کے معنی پوچھے تو فرمایا کہ معیت کے دو معنی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تو باعتبار نصرت اور حفاظت کے معیت ہوتی ہے جیسا اس آیت میں فرمایا اننی معکما اسمع واری۔ اور عوام کے ساتھ علم و احاطہ کے اعتبار سے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں ہوتی تین آدمیوں کی سرگوشی مگر ضرور وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔

غرض بعد انقطاع خلق کے جس مقام اور حال میں ہے خوف ہو یا رجا ہو، انس ہو یا ہیبت ہو، سب وصال ہے۔

اجتباء

جو بواسطہ اکتساب و مجاہدہ کے احوال بطفیلہ حاصل رہتے ہیں اس کو جذب کہتے ہیں۔ اور اجتباء، محبوبیت اور مرادیت بھی کہتے ہیں۔

(الکشف صفحہ ۹۲)

آزادی۔ حریت

آزادی کے معنی ہیں اپنے نفس کی بندگی اور اپنی عادت سے نکل جانا نہ یہ کہ خدا کی بندگی اور دائرہ شرع سے باہر ہو جانا کیونکہ جب تک زندگی ہے احکام شرع کبھی معاف نہیں ہوتے۔ البتہ پہلے جو اطاعت دشواری سے ہوتی تھی اب آسانی سے ہونے لگتی ہے۔ تو تکلیف ساقط نہیں ہوتی بلکہ کلفت تکلیف ساقط ہو جاتی

بیت

من ازاں روز کہ در بند توام آزادم
پادشاہم کہ بدست تو اسیر افتادم

(الٰہی میں جس روز سے تیری قید میں ہوں، آزاد ہوں۔ جب سے تیرے ہاتھ میں قیدی ہوا بادشاہ ہوں۔)

اقامت | غلبۂ عشق را گویند۔
(عشق کے غلبہ کو کہتے ہیں۔)

اوباش | آنکہ غمِ ثواب و عقاب نکند۔ (جو ثواب و عذاب کا غم نہ کرے۔)

بادہ و شراب | عشق و محبت را گویند۔
(عشق اور محبت کو کہتے ہیں۔)

بازگشت | و آں این ست کہ ہر بارے کہ ذکر بزبانِ دل کلمۂ طیبہ را گوید در عقب آں بدل مناجات کند کہ الٰہی مقصودِ من توئی و رضائے تو (یعنی بازگشت یہ ہے کہ جب زبانِ دل کلمۂ طیبہ کا ذکر کیا جائے تو اس کے بعد دل میں خدا سے دعا کرے کہ خدایا تو اور تیری رضا ہی میرا مقصود ہے۔)

بادہ فروش، پیرِ مغاں، پیرِ خرابات و خمار

مرشد را گویند (مرشد و راہبر کو کہتے ہیں۔)

بامداد | معرفت بر بازگشت، احوال و واردات (حالات و واردات کے بازگشت کے مقام کو کہتے ہیں۔)

بت و شاہد | معانیِ مقصود را گویند (معانیِ مقصود کو کہتے ہیں۔)

بت خانہ، بت کدہ، شراب خانہ، دیر، خرابات، عالم معنی

باطن عارف را گویند (عارف کے باطن کو کہتے ہیں)

بروز[۱] — کوئی روح کسی زندہ کے بدن میں تصرف کرے۔ یہ تصرف عین مشائخ میں تو معمولی بات ہے اور انسان سے بطور خرق عادت واقع ہوتا ہے۔

بوسہ و غمزہ و نیشی — جذبۂ باطن را گویند (باطنی جذبہ کو کہتے ہیں)

تجرید و تفرید — دنیاوی و اخروی اغراض کو ترک کر دینا تجرید ہے اور کسی چیز کی اپنی طرف نسبت نہ کرنا تفرید ہے۔

تجلی و استتار — تجلی ظہور کو کہتے ہیں۔ اور استتار پوشیدہ ہونے کو۔ تجلی کی کئی قسمیں ہیں اور ہر ایک کے جدا آثار ہیں۔ ایک تجلی ذاتی ہے اس کا اثر یہ ہے کہ اگر سالک کے وجود عنصری کے صفات و آثار کچھ باقی ہیں۔ تب تو بے ہوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر بے ہوش ہو گئے اور اگر وجود عنصری کے آثار بالکل فانی ہو چکے ہیں تو مشاہدہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ شب معراج آنحضرت

۱؎ تنبیہ۔ جمہور جو تناسخ یعنی آواگون کے قائل ہیں وہ اہل حق کے نزدیک باطل ہے (بروز جس کا بیان ہوا اور تمثل اور خلع بدن، جن کا بیان آئندہ آئے گا) کے وقوع سے کسی کو جواز تناسخ کا دھوکہ نہ ہو جائے۔ تناسخ میں اور ان میں صریح فرق ہے۔ تمثل میں ذات کو اپنی کسی حالت سے انتقال نہیں ہوتا۔ اور تناسخ میں روح کا منتقل ہونا اعتبار کیا گیا ہے۔ اس سے نیز فرق ہے اور خلع بدن میں جو روح دوسرے بدن میں آگئی ہے اس کی ابھی موت نہیں آئی تھی اور تناسخ بعد مرنے کے قرار دیا گیا ہے اور بروز میں جس بدن میں روح نے اپنا اثر کیا اس میں پہلے سے روح موجود ہے۔ بخلاف تناسخ کے کہ یہی روح اس بدن میں آتی ہے۔ ان فرقوں کو اچھی طرح سمجھ لو۔

خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت ہوا۔ اور بعد ازاں سب مومنین کو جنت میں دیدار ہوگا۔ دوسری تجلی صفاتی۔ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر صفات جلالی تجلی کریں تو سالک پر خشوع و خضوع کا غلبہ ہوتا ہے اور اگر صفات جمالی تجلی کریں۔ تو سالک کو سرور و انس ہوتا ہے۔ تیسری تجلی افعالی۔ اس کی علامت یہ ہے کہ سالک کی نظر کسی مدح و ذم، نفع و ضرر و رد و قبول پر نہیں رہتی۔

تجلی روح کے وقت سالک کے اندر عجب و پندار پیدا ہوتا ہے اور تجلی حق کے وقت فنا و عجز طاری کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ مگر خود سالک پر فنا و عجز کا ورود نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تجلی اسی روح کی ہے جس کے سامنے تمام عالم سربسجود نظر آتا ہے۔ پھر اس پر فنا و عجز کیونکر طاری ہوگا۔ اور تجلی حق کے وقت خود اس کی روح پر بھی فنا و عجز کا ورود ہوتا ہے اور تمام عالم کے ساتھ خود اس کی روح بھی سربسجود ہوتی ہے اس وقت سالک پر فنا و عجز کا غلبہ ہوتا ہے۔ (اشرف المسائل ص۳۳)۔

بعض اوقات سالک، روحانی تجلی کو ربانی تجلی سمجھ کر گمراہ ہوتا ہے اس مقام پر شیخ کامل محقق کی ضرورت ہے۔

ترسا | مرد روحانی را گویند کہ از صفات ذمیمہ و نفس امارہ خلاص یافتہ باشد و موصوف بصفات حمیدہ شدہ باشد۔ (یعنی ترسا اس روحانی آدمی کو کہتے ہیں کہ جو بری صفات اور نفس امارہ سے خلاصی پا چکا ہو۔ اور اچھی صفات رکھتا ہو۔)

ترسا بچہ | واردات غیبی را گویند کہ از عالم غیب در دل سالک فرود آید (یعنی ترسا بچہ ان واردات غیبی کو کہتے ہیں۔ جو عالم غیب سے سالک کے دل میں وارد ہوں۔)

تزکیہ | اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرنا۔ جس طرح جسم ظاہری کے لیے ایک حالت صحت کی ہے اور ایک مرض کی۔ اسی طرح باطن کے لیے بھی ایک حالت صحت کی ہے اور ایک مرض کی۔ اور نفس کو امراض باطنیہ سے پاک کرنا ہی تزکیہ ہے

جس کا شریعت میں نہایت تاکید سے امر ہے اور اسی کو مدارِ فلاح ٹھہرایا گیا ہے۔

(اشرف المسائل صفحہ ۸۳)

تفرد | عبارت است از تنہا کردن از جمیع ماسوی اللہ تعالیٰ (تمام غیر اللہ سے اپنے آپ کو خالی کر لینا۔)

تلوین و تمکین | سالک کے قلب کے حالات کا مختلف ہونا کہ کبھی قبض ہو کبھی بسط، کبھی سکر، کبھی صحو۔ بالخصوص مبتدی کو اس کو بہت تغیر پیش آتا ہے۔ اس کو تلوین کہتے ہیں۔ یہ لوازمِ سلوک سے ہے مضر نہیں۔ اس سے پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ وہ پریشانی البتہ مضر ہے۔ (اور دوامِ طاعت و کثرتِ ذکر میں استقامت کے ساتھ مشغول رہنے سے حسبِ استعداد آخر میں مناسب حالت محمودہ پر قرار ہوتا ہے۔ جس کو اصطلاحِ تصوف میں تمکین کہتے ہیں۔ تمکین کے بعد تمام اشیاء کے حقوق بخوبی ادا ہوتے ہیں۔ اسی تمکین کا نام توسط و اعتدال ہے۔ اسی توسط کی وجہ سے اس امت کا نام امتِ وسط ہے تلوین والا پہچانا جاتا ہے اور صاحب تمکین کی حالت عوام جیسی ہو جاتی ہے۔ پس صاحبِ تلوین صاحبِ حال ہے اور صاحبِ تمکین، حقیقت شناس ہے۔ صاحبِ تلوین ابھی راہ میں ہے اور صاحبِ تمکین واصل ہو چکا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں زنانِ مصر صاحبِ تلوین تھیں اور حضرت زلیخا صاحبِ تمکین۔

تمثل | کوئی ذات باوجود بقاء اپنی حالت و صفت کے کسی دوسری صورت میں ظہور کرے۔ اس دوسری صورت کو صورتِ مثالی کہیں گے جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام صورتِ بشریہ میں متمثل ہوتے تھے۔ یہ نہ تھا کہ فرشتہ سے آدمی بن جاتے تھے ورنہ تمثل نہ ہوتا۔ استحالہ یا انقلاب ہوتا۔ خواب و مکاشفات میں حق تعالیٰ کو صورتِ مثالیہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی تجلی مثالیہ

۱؎ التکشف صفحہ ۴۴۲ ۲؎ انفاس عیسیٰ صفحہ ۳۲۵/۱۳۲ ۳؎ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا الآیۃ۔ معہ رأیت ربی فی احسن صورۃ ۱۲۔

نورِ الٰہی کو دیکھا۔ ذاتِ خداوندی کو نہیں دیکھا۔ ورنہ طالب دیدار ہوتے۔ لیس اللہ تعالیٰ مثل سے پاک ہے مگر مثالِ نورِ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی بیان فرمائی ہے۔ کیونکہ دو چیزوں میں کچھ صفات مشترک ہوں۔ ان میں ایک کو دوسری کی مثال کہتے ہیں۔ مثلاً حسین آدمی کو چاند سے تشبیہ دیں تو وہ آدمی چاند نہیں ہو گیا۔ مگر صفتِ حسن میں اشتراک ہونے سے چاند کو آدمی کی مثال کہیں گے اور اس کی شناخت سے حسنِ انسانی کی کسی قدر شناخت ہو جاوے گی گو کامل شناخت نہ ہو۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اس میں غور نہ کرنے سے کفر و الحاد لازم آجاتا ہے۔

حجاب | پوشانیدن دلِ سالک از مشاہدہ (مشاہدہ سے سالک کے دل کو باز رکھنا)

جمع و فرق و جمع الجمع | مخلوق کو یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی فاعل اور موصوف بصفات فرمایا ہے۔ فرق ہے اور یہ سمجھنا کہ ان میں نہ کوئی فعل ہے نہ کوئی صفت حقیقتاً فاعل اور موصوف ذاتِ حق ہے اور سب اس کا پرتو۔ یہ جمع ہے اور بالکل مخلوق پر نظر نہ رہنا یہ جمع الجمع ہے اور ایک اصطلاح اس میں اور ہے۔ ممکنات کو فاعل و موصوف سمجھنا فرق ہے اور صرف حق پر نظر ہونا جمع ہے اور مخلوق کو آئینہ صفاتِ حق سمجھنا جمع الجمع ہے۔

حجر | بازداشتن سالک از سلوک عروج (یعنی سالک کو مقاماتِ عالیہ پر چڑھنے سے روکنا۔

چلیپا | عالم طبائع را گویند (عالم طبائع کو کہتے ہیں)

حال و مقام | سالک کے قلب پر جو کیفیت غیب سے نازل ہو جس میں اس کا کچھ اختیار نہیں۔ اس کو حال کہتے ہیں اور جس مرتبہ سلوک میں اس نے پختگی و استقامت و دخل کی ہو وہ مقام ہے۔ [illegible]

[illegible]   مثالِ نور [illegible]

ہیں۔ جن کی تحصیل کا شریعت نے امر کیا ہے اور ہر مسلمان خصوصاً سالک ہمیشہ ان کے طے کرنے میں مشغول ہے۔ کسی وقت توقف نہیں ہوتا مقام تو سالک کے تحت میں ہوتا ہے اور حال کے تحت میں سالک ہوتا ہے (الرحیل ص۳۱)

حجابات

اہل کشف نے فرمایا ہے کہ ہر لطیفہ میں دس دس ہزار حجابات ظلمانی و نورانی ہیں۔ اور لطیفہ قالبیہ کو ملا کر سات لطیفے ہیں۔ تو ستر ہزار حجاب ہوئے۔ ذکر سے ظلمت دفع ہوتی ہے اور لطیفہ کا نور سالک کو نظر آتا ہے۔ یہ علامت ان حجابات کے اٹھ جانے کی ہے۔ مثلاً حجاب نفس کا شہوت و لذت ہے اور حجاب دل کا نظر کرنا غیر حق پر۔ اور حجاب عقل کا معانی فلسفیہ میں خوض کرنا اور حجاب روح کا مکاشفات عالم مثال کے۔ وعلیٰ ہذا ان میں کسی کی طرف ملتفت نہ ہو مقصود حقیقی کی طرف متوجہ ہے اور غیر مقصود کی نفی کرتا ہے۔ اشعار۔

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
تیغ لا در قتل غیر حق براند
در نگر آخر کہ بعد لا چہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ رفت
مرحبا اے عشق شرکت سوز زفت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہو جاتا ہے تو معشوق کے سوا سب کو نذر آتش کر دیتا ہے غیر اللہ پر لا کی تلوار چلا اور پھر دیکھ کہ لا کے بعد کیا رہتا ہے۔ بس الا اللہ رہ جائیگا۔ باقی سب ختم ہو جائے گا)۔

حجابات کے چار مرتبے ہیں۔ مرتبہ لاہوت، مرتبہ جبروت، مرتبہ ملکوت، مرتبہ ناسوت۔ یہ مقامات سلوک نہیں ہیں۔ بلکہ یہ مراتب وجود ہیں۔ بعضوں نے ایک اور قافیہ نکالا ہے۔ ہاہوت۔ معلوم یہ لغت بھی ہے یا نہیں۔ ہاہوت درجہ ذات حق ہے۔ اگر یہ

۱؎ مقالات حکمت ص۳۵ الرحیل ص۳۱

لغت صحیح ہو اور لاہوت مرتبۂ اجمال صفات ہے اور جبروت مرتبۂ تفصیل صفات ہے اور ملکوت عالم ملائکہ ہے اور ناسوت عالم انسان ہے۔ لاہوت و لاہوت و جبروت کا طے کرنا تو انسان سے محال ہے۔ ذات و صفات حق کے مراتب کون طے کر سکتا ہے کہ امکان کا انقلاب وجوب کی طرف لازم آتا ہے اور ناسوت کے طے کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس میں تو آپ موجود ہی ہیں اور ملکوت میں پہنچنا ممکن تو ہے۔ مگر اختیاری نہیں۔ بعد موت کے خود بخود ہر شخص وہاں پہنچ جائے گا۔ حتیٰ کہ کافر بھی پہنچ جائے گا۔ مرتبۂ لاہوت و مرتبۂ جبروت غیر مخلوق ہیں۔ غیر مرتبۂ صفات اجمالیہ تفصیلیہ۔ اسی کا جس قدر انکشاف ہو وہی سلوک مقصود ہے۔ باقی دو مرتبے جو مخلوق ہیں وہ حجاب ہیں۔ مرتبۂ ملکوتی حجاب نورانی ہے اور مرتبۂ ناسوتی حجاب ظلمانی۔ مرتبہ ناسوتی چونکہ مبتذل و حقیر ہے۔ اس وجہ سے چنداں حاجب نہیں۔ برخلاف مرتبۂ ملکوتی کے کہ وہ زیادہ حاجب ہے۔

خاطر قلب پر جو خطاب وارد ہوتا ہے وہ خاطر ہے۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔ ایک اللہ کی طرف سے۔ دوسرا فرشتہ کی طرف سے۔ تیسرا نفس کی طرف سے۔ چوتھا شیطان کی طرف سے۔ اول کو خاطر حق، دوسرے کو الہام تیسرے کو ہواجس، چوتھے کو وسواس کہتے ہیں۔ پہچان یہ ہے کہ اگر نیک بات دل میں آوے اور اس کے خلاف پر عمل کر سکے تو الہام ہے اور اگر خلاف پر عمل نہ کر سکے تو خاطر حق ہے اور اگر بری بات دل میں آئے تو اگر شہوت و غضب و کبر وغیرہ صفات نفس کی طرف رغبت ہوتی ہے تو ہواجس ہے اور اگر کسی گناہ کی طرف میلان ہے تو وہ وسواس ہے۔ بعضوں نے اس طرح فرق بیان کیا ہے۔

چہاردہ خانوادہ

۱:۔ زیدیاں منسوب بخواجہ عبدالواحد بن زید رح

۲:۔ عیاضیاں منسوب بخواجہ فضیل بن عیاض رح

۳:۔ خانوادہ ادہمیاں منسوب بخواجہ ابراہیم ادہم رح

۴:۔ خانوادہ ہبیریاں منسوب بہ ابوہبیرۃ البصری رح

یازدہم خانوادہ عیدروسیہ منسوب بہ سید عبداللہ الکی العیدروس رح

دوازدہم خانوادہ مداریہ منسوب بحضرت بدیع الدین مدار رح

خشم | ظہور صفات قہر را گویند۔
(صفات قہر کے ظہور کو کہتے ہیں۔)

خلع بدن | کوئی روح اپنا بدن حالتِ حیات میں چھوڑ کر دوسرے مردہ بدن میں چلی جائے۔ یہ بات ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے

خلوت در انجمن | آنست کہ بظاہر با خلق و بباطن با حق تعالیٰ بود باید کہ عبارت از ذکر لسانی و قلبی است یعنی دور کردن غفلت بذکر حق تعالیٰ
(خلوت در انجمن یہ ہے کہ ظاہر میں خلوق کے ساتھ اور باطن میں بواسطۂ ذکر حق تعالیٰ کے ساتھ ہو اور ذکر سے مراد ذکر زبانی و قلبی ہے یعنی غفلت کو حق تعالیٰ کے ذکر سے دور کرے۔)

دلبر | صفت قابضی را گویند۔
(قبض کی صفت کو کہتے ہیں۔)

دلبر و دوست و صنم و محبوب و یار | تجلی صفات را گویند
(صفات کی تجلی و انکشاف کو کہتے ہیں۔)

دلدار | صفت باسطی را گویند۔
(صفت بسط کو کہتے ہیں)

دیر | عالم انسانی را گویند
(عالم انسانی کو کہتے ہیں۔)

رابطہ | رابطہ خاص ایک شغل کا نام ہے جس میں شیخ کی صورت ذہن میں حاضر کر کے نور قلب سے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر اور خیال کو سادھ کر رکھا جاتا ہے۔

فیض حق کا نہ حاضر ناظر بکن — یہ تصور کیا جائے کہ شیخ حاضر و ناظر ہے۔

** اس مقام پر تصور شیخ کا بیان بھی ملاحظہ کیا جائے۔

ساقی و مطرب | فیض رسانندگان معنی را گویند۔
(معنوی فیض پہنچانے والوں کو کہتے ہیں)

سالک، واقف، راجع | فوائد الفواد میں ہے کہ سالک وہ ہے جو راہ چلے اور واقف وہ ہے جو بیچ میں اٹک جائے جیسے

جب سالک عبادت میں کوتاہی کرتا ہے اگر جلدی سے توبہ اور استغفار کر کے بدستور پھر سرگرم ہو گیا تو پھر سالک بن جائے گا۔ اگر خدانخواستہ وہی خصلت رہی تو اندیشہ ہے کہ کہیں راجع یعنی واپس نہ ہو جائے۔

اس راہ کی لغزش کے سات درجے ہیں۔ اعراض۔ حجاب۔ تفاصل۔ سلب مزید، سلب قدیم، تسلی، عداوت۔

اول اعراض ہوتا ہے۔ اگر معذرت و توبہ نہ کی، حجاب ہو گیا۔ اگر پھر بھی اصرار رہا، تفاصل ہو گیا۔ اگر اب بھی استغفار نہ کیا تو عبادت میں جو کیفیت ذوق و شوق کی تھی، وہ سلب ہو گئی۔ یہ سلب مزید ہے۔ اگر اب بھی اپنی بیہودگی نہ چھوڑی تو جو راحت و عبادت کی زیادتی سے قبل عبادت میں تھی وہ بھی سلب ہو گئی۔ اس کو سلب قدیم کہتے ہیں۔ اگر اس پر بھی توبہ میں تقصیر کی تو جدائی کو دل گوارا کرنے لگا، یہ تسلی ہے۔ اگر اب بھی وہی غفلت رہی تو محبت، مبدل بعداوت ہو گئی نعوذ باللہ منہا۔

سعادت | عبارت است از استغراق در ہستی حضرت حق سبحانہ تعالیٰ
(خدا تعالیٰ کی ہستی میں مستغرق ہو جانا)

سفر در وطن | آنست کہ سالک از طبیعت بشریہ سفر کند۔ یعنی از صفات ذمیمہ بصفات حمیدہ برآید کہ معنی تخلقوا باخلاق اللہ است۔ (سفر در وطن یہ ہے کہ سالک طبیعت بشریہ سے سفر کرے۔ یعنی صفات ذمیمہ کو چھوڑ کر صفات حمیدہ اختیار کرے جو تخلقوا باخلاق اللہ کے معنی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنانا اور اپنے اندر وہ اخلاق پیدا کرنا)

\+ \+ \+

سمع — نور اللہ را گویند
اللہ کے نور کو کہتے ہیں۔[١]

سیر الی اللہ و سیر فی اللہ — تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں۔ ایک سیر الی اللہ یہ تو محدود ہے۔ ایک سیر فی اللہ، یہ غیر محدود ہے۔ سیر الی اللہ یہ ہے کہ نفس کے امراض کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفا ہوگئی اور ذکر و شغل سے سیر شروع کی۔ یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہوگیا۔ یعنی تخلیہ و تحلیہ کے قواعد جاری کئے گئے۔ موانع مرتفع کر دیئے۔ معالجہ امراض سے واقف ہوگئے۔ نفس کی اصلاح ہوگئی۔ اخلاق رذیلہ زائل ہوگئے۔

اخلاق حمیدہ اور انوار ذکر سے قلب آراستہ ہوگیا۔ اعمال صالحہ کی رغبت طبیعت ثانیہ بن گئی۔ اعمال و عبادت میں سہولت ہوگئی۔ نسبت و تعلق مع اللہ حاصل ہوگیا۔ تو سیر الی اللہ ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفات و ذات کا حسب استعداد انکشافات ہونے لگے۔ تعلق سابق میں ترقی ہوئی۔ اسرار و حالات کا ورود ہونے لگے۔ یہ غیر محدود ہے یہ وہ تعلق ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آنجا جز آنکہ جان بسپارند چارہ نیست

عشق کا سمندر ایک ایسا سمندر ہے کہ جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں سوائے جان دینے کے کوئی چارہ نہیں۔

شاہد — جو چیز قلب پر غالب ہو وہ شاہد ہے۔ بعض کا قول ہے کہ شاہد صاحب جمال کو کہتے ہیں۔ اگر اس کے روبرو آجانے سے سالک کے قلب میں کچھ تغیر پیدا نہ ہو تو یہ علامت اس کے فنائے نفس کی ہے اور اگر تغیر پیدا ہو جائے تو علامت حیات نفس کی ہے تو گویا صاحب جمال اس کے حال کا شاہد ہو۔

١؎ اخلاق جلیلی صفحہ ۳

شطح — بے اختیاری کی حالت میں جو غلبۂ وارد کی وجہ سے ظاہری قواعد کے خلاف کوئی بات منہ سے نکل جاتے وہ شطح ہے اس شخص پر نہ گناہ ہے۔ نہ اس کی تقلید جائز ہے۔

شقاوت — عبارت است از دیدار حق تعالیٰ باز ماندن (حق تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہنا۔)

شیدا — اہلِ جذب و اہلِ شوق را گویند (اہلِ جذب اور اہلِ شوق کو کہتے ہیں۔)

صبح — طلوعِ احوال واردات و اعمال را گویند (انوار واردات اور اعمال کے طلوع کو کہتے ہیں۔)

صبوحی — محادثہ را گویند۔
(باہم تکلم کو کہتے ہیں)

صوفی — خیر القرون میں تو صحابی، تابعی، تبع تابعی۔ امتیازِ حق کے لیے کافی القاب تھے۔ پھر خواص کو زہاد و عُبّاد کہنے لگے۔ پھر جب فتن و بدعات کا شیوع ہوا اور اہلِ فرق بھی [illegible] کو عباد و زہاد کہنے لگے۔ اس وقت اہلِ حق نے امتیاز کے لیے صوفی کا لقب اختیار کیا۔ اور دوسری صدی کے اندر ہی اس لقب کی شہرت ہوگئی۔

طامات — معارف را گویند۔
(معارف کو کہتے ہیں)۔

طریق باطن — مداومتِ ذکر اور اطاعتِ احکام۔ ملکاتِ باطنہ مثل توکل، رضا، شکر وغیرہ کا نام ہے۔ (انفاسِ عیسیٰ صفحہ [illegible])

طریق جذب و طریق سلوک — تربیت کے دو طریق ہیں۔ ایک جذب دوسرا سلوک۔ جذب یہ کہ طالب پر ذکر و فکر کے ذریعے سے محبت کا غلبہ کیا جائے۔ اور اعمال زائدہ میں کم لگایا جائے۔ اور اس طریق محبت کے

اصطلاح نہیں۔ اور غیریت یہ کہ ان دونوں میں کسی قسم کا تغایر اور امتیاز ہو۔ یعنی فرق ہو۔ اس تفسیر پر عینیت اور غیریت میں باہم تناقض ہے جس سے ان دونوں کا ایک محل میں جمع ہونا بھی محال ہے اور دونوں کا کسی محل سے مرتفع ہونا بھی محال ہے اور یہ معنی عینیت و غیریت کے یہی ہیں۔ اور یہی معنی لغوی ہیں۔ اور اسی معنی میں اکثر ہونا استعمال ہوتا ہے اور اکثر اہل معقول بھی یہی مراد لیتے ہیں۔ اس تفسیر کے اعتبار سے کوئی شے موجود خواہ وہ حادث و مخلوق ہو۔ جیسے تمام زمین و آسمان کی چیزیں یا قدیم و غیر مخلوق ہو۔ جیسے صفات باری تعالیٰ کہ عین ذات باری تعالیٰ کی نہیں۔ (مثلاً علیم و حکیم یعنی ذی علم و ذی حکمت وغیرہ۔)

معنی ثانی عینیت کی تو وہی تفسیر جاری ہے۔ اور غیریت کے یہ معنی ہوں کہ دو چیزوں میں سے کسی ایک کا بدون دوسرے کے موجود ہو سکنا۔ اس تفسیر پر عینیت و غیریت میں باہم تناقض تو نہیں مگر تضاد ہے۔ یعنی دونوں ایک محل پر صادق نہیں آ سکتے مگر دونوں مرتفع ہو سکتے ہیں۔ یہ اصطلاح متکلمین کی ہے۔ اس تفسیر کے اعتبار سے بھی ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات میں عینیت نہیں۔ بلکہ غیریت ہے۔

معنی ثالث۔ عینیت کے معنی ہیں۔ ایک شے کا دوسری شے کی طرف محتاج فی الوجود ہونا۔ گو وہ دوسری شی اس پہلی کی محتاج نہ ہو اور غیریت کے وہ معنی ہیں۔ جو معنی اول میں مذکور ہوتے ہیں۔ یعنی ان دونوں شے میں سے کسی قسم کا تغایر و امتیاز و فرق ہونا۔ اس تفسیر پر عینیت و غیریت میں نہ باہم تناقض ہے اور نہ تضاد۔ بلکہ دونوں کا جمع ہونا ایک محل میں ممکن ہے۔ مثلاً زید و اس کی صفات۔ کہ صفات بدون زید کے نہیں پائی جاتیں۔ اس لیے عینیت صادق آئی۔ اور دونوں باہم ممتاز بھی ہیں۔ اس لیے غیریت صادق آئی۔ اور یہ اصطلاح حضرات صوفیہ کرام کی ہے۔ اس تفسیر کے اعتبار سے ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات میں عینیت بھی ہے۔ کیونکہ مخلوقات ذات باری تعالیٰ کی محتاج ہیں۔ گو ذات باری تعالیٰ احتیاج سے منزہ ہے اور غیریت بھی ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات میں ہر طرح کے فرق ہیں۔ (تکشف ص ۲۹)

غمگساری | صفت رحمانی را گویند (رحمانی صفت کو کہتے ہیں)

غیبت و حضور و شہود | کوئی وارد قوی قلب پر آیا۔ خواہ صفات خداوندی کا غلبہ ہوا۔ یا کچھ ثواب و عذاب یاد آیا۔ اس کے غلبہ سے حواس معطل ہو گئے۔ اور اِدھر کی خبر نہ رہی۔ یہ غیبت ہے۔ یعنی خلق سے۔ اور جب ہوش آ گیا۔ حضور ہو گیا اور کبھی اسی غیبت کو حضور کہتے ہیں۔ یعنی حضور بحق۔ کبھی حضور کی جگہ شہود بولتے ہیں اس کے معنی بھی حضوری کے ہیں۔ سو جو چیز قلب میں حاضر ہوگی وہ شاہد و مشہود ہے۔ لیکن اکثر صوفیہ جب لفظ شہود بولتے ہیں تو شہود حق مراد لیتے ہیں اور لفظ شواہد سے مخلوق مراد لیتے ہیں پس غیبت کی دو قسمیں نکلیں۔ ایک محمود۔ اگر خلق کی طرف سے ہے ایک مذموم اگر حق کی طرف سے ہے اسی طرح حضور کو سمجھ لو۔

غیرت | اہل کمال کے نزدیک طاعت حق ہر امر میں مقدم ہوتی ہے اگر احیاناً کسی چیز کی مشغولی نے طاعت حق میں خلل ڈالا تو اہل کمال کو اس چیز کے رفع کرنے کا ایک ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی از حق تعالیٰ سے غافل کرنے والی چیز سے نفرت ہو جانا اس کو غیرت کہتے ہیں۔ (التکشف ص۳۳۳)

فلاشی | بے شہرت و مباشرت اعمال را گویند۔ (مصاحبت اور اعمال کے اپنانے کو کہتے ہیں)

قلندر و قلاش | اہل صفا و اہل ترک را اہل فنا را گویند (اہل صفا اور اہل ترک اور اہل فنا کو کہتے ہیں)

کباب | پرورش دل در تجلیات حق (حق تعالیٰ کی تجلیات میں دل کی پرورش ہونا)

کشف و شہود | مرتبہ عین اللہ را گویند (عین اللہ کے مرتبہ کو کہتے ہیں)

تحتانی رتبہ فوقانی کے لیے مورد ہے۔ اور فوقانی تحتانی پر مشتمل۔ اسی لیے فوقانی کا ذاکر و جہار کو جہنے سے تحتانی بھی ذاکر و جہار کہا جاتا ہے۔

بعض نے (تسمیں متعلقات میں) کچھ اختلاف بھی کیا ہے۔ اور وجہ اختلاف کی اختلاف کشف ہے کیونکہ جب لطائف خل مراۃ مثال کے (آئینے جو ذہن کا عکس نظر آتا ہے) کے ہیں۔ جس شخص کو جہاں کسی لطیفہ کا نور نظر آیا اس نے وہیں اس کا مقام سمجھ لیا۔ اور کسی کو مقام اصلی مکشوف ہوا۔ لطائف کی تحقیق بسوط کا اگر شوق ہو تو رسالہ "القول الکشف عن اللطائف" کا مطالعہ کیا جائے

(مبادی التصوف صلا)

مادہ و مجرد

(عالم خلق و عالم امر کی اصطلاح صفحہ ۳۶۲ پر ملاحظہ ہو۔)

محاضرہ و مکاشفہ و مشاہدہ

محاضرہ تجلی افعال کو کہتے ہیں۔ مکاشفہ تجلی صفات کو اور مشاہدہ تجلی ذات کو۔ محاضرہ قلب سے ہوتا ہے۔ مکاشفہ سر سے اور مشاہدہ روح سے۔

محو و اثبات

اس کے معنی قریب قریب فنا و بقا کے ہیں اور وہی تفسیر یہاں بھی ہیں۔ اور محو کے معنی میں اور بھی چند الفاظ مستعمل ہیں۔ محق، سحق، طمس۔ اور اگر ان الفاظ میں کچھ فرق کیا جائے تو بھی مضائقہ نہیں۔ جیسے صفات کو محق کہیں۔ اور فنائے ذات کو سحق اور صفات و ذات کے آثار محو ہو جانے کو طمس کہیں۔

مدارات و مداہنت

مدارات کا حاصل اہل جہل کے ساتھ نرمی کرنا ہے کہ وہ دین کی طرف آجائیں اور اہل شر کے ساتھ نرمی کرنا۔ کہ ان کے شر سے حفاظت رہے اور یہ دونوں امر مطلوب ہیں۔ اول تو خود دین ہی مقصود ہے اور ثانی مقصود میں معین ہے۔ کیونکہ کسی شریر کی ایذا میں مبتلا ہو جانے سے احیاناً طاعت میں بھی اور اکثر تبلیغ میں بھی خلل پڑ جاتا ہے اور مداہنت جہد خلق کے ساتھ نرمی کرنا ہے تاکہ ان سے مال و جاہ کا نفع حاصل کرے (اور یہ ناجائز اور حرام ہے)

اور مدارا۔ حضرات صوفیہ کے خاص اخلاق سے ہے۔ (کمالات اشرفیہ صفحہ ۹)

کوبھی اس سے تعلق ہوجاتا ہے اور اس کا اظہار ایک دم سے نہیں ہوتا بلکہ رفتہ رفتہ ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ البتہ اس کی ظاہری علامت یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام افعال، اقوال و حرکات میں زیادہ تشبہ ہو۔ ہر ہر بات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ اتباع عادت ہو جائے کہ بے تکلف سنت کے موافق افعال صادر ہونے لگیں۔ (انفاس عیسیٰ ص۵۳ اشرف المسائل ص۱۵۵، ۱۵۶ ملخصاً)

نظر بر قدم

آنست کہ در آمد و رفت راہ ہر جا کہ باشد نظر بر پشت پا دارد۔ تا نظر پراگندہ نہ شود و شاید نظر بر قدم اشارت بسرعت سیر سالک بود در قطع مسافت ہستی۔ یعنی نظر او ہر جا کہ منتہی شود فی الحال قدم برآں نہد۔ (یعنی نظر بر قدم یہ ہے کہ آمد و رفت میں جہاں کہیں بھی ہو۔ نظر اپنے پاؤں پر رکھے تاکہ نظر منتشر نہ ہو۔ اور شاید نظر بر قدم کا اشارہ سالک کی مسافت ہستی کے طے کرنے کی تیز رفتاری کی طرف ہو۔ یعنی سالک کی نظر جس مقام پر ختم ہو سالک اپنا قدم اس مقام پر رکھے۔

نفس

نفس انسان کے اندر ایک قوت ہے جس سے کسی چیز کی خواہش کرتا ہے خواہ وہ خواہش خیر ہو یا شر۔ اگر اکثر شر کی خواہش کرے اور نادم بھی نہ ہو اس وقت امارہ کہلاتا ہے یعنی کثیر الامر بالسوء (برائی کا بہت زیادہ حکم کرنے والا) اور اس مرتبہ کی خواہش کا نام ہوٰی ہے اور کبھی کبھی اس میں خیر کی بھی خواہش پیدا ہو جانا اس مفہوم کے منافی نہیں کیونکہ کثیر الامر کو دائم الامر ہونا لازم نہیں اور اگر نادم بھی ہونے لگے تو لوامہ کہلاتا ہے اور اگر اکثر خواہش خیر کی کرے اس وقت مطمئنہ کہلاتا ہے یعنی ساکن الی الخیر (نیکی پر ٹھہرنے والا) گو کبھی اس میں شر کی بھی خواہش بالکل احیاناً پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بعض انجذاب یعنی میلان منافی سکون نہیں۔ چنانچہ اجسام ثقیلہ باوجود میلان الی المرکز کے ساکن بھی دیکھے جاتے ہیں۔ البتہ اس خواہش کے مقتضا پر عمل کرنا کہ حرکت من المقر ہے۔ یہ البتہ منافی سکون ہے تو اس صورت میں مطمئنہ نہ رہیگا غرض دونوں خواہشیں خیر کی بھی اور شر کی بھی نفس ہی سے متعلق ہیں۔ البتہ اسباب ہر خواہش کے جدا جدا ہیں۔ بعض تو مشاہد ہیں۔ جیسے نصیحت و صحبت نیک۔ خواہش خیر کے لیے اور اغوا و صحبت بد، خواہش شر کے لیے اور بعض امور غیر مشاہد ہیں جیسے القاء ملک، خواہش خیر

کے لیے۔ جو ملاتا ہے شیطان خواہش شر کے لیے۔ اسی کو حدیث میں لمۃ الملک اور لمۃ الشیطان اور ایعاد بالخیر اور ایعاد بالشر سے تعبیر فرمایا ہے۔

نفس مکار شیطان سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ اسی کو یعنی نفس ہی نے خرابی میں ڈالا تھا تو یہ نفس شیطان کا بھی باپ ہوا۔ پس نفس کا مغلوب کرنا شیطان کے مغلوب کرنے سے بھی اہم ہے اسی واسطے مجاہدہ نفس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے (التکشف صفحہ ۱۰۳، کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۰۳)

نگاہداشت | مراد از مراقبہ خاطر است از خطرۂ ماسوی اللہ تعالیٰ چنانچہ اگر در یکدم صد بار کلمۂ طیب را گوید خاطر بغیر نہ رود۔

(مراد اس سے یہ ہے کہ اپنے دل کی غیر اللہ کے خیالات کے آنے سے نگہبانی کرنا (یعنی یہاں تک) کہ اگر یک دم سو مرتبہ کلمہ طیبہ کہے تو دل غیر اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔)

وارد | خاطر تو کلام نفسی ہے اور وارد عام ہے۔ جمیع کیفیات کو جیسے حزن و سرور و قبض و بسط وغیرہ۔

وصل | عبارت است از نسیانِ خود بشہود نور وجود حق تعالیٰ۔
واللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ذوقی حضور و تعلق ہو جاوے اور غیر سے غفلت و ذہول۔ جب یہ نسبت متصل ہو جاوے۔ اس کو وصل کہتے ہیں۔)

وفا | عنایت ازلی را گویند۔
(عنایت ازلی کو کہتے ہیں)

وقت و نفس | بندہ پر جو حال غالب ہو۔ جیسے حزن و سرور مثلاً اس کو وقت کہتے ہیں اور یہ سالک و غیر سالک دونوں کو پیش آتا ہے۔ دوسرے معنی وقت کے سالک کے ساتھ مخصوص ہیں وہ یہ کہ غیب سے کوئی ایسا حال غالب ہو کہ سالک اپنی حالت سے باہر ہو جاوے یعنی بے خود ہو جاوے۔ یہ وقت کے معنی ہیں اگر یہ حالت دائم ہے تو نفس کہتے ہیں۔

وقوف زمانی | آنست کہ بندہ بہر حال واقف احوال خود باشد اگر بہ ملاحظت است شاکر باشد و اگر معصیت است عذر خواہ

(وہ یہ ہے کہ بندہ ہر حال میں اپنے احوال کا واقف ہو۔ اگر طاعت ہے تو شکر کرے اور اگر نافرمانی ہے تو عذر چاہے۔)

وقوف عددی | وآں عبارت است از رعایت عدد طاق در نفی و اثبات (اس کا مطلب یہ ہے کہ نفی و اثبات میں طاق عدد کو ملحوظ رکھے۔)

وقوف قلبی | آنست کہ ذاکر آگاہ و واقف باشد با حق تعالیٰ بوجہے کہ دل ایشاں علاقہ بغیر حق نہ باشد (یعنی وقوف قلبی یہ ہے کہ ذاکر حق تعالیٰ کا واقف ہو۔ اس طرح کہ دل تو از غیر حق سے متعلق نہ ہو۔)

ہمت | قلب کو کسی طرف اس طرح کھینچ اور یکسو کرنا کہ دوسری چیز کا خطرہ نہ آوے ہمت ہے۔ اس ہمت سے بڑے بڑے کام بنتے ہیں۔ آج کل تو اس کو توجہ کہتے ہیں۔

ہوش دردم | عبارت از آں است کہ ہمیشہ ہوشیار و آگاہ بر نفس خود باشد۔ تاکہ دم بہ غفلت نہ برآید۔ و ایں شغل دافع تفرقہ نفس است (یعنی اپنے نفس پر ہمیشہ ہوشیار رہے اور اس پر آگاہ رہے تاکہ کوئی لمحہ غفلت میں نہ گزرے اور یہ شغل نفس کے انتشار کو دفع کرنے والا ہے۔)

ہیبت | قبض میں جب اور ترقی ہوتی ہے اس کو ہیبت کہتے ہیں۔

یادداشت | عبارت از متوجہ بودن بحق تعالیٰ است، بہر حال بر سبیل ذوق۔ (یعنی ہر حال میں بطریق ذوق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا۔)

یقین کے مراتب | اعتقاد جازم مطابق للواقع ہو۔ (یعنی وہ پختہ اعتقاد جو واقعہ کے مطابق ہو یقین کہتے ہیں۔ اس کے تین مرتبے ہیں علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین۔)

فرمایا کہ متابعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ضروری ہے قولاً و فعلاً و ارادۃً۔ اس لیے کہ محبت خدا بے متابعت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاصل نہیں ہوتی۔

مجلس ۳۱ جو کچھ خداوند کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا وہ کرنا چاہیے اور جس سے خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا، اس سے بچنا چاہیے ۹۴ پھر کہا۔ لوگوں نے قرآن و حدیث کو چھوڑ دیا۔ لہذا خراب و پریشان ہیں۔

منقول از دلیل العارفین۔

مجلس دوم: حضرت خواجہ معین الدین چشتی ؒ نے فرمایا کہ جو آدمی شریعت پر ثابت قدم ہوا اور جو کچھ احکام شریعت کے ہیں ان کو بجا لایا اور سر ان سے تجاوز نہ کیا۔ تو اس کا مرتبہ آگے کو بڑھتا ہے۔ یعنی تمام ترقیاں اس پر موقوف ہیں کہ شریعت پر ثابت قدم رہے۔

مجلس ۸ علماء کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔

منقول از اسرار الاولیاء

اٹھارویں فصل حضرت شیخ فرید الدین ؒ نے فرمایا کہ اے درویش حدیث شریف میں آیا ہے کہ تعقیب عالم ہزار ایسے ایسے عابدوں سے بہتر ہے جو شب کو قیام کریں اور دن کو روزہ رکھیں۔ اور عالم کی ایک دن کی عبادت عابد بے علم کی چالیس دن کی عبادت کے برابر ہے۔

منتخب از مکتوبات قدوسیہ

مکتوب ۳۶۔ شریعت پر قائم رہو کیونکہ باطن کی صفائی اور اس جہان کی نجات کیلئے اس وقت بجز شریعت کے کوئی شے قوت اور موجب نہیں۔

مکتوب ۴۲۔ وہ لوگ شریعت کے احکام سے ہٹ گئے۔ حلال و حرام چھوڑ دیا۔ گمراہی میں پڑ گئے۔ کل کے دن کفار کے ساتھ محشور ہوں گے۔

از راحت القلوب۔

مجلس ۱۵: حضرت خواجہ بابا فرید گنج شکرؒ نے فرمایا جس مذہب میں کہ ہم ہیں۔ وہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔ یہ مذہب صواب پر ہے اور خطا کا احتمال نہیں ہے۔ دیکھیے قدمائے مشائخ ہیں کہ جنہوں نے سوائے متابعت خدا تعالیٰ و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی کام نہیں کیا۔

حضرت شاہ محب اللہ صاحب الٰہ آبادیؒ جو بڑے بزرگ تھے حضرت خضرؑ سے ملتے تھے۔ آپ نے کہی۔ جب قاضی ضیاء الدین سنامیؒ صاحب کی وفات کا وقت قریب آیا اور حضرت سلطان جی (نظام الدین اولیاءؒ) عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ (دستار اپنی) صاحبؒ اپنا عمامہ خادم کو دے کر فرمایا کہ اس کو بچھا دو اور سلطان جی سے عرض کرو کہ اس پر پاؤں رکھتے ہوئے تشریف لائیں۔ حضرت سلطان جیؒ نے وہ عمامہ اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا یہ دستار شریعت ہے اس کو تو میں سر پر رکھوں گا۔ جب قاضی صاحبؒ کا انتقال ہو گیا تو فرمانے لگے کہ افسوس شریعت کا ستون منہدم ہو گیا۔

فتوحات میں ہے[۲]

كل حقيقة على خلاف	جو حقیقت شریعت کے خلاف ہو وہ
الشريعة زندقة باطلة	بددینی اور مردود ہے۔
ما لنا طريق الى الله الا على	ہمارے لیے اللہ کی طرف کوئی راستہ نہیں
الوجه المشروع لا طريق	ہے مگر شرعی طور سے اور کوئی راہ نہیں ہمارے
لنا الى الله الا ما شرعه	لیے اللہ کی طرف کو مگر وہی جو اس نے شریعت
فمن قال ان ثمه طريقا	میں بتلا دی ہے جو شخص کہے کہ کوئی اور
الى الله خلاف ما شرع	راہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف برخلاف اس
فقوله زور فلا يقتدى به	کے جو شریعت نے بتلا دیا اس کا قول جھوٹا

۱۔ راحت القلوب ص ۱۲ ۲۔ تعلیم الدین ص ۲

بشیخ لا ادب لہ۔ | ہے جیسی اپنے شیخ کو مقتدا نہ بنایا جائے جس کو ادب نہ ہو۔

حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں:۔

لو نظرتم الی رجل اعطی	اگر تم ایسا آدمی دیکھو کہ کرامتیں دیا گیا ہے
من الکرامات حتی یرتقی	یہاں تک کہ ہوا میں اڑتا ہے تو دھوکے
فی الھواء فلا تغتروا بہ	میں نہ آؤ۔ جب تک یہ نہ دیکھو کہ امر و
حتی تنظروا کیف تجدونہ	نہی اور حفظ حدود اور پابندی شریعت
عند الامر والنھی وحفظ	میں کیسا ہے۔
الحدود الشرعیۃ۔	

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:۔

الطرق کلھا مسدودۃ علی	کل مخلوق پر سب راہیں بند ہیں۔ سوائے
الخلق الا علی من اقتفی اثر	اس کے کہ جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کے قدم بقدم چلے۔

اور فتوحات میں ہے۔

فما عند اللہ من لم یعلم	اللہ کے نزدیک نہیں ہے وہ شخص کسی مرتبہ
بحکمۃ بمکان فان اللہ ما	میں جو اس کے حکم کو نہ جانتا ہو۔ کیونکہ اللہ
اتخذ ولیا جاھلا وفیہ ان	نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا اور اسی فتوحات
البطالۃ مع العلم خیر	میں ہے کہ باوجود علم کے بیروزگی کرنا اس عمل
من العمل مع الجھل	سے بہتر ہے جو جہل سے ہو۔ فقط۔

الغرض یہ حضرات نہایت متبع سنت اور پابند شریعت تھے۔ اور کوئی بزرگ بھی ایسے نہیں ہوئے جنہوں نے اتباع سنت نہ کیا ہو۔ حتی کہ اگر غلبہ حال سے کبھی اتباع میں کچھ

لہ طریق القلندر صفحہ ۔

کی بھی ہو گئی ہے تو اپنی ساری حالت کو ناقص سمجھا ہے اور کبھی ناز نہیں کیا۔ سب بزرگوں کا ایک ہی طریق رہا ہے اور وہ طریقِ شریعت ہے۔ حضرت خواجہ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں۔

بر ہوا پری مگسے باشی، بر آب روی خسے باشی، دل بدست آر کہ کسے باشی۔ اگر بذریعہ کرامت ہوا پر بھی اڑو گے تو کیا ہے گویا مکھی ہو جاؤ گے کہ وہ بھی تو ہوا میں بلا تکلف اڑتی ہے پانی پر چلو گے تو یوں سمجھو کہ ایک تنکا ہو گئے کیونکہ وہ بھی تو پانی کی سطح پر بہتا ہوا جاتا ہے۔ ہاں اپنے دل کو قابو میں کرو تب انسان بنو گے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ سے کسی نے کہا کہ ایک قوم ہے جو یہ کہتی ہے۔ نحن وصلنا فلا حاجۃ لنا الی الصلٰوۃ والصیام ہم واصل ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں نماز اور روزہ کی حاجت نہیں رہی۔ حضرت جنیدؒ نے جواب میں فرمایا۔ صدقوا فی الوصول ولکن الی سقر۔ یہ لوگ سچ کہتے ہیں کہ واصل ہو گئے ہیں لیکن واصل جہنم ہوئے ہیں۔ نہ واصل خدا۔

(فوائد الفواد مجلس ۲۹۔ جمادی الآخر ۷۱۹ھ (ص ۲۰۷)

آپؒ (حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ) نے فرمایا کہ ایک دفعہ انھوں (حضرت خواجہ بایزید بسطامی رح) نے سبحانی ما اعظم شانی (پاک ہوں میں کس قدر بلند ہے میری شان) کہہ دیا۔ پھر آخر عمر میں آپ مستغفر ہوئے اور کہا میں نے یہ بات ٹھیک نہ کہی تھی۔ میں اس وقت یہودی تھا۔ اب زنار توڑتا ہوں اور از سر نو مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ واشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔ نے شریعت اور ادب کو کیسا جمع فرمایا ہے۔ اور نسبت کے اثبات نفی میں کیسی احتیاط فرمائی ہے۔

اس باب میں ہزاروں ارشادات بزرگوں کے مذکور ہیں۔ کہاں تک لکھا جاوے قشیریہ میں حضرت ذوالنون مصری رح و سری سقطی رح و ابو سلیمانؒ احمد بن ابی الحواری و ابو حفص حداد و ابو عثمان رفیدی و ابو سعید خراز سے اور دوسری کتابوں میں بھی مثل دلیل العارفین ملفوظات حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح و مکتوبات قدوسیہ حضرت قطب

[illegible]

العالم علیہ الرحمۃ سے منگوتی ہوں اور قوت القلوب الطالب کی وغیرہ میں یہ مضمون نہایت آپ احکام کے
ساتھ مذکور و منقول ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقر میں اول علم شریعت پھر عمل شریعت کی سخت
ضرورت ہے اور بے دل اس کے کام کے راہ نہیں کھلتی اور کبھی کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی مخالفت کر کے اور طریق بدعت کو اختیار کر کے ولی نہیں ہو سکتا۔ جب بدعت کا یہ
حال ہے تو کفر و شرک کا تو کیا پوچھنا ہے۔ آج کل تو لوگوں نے علم و عمل کے درجے کو رد اختیار
کر سکتے ہیں۔ علم کی نسبت حجاب اکبر اور عمل کی نسبت دعوائے آزادی صاحبو! حجاب اکبر کے
اگر یہ معنی ہوں تو جتنے بزرگوں کے نام لکھے گئے ہیں یہ سب بجائے محجوب ٹھہرتے ہیں۔ یہ ایک
اصطلاحی لفظ ہے۔ حقائق کے قاعدے سے اس کے بہت باریک معنی ہیں۔ مگر موٹے سے
معنی یہ سمجھو کہ حجاب اکبر اس پردے کو کہتے ہیں جو بادشاہ کے قریب پڑا رہتا ہے کہ وہاں
پہنچ کر بادشاہ کا بہت ہی قرب ہو جاتا ہے تو اس میں علم کی مدح ہے۔ یعنی جب علم حاصل
کر لیا تو جتنے حجاب تھے سب اٹھ گئے۔ یہاں تک کہ حجاب اکبر تک پہنچ گیا۔ اب ایک
تجلی سے حیرت کا غلبہ ہو کر یہ حجاب بھی اٹھ جاوے۔ واصل ہو جاوے اور جس نے مرے
کہا سے علم حاصل نہیں کیا خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے وہ تو ابھی بہت پردوں کے پیچھے
ہے اور بہت دور ہے۔

دعوائے آزادی کے معنی باب اصطلاحات میں بیان ہو چکے ہیں کہ قید شہوت و غفلت سے آزاد
ہونا ہے نہ کہ احکام محبوب حقیقی سے۔

گر تو خواہی حری و دل زندگی — بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہر بندگی ست — زندگی بے بندگی شرمندگی ست
جز خضوع و بندگی و اضطرار — اندریں حضرت ندارد اعتبار
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی — کفر باشد پیش او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر — مغز باید تا دہد دانہ شجر

(ترجمہ:- اگر تو آزادی اور زندہ دلی کا خواہاں ہے تو بندگی کر۔ زندگی بندگی کے لیے مقصود ہے
زندگی بغیر بندگی کے شرمندگی ہے۔ عجز و انکساری اور غلامی و بندگی کے سوا اس بارگاہ میں کوئی

پیر معتبر نہیں۔ جو شخص عشق میں زندگی پاتا ہے اس کے آگے جنگل کے سوا سب کفر ہے۔ ذوق ہونا چاہیے تاکہ عبادات مثمر ہوں مغز ہونا چاہیے تاکہ دانہ سے درخت پیدا ہو سکے۔

اور اگر یہ شبہ ہو کہ علم حقیقت اگر علم شریعت کے خلاف نہیں ہے تو پھر اس کو اتنا اسرار کر کیوں پوشیدہ رکھا ہے۔ شریعت تو اظہار کے قابل ہے تو اس کا جواب اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ علم شریعت ہی کو علم حقیقت کہتے ہیں بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ علم حقیقت علم شریعت کے خلاف نہیں ہے یعنی یہ نہیں ہے کہ شریعت نے ایک چیز کو حرام یا کفر کہا ہے حقیقت میں وہ حلال اور ایمان ہو جاوے۔ مثلاً دیوانی کا قانون اور ہے اور فوجداری کا اور، مگر یہ نہیں کہ جو چیز قانون اول میں جائز ہو وہ قانون دوم میں ناجائز ہو یا بالعکس۔ ہاں البتہ ہر ایک کے مضامین میں جداگانہ ضرور ہیں۔ سو یوں تو شریعت میں بھی مضامین مختلف ہیں۔ اور خود حقیقت میں بھی۔ مگر وہ مضامین شریعت کے مضامین کی نفی نہیں کرتے۔ پوشیدہ کرنے سے جو شبہ پیدا ہوا تھا وہ تو رفع ہو گیا۔ اب یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ پوشیدہ رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ تو سمجھنا چاہیے کہ قابل اخفا کے تین امر ہوتے ہیں۔ ایک اسرار۔ سو امام غزالیؒ نے (قواعد العقائد میں) اس کی کئی وجوہات بیان فرمائی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ مضامین خلاف شرع تو نہیں ہوتے مگر دقیق زیادہ ہوتے ہیں جو عوام کے فہم میں نہیں آ سکتے اور ان کو مضر ہوتے ہیں۔ دوسرے تعلیم سلوک کے طریقے۔ اس میں اخفا کی وجہ یہ ہے کہ اعلان میں اس کی بے قدری تھی اور دوسرے طالب کی ہوسناکی کا احتمال ہے۔ تیسرے ثمرات مجاہدہ مکاشفات وغیرہ اس کا اخفاء بوجہ احتمال ریا و دعویٰ کے ہے۔ غرض کسی امر کا اخفا اس وجہ سے نہیں ہے کہ مخالف شرع ہے اور اگر فرضاً ایسا ہو تو وہ قابل رد و انکار کے ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جس کو دولت وصول میسر ہوتی ہے علم شریعت اور اتباع سنت سے ہوتی ہے اور اگر کسی بزرگ کا کوئی قول و فعل خلاف سنت منقول ہے تو وہ یا تو سکر اور غلبۂ حال میں صادر ہوا یا وہ حکایت غلط منقول ہے۔ یا ان سے کسی باریک مسئلے میں جہاں دلیل شرعی خفی و دقیق تھی، خطائے اجتہادی ہوئی جس میں شرعاً معذور ہیں اور خدا تعالیٰ نے ان کو بخش دیا ہوگا۔ یہاں تو

والخروج عن الحق شطحا و — اور دین حق سے نکل جانے کا شطح اور بری
الاستلذاذ بالمذموم طبيعة و — چیزوں سے لذت لینے کا خوگر طبعی، اور
اتباع الهوى ابتلاء والرجوع — خواہش کی پیروی کا اتفاق۔ اور دنیا کیطرف
الى الدنيا وصلا وسوء الخلق — رجوع کرنے کا وصل۔ اور بد خلقی کا رعب اور
صولة والبخل جلادة والسؤال — بخل کا جوانمردی اور سوال کا عمل، اور بد
عملا وبذاءة اللسان ملامة — زبانی اور بیہودہ گوئی کا ملامت اور قوم کا
وما كان هذا طريق القوم۔ — یہ طریقہ نہ تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان رسوم کی نسبت فرماتے ہیں۔

نسبت صوفیہ غنیمت کبریٰ و رسوم ایشاں ہیچ نیارزد۔ — صوفیہ کی نسبت تو بڑی بھاری غنیمت ہے۔ لیکن ان کی رسوم کچھ وزن نہیں رکھتیں۔

پانچویں فصل۔ مخالفتِ شیخ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی میں فرمایا[١]:۔

من عادى لي وليا فقد آذنته بالحرب۔ (الحديث) — جو میرے ولی سے عداوت کرتے ہیں اس سے لڑائی کا اعلان کرتا ہوں۔

شیخ سے عداوت و عقیدت میں فتور ڈالنا، یا اس سے بڑھ کر یہ کہ شیخ کو آزردہ کرنا مخالفتِ شیخ ہے۔

(١) حضرت[٢] ابن منصورؒ حضرت جنیدؒ سے بیعت تھے۔ مگر حضرت جنیدؒ ان سے خوش نہ تھے۔ بلکہ ناراض تھے کیونکہ ابن منصورؒ اسرار کو ظاہر کر دیتے تھے۔ ضبط نہ کرتے تھے۔ وہ اپنے کو عاجز سمجھتے تھے مگر حضرت جنیدؒ جانتے تھے کہ یہ ضبط سے عاجز نہیں۔ اگر ہمت کریں

١ تعلیم الدین [illegible] ٢ [illegible]

تو ضبط کر سکتے نہیں اس میں بہت سے لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے بعض دفعہ وہ اپنے کو عارف سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ فی نفسہ عارف نہیں ہوتے۔ اس کا فیصلہ خود نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ شیخ سے رجوع کر لینا چاہیے۔ اس طریق میں اتباع شیخ کی سخت ضرورت ہے۔ اس لیے وہ ان سے مکدر اور ناراض تھے۔ اور شیخ کی ناراضی و تکدر سے گو آخرت میں مواخذہ نہ ہو کیونکہ وہ کوئی نہیں ہے جس کی ناراضگی سے گناہ ہو مگر تجربہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو دنیا میں کبھی چین نصیب نہیں ہوتا چنانچہ ابن منصور کو بھی کبھی چین نصیب نہیں ہوا عمر بھر پریشان ہی رہے۔ یہاں تک کہ انا الحق کہنے پر کفر کا فتویٰ لگ گیا۔ تو ابن منصور پر حضرت جنید کے تکدر سے وبال آیا۔ گو آخرت میں وہ معتوب نہ ہوں گے کیونکہ اپنے خیال میں وہ معذور تھے۔

(۲) ایک مانع شیخ کی تعلیم سے زائد لوٹ کر مجاہدہ کرنا۔ چند روز تو خوب کیا پھر گھبرا کر چھوڑ دیا قطع کیا جو ابھی مجبوری ہو جاوے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو ایسا اتفاق ہوا۔

قال رسول الله صلى الله عليه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
وسلم خذوا من الاعمال	اعمال میں سے اتنا اختیار کرو جتنا کر سکو
ما تطيقون فان الله لا يمل	کیونکہ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا جب تک تم
حتى تملوا. رواه الشيخان.	نہ اکتاؤ۔

(۳) ایک مانع یہ ہے کہ کسی بے شرع پیر سے بیعت کر لی۔ اب ساری عمر اسی کو بزرگ سمجھتا رہا۔ جب وہ خود واصل نہیں تو اس کو کیسے واصل کرے گا۔ حضرت جنید کا قول ہے۔

صحبة اهل البدعة تورث	بدعتیوں کی صحبت اللہ سے منہ موڑنے
الاعراض عن الحق۔	کا باعث ہے۔

شیخ نظام الدین فرماتے ہیں۔

اے درویش محک و معیار این کار	اے درویش اس کام کی اصل کسوٹی
کتاب و سنت است ، سیر سلف	کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور سیر

---

۱ تعلیم الدین ص [illegible] ۔ ۲ تعلیم الدین ص [illegible] ۔

کہ ازیں اقتدا بیرون رود اجازت مجدد
و مقام متبرک کو خلال زمند درویش
است درومانے آثار اجداد خود نشستہ
و چیزے کہ از شان شیخ مخالف معیار
است آں فاسد و باطل ۔ یعنی اگر
قولی و فعل شیخ مخالف کتاب ۔
سنت و اجماع بود ۔ ہیچ نہ باشد ۔
شیخ لائق شیخی و مقتدائے نبود ۔
مرد برو اقتدا کند بمقصود نہ رسد ۔

سلف ہی جو چھوڑ کے دین میں ذکر محض
اجازت ہے ۔ وہ متبرک مقام کو خلال درویش کا
صاحبزادہ ہے ۔ اپنے آباؤ اجداد کی جگہ پر بیٹھا
ہوا ہے اور جو چیز شیخ سے معیار کی خلاف
ہو وہ فاسد ہے یعنی اگر شیخ کا کوئی قول فعل
کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف ہو تو وہ
قول و فعل مردود اور وہ شیخ و مقتدا ۔
ہونے کے قابل نہیں جو شخص اس کی اقتدا
کرے گا مقصود تک نہ پہنچے گا ۔

بلکہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کامل سے بیعت کرے ۔ شیخ سعد الدینؒ فرماتے ہیں ۔

اگر از نادانی خود بجاہل یا بدعتی بیعت
ارادت آورد تجدید ارادت کند
از دست او خرقہ ارشد تا گمراہ نشود ۔

اگر اپنی نادانی سے کسی جاہل یا بدعتی
سے مرید ہو جائے تو تجدید بیعت
کرے اور اس سے الگ ہو جائے تاکہ
گمراہ نہ ہو جائے ۔

اور یہ جو مشہور ہے کہ "شیخ من خس است و اعتقاد من بس است" ۔ سو اول تو ایسے جاہل
فاسق آدمی سے اعتقاد باقی رہنا مشکل ہے ۔ دوسرے یہ قاعدہ کلیہ نہیں ۔ شاذ و نادر ایسا بھی ہو گیا
ہے جو شخص اس فن سے ذرا بھی واقف ہے جانتا ہے کہ حصول مطلب کا طریقہ شیخ کامل کی
صحبت و تعلیم ہے ۔ درویش اور شیخ کامل وہی ہے جو جامع ہو ظاہر و باطن کا ۔ تیسرے یہ کہ اس
سے شرعی پیر مراد نہیں ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر بہت بڑے درجے کا کامل نہ ہو اور شریعت کے خلاف
بھی نہ ہو تو یوں سمجھے کہ اگرچہ ان سے بڑھ کر اور کامل ہوں مگر میرے لیے یہی کافی ہیں اور میرا اعتقاد
مجھے مقصود تک پہنچا دے گا ۔

۱۰۔ علوم و مسائل

ضرورتِ علم

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ	(اللہ تعالیٰ بلند کرتا ہے ان لوگوں کے (جنت) جو تم میں سے ایمان لائے اور ان کے جو علم دیئے گئے (بلحاظ) درجات (ان پر جو ایمان لائے اور عالم نہیں ہیں)

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ	(اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کیا برابر ہیں جو علم نہیں رکھتے اور وہ جو علم رکھتے ہیں۔

(ان ہردو آیات کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ علم کا رتبہ غیر اہلِ علم سے بڑا ہے اور صحیح حدیث میں ہے جس کو جامع صغیر نے روایت کیا ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ ۔	علم کو طلب کرنا فرض ہے ہر مسلمان پر (خواہ وہ مرد ہو یا عورت)

جاننا چاہیے کہ فرض کا چھوڑنا گناہ کبیرہ ہے اور جس کام کا کرنا بندہ پر فرض ہے اس کام کے کرنے کا طریقہ سیکھنا بھی اس کے ذمہ فرض ہے اور جس کام کا کرنا مستحب ہے اس کا طریقہ سیکھنا بھی مستحب ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے اور میں (علم کا) بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے (بخاری و مسلم) (یہ بخاری شریف کی حدیث ہیں ہے۔

ماخذ: بہشتی زیور حصہ ۱۲ ص ۲۰۲ تا

علم نبود غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی

علم چوں بر دل زنی یارے بود علم چوں بر تن زنی مارے بود

(یعنی علم وہ ہے جو تیری رہنمائی کر سکے اور دل سے گمراہی کا زنگ دور کر سکے، خواہشات نفسانی دمائم سے نکال باہر کرے، دل میں خوف و خشیت کا اضافہ کرے۔ علم فی الحقیقت علم عشق ہے اور اس کے ماسوا بدبخت شیطان کے مکر و فریب ہیں۔ علم جب دل میں پیوست ہوگا دوست ہوگا اور مفید ہوگا اور جب صرف بدن اور ظاہری جوارح یا اعضاء تک محدود رہے گا تو وہ مانند سانپ کے ہوگا یعنی سراسر مضر اور نقصان دہ ہوگا)

(جاننا چاہیئے کہ علوم کی دو قسمیں ہیں) عقلیہ و وہبیہ (عقلیہ وہ ہیں جو عقل سلیم سے سمجھ میں آئیں۔ اور وہبیہ وہ ہیں جو محض اللہ کی عنایت سے حاصل ہوں) جو علم یقیناً کسی قاعدہ شرعیہ کے مخالف ہوں، وہ تو یقیناً باطل ہے اور جو علوم حقہ ہیں ان کی دونوں قسموں میں دو دو قسمیں ہیں۔ علم عقلی کی دو قسمیں ہیں۔ قطعی و ظنی۔ اور علوم وہبی کی بھی دو قسمیں ہیں قطعی یعنی وحی اور ظنی یعنی الہام۔ پس وہبی قطعی (یعنی وحی) عقلی قطعی سے افضل ہے اور وہبی ظنی عقلی ظنی سے افضل ہے۔ خود صاحب علم کے لیے بھی اور اس کے متبعین کے لیے بھی۔ پس علوم منقولہ شرعیہ دیگر علوم سے افضل ٹھہرے اور عقلی قطعی، وہبی ظنی سے افضل ہے۔ کیونکہ عقل قطعی جس قدر اثبات حق میں قوی ہے وہبی ظنی نہیں ہے۔

ہر علم و عمل جب کہ اس کو شریعت کے ساتھ موازنہ کیا جائے تین قسم سے خالی نہیں۔ ایک قسم یہ کہ شریعت اس کا اثبات کرے۔ دوسری قسم یہ کہ شریعت اس کی نفی کرے۔ تیسرے یہ کہ شریعت اس کے اثبات و نفی سے ساکت ہو۔ اول کو مدلول شرعی کہیں گے۔ دوسرے کو مردود شرعی۔ تیسرے کو نہ مدلول شرعی نہ مردود شرعی بلکہ نظر بقاعدہ کلیہ، مرویہ عن ابن عباس قال الحلال ما احل اللہ فی کتابہ (ای شریعۃ) والحرام ما حرم اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فہو عفو۔ رواہ ابن ماجہ والترمذی (یعنی جس کو اللہ نے اپنی کتاب (یعنی اپنی شریعت) میں حلال

لہ الکشف ص ۹۳، ۲۲۴

کوئی ایسا امر ظاہر ہو جو ظاہر شریعت کی رو سے موجب حد ہو اور وہ امر حاکم کے نزدیک بھی ثابت ہو جائے تو اس پر حد کی جائے گی۔

۲۔ آدمی[۱] خدا کا کیسا ہی پیارا ہو جائے مگر جب تک ہوش و حواس درست ہیں شریعت کا پابند رہنا فرض ہے۔ نماز، روزہ اور کوئی عبادت معاف نہیں ہوتی اور جو گناہ کی باتیں ہیں وہ اس کے لئے درست نہیں ہو جاتیں۔

۳۔ اللہ اور رسول نے دین کی باتیں قرآن و حدیث میں بندوں کو بتلا دیں اب کوئی نئی بات نکالنا دین میں درست نہیں۔ ایسی نئی بات کو بدعت کہتے ہیں۔ بدعت بہت بڑا گناہ ہے۔ البتہ بعض باریک باتیں دین کی جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگلے عالموں نے اپنے علم کے زور سے قرآن و حدیث سے سمجھ کر دوسروں کو بھی بتلا دیں۔ ایسے لوگ مجتہد کہلاتے ہیں۔ مجتہد تو بہت ہوئے مگر چار ان میں بہت مشہور ہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ۔ جس کو جس مجتہد سے زیادہ اعتقاد ہوا اس کی پیروی اختیار کر لی۔ ہندوستان (و پاکستان) میں امام ابوحنیفہؒ کی پیروی کرنے والے زیادہ ہیں۔ وہ حنفی کہلاتے ہیں۔ اسی طرح نفس کے سنوارنے کے طریقے قرآن و حدیث کے موافق ولی لوگوں نے اپنے دل کی روشنی سے سمجھ کر بتلائے۔ ایسے لوگ شیخ کہلاتے ہیں۔ شیخ بہت ہوئے مگر ان میں چار زیادہ مشہور ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ۔ جس مجتہد اور شیخ سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کرے، دوسروں کو برا سمجھنا درست نہیں۔ اور مجتہد اور شیخ کی پیروی اسی وقت تک ہے جب تک ان کی بات خدا اور رسولؐ کے خلاف نہ ہو۔

۴۔ مقصود[۲] سلوک کا رضائے حق ہے اور اس کے بعد دو چیزیں ہیں۔ طریق کا علم اور اس پر عمل۔ سو طریق شریعت ایک ہی ہے یعنی احکام ظاہرہ و باطنہ کی پابندی۔ البتہ اس طریق کی معین دو چیزیں ہیں۔ ایک ذکر جس پر دوام ہو سکے۔ دوسرے صحبت اہل اللہ کی جس کثرت مقدور ہو

۱۔ تعلیم الدین صفحہ ۱۰۲ ۔ ۲۔ کمالات اشرفیہ صفحہ ۱۶۲

اور اگر کثرت کے لیے فراغت نہ ہو تو بزرگوں کے حالات و مقالات کا مطالعہ اس کا بدل ہے اور دو چیزیں اس طریق یا مقصود کی مانع ہیں۔ معاصی اور فضولیات میں مشغول۔ اور ایک لحاظ سے نافع ہونے کی شرط ہے۔ یعنی اطلاع حالات کا التزام۔ اب اس کے بعد اپنی استعداد ہے۔ حسب اختلاف استعداد مقصود میں دیر سویر ہوتی ہے۔ یہ سارے طریق کا خلاصہ ہے۔

۵۔ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا یہی راستہ ہے کہ اخلاق رذیلہ جاتے رہیں حمیدہ پیدا ہو جائیں معاصی چھوٹ جائیں۔ طاعت کی توفیق ہو جائے غفلت کم ہو جاتی ہے اور توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔

۶۔ جن مسائل کا تعلق اصلاح نفس سے ہے کسی تصوف کی کتاب میں دیکھ کر ان پر عمل کرنا اس شرط سے درست ہے کہ فہم میں یا مصداق تشخیص میں غلطی نہ ہو لیکن ان غلطیوں کا احتمال عادۃً غالب ہے۔ اس لیے بدون کسی شیخ بصیر کے مشورہ کے خود عمل مناسب نہیں۔

۷۔ عبادات میں بجز رضائے خدا کے اور ثمرات کا طلب کرنا اخلاص کے بالکل خلاف ہے۔

۸۔ محققین نے تصریح کی ہے کہ اخلاص سب اخلاق حمیدہ کے بعد میسر ہوتا ہے اور ریا سب اخلاق ذمیمہ کے بعد جاتا ہے۔

ریا ہمیشہ نہیں رہا کرتا۔ کیونکہ ریا کرتے کرتے پھر اس کام کی عادت پڑ جاتی ہے اور جس کی عادت ہو جاتی ہے اس میں پھر کوئی خیال نہیں آیا کرتا۔ پھر وہ اخلاص کے قریب ہو جاتا ہے۔

مخلوق کا دل خوش کرنے کیلئے اگر کوئی طاعت یا خدمت اچھی طرح کی جائے تو کوئی حرج

۱؎ کمالات اشرفیہ صفحہ [illegible] ۲؎ دعوات عبدیت صفحہ [illegible] ج ۱ ۳؎ اشرف المسائل صفحہ [illegible]
۴؎ التکشف صفحہ [illegible]

٢٤:۔ مبہم بات (جس سے مقصود سمجھ میں نہ آئے) سنت کے خلاف ہے۔ صاف کلام کرنا سنت ہے ایسا کلام کہ مقصود پر دلالتِ مطابقی رکھتا ہو۔

٢٥:۔ حق[١] تعالیٰ کا قرب و معیت اصل میں بے کیف ہے۔ نہ اس کو قربِ ذاتی کہہ سکتے ہیں قربِ مکانی۔ بعض متکلمین اس کو قربِ صفاتی کہتے ہیں یعنی قربِ علمی۔ لیکن سلف کا مسلک یہی ہے کہ صفاتِ الٰہیہ میں تعیین نہیں کرتے بلکہ ابہموا ما ابہمہ اللہ تعالیٰ۔ (جس کو اللہ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اسے مبہم رکھو) پر عمل کرتے ہیں اور بعض اکابر کے کلام میں جو اس قرب کی تعبیر بعنوان سر بمہ التنقید آئی ہے۔ تو مقصود تحقیق نہیں بلکہ مقصود تشبیہ بغرض تفہیم ہے۔

٢٦:۔ کیفیات[٢] کا مدار یکسوئی پر ہے اور یکسوئی کم عقلوں کو زیادہ ہو جاتی ہے۔ عاقلوں کو خاص کر صاحب ذکاوت مفرطہ کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ان کا دماغ ہر وقت حرکت فکریہ میں رہتا ہے۔

٢٧:۔ اہلِ حق[٣] کے تصرفات اتنے قوی نہیں ہوتے جتنے اہلِ باطل کے تصرفات قوی ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تصرفات کے اثر کی قوت کا دارومدار قوتِ خیالیہ پر ہے اور خیال میں قوت یکسوئی سے ہوتی ہے اور اہلِ حق کو اس خیال میں جو غیر ذاتِ حق کے متعلق ہو۔ زیادہ یکسوئی نہیں ہوتی۔

٢٨:۔ ولی[٤] کی بات بتا دینا، یہ علمِ غیب نہیں بلکہ کشف ہے۔ علمِ غیب اس علم کو کہتے ہیں جو بلا واسطہ ہو اور یہ خاصہ خداوندی ہے اور جو علم بذریعہ کشف ہو اس میں کشف واسطہ ہے اس لیے وہ علمِ غیب نہیں۔

٢٩:۔ فتوحاتِ مکیہ میں ہے کہ ابو یزید بسطامی سے طی ارض کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا کہ یہ کچھ نہیں ہے یعنی مقبولیت کی دلیل نہیں ہے کیونکہ ابلیس مشرق سے مغرب تک ایک دم میں قطع کر جاتا ہے اور اللہ کے نزدیک اس کا کچھ بھی مرتبہ نہیں اور ہوا پر اڑنے کو پوچھا گیا

---

١ التکشف صـ٣٧١ ٢ اشرف السائل صـ٨ ٣ القول الجلیل صـ٦ جلد دوم
٤ التکشف صـ١١٥

تو فرمایا کہ چڑیاں ہوا پر اڑا کرتی ہیں۔ اور جب مومن ان سے افضل ہے تو ایسی چیز کرامت کیسے شمار کی جا سکتی ہے جس میں چڑیاں شریک ہوں اور فرمایا کہ اگر تم ایسا آدمی دیکھو کہ بہت کرامتیں دیا گیا ہو یہاں تک کہ ہوا میں اڑتا ہے تو تم دھوکے میں نہ آ جاؤ۔ اس کے معتقد نہ ہو جب تک اس کو نہ دیکھ لو کہ امر و نہی اور حفظ حدود اور پابندی شریعت میں کیسا ہے۔

۳۰۔ سُکر اور غلبے میں صوفی کے منہ سے کچھ نکل جائے تو اس پر اعتراض نہ کرو اور نہ ہی اس کی تقلید کرو طریق اسلم سکوت ہے باقی وہ بات ضرور قابل اعتراض ہے خصوصاً جبکہ عوام کو مضر ہو اس وقت اس کی غلطی ظاہر کر دینا واجب ہے۔ (تحفۃ)

۳۱۔ الاستقامۃ فوق الکرامۃ (استقامت یعنی اعمال شرعیہ کی پابندی کرامت سے بڑھ کر ہے۔)

باب دوم۔ اصلاحات

۱۔ آج کل زمانے میں نماز و قرآن کی حد سے زیادہ بے قدری ہو رہی ہے۔ عوام کیا خواص بھی بہت ہی کم ہیں جو ٹھیک طور پر نماز کے خصوصاً جماعت کے پابند ہوں بلکہ بہت سے فقیروں کا تو یہ گمان ہے کہ باطنی نماز کافی ہے۔ ظاہری نماز کی کیا ضرورت ہے تو یہ صاف فرضیت نماز کا انکار کرنا ہے جس سے یقیناً ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔ پھر جو ان میں پڑھے ہوئے ہیں وہ قرآن مجید کی آیتوں کی تحریف کرتے ہیں جیسے الذین ھم فی صلاتھم دائمون (وہ لوگ کہ اپنی نماز پر مداومت کرتے ہیں) سے استدلال ہے کہ دیکھئے صاحب صلوٰۃ ظاہری تو دائم ہو نہیں سکتی۔ پس صلوٰۃ باطنی مراد ہے کہیں ولذکر اللہ اکبر سے تمسک ہے کہ گو نماز بھی اچھی چیز ہے مگر ذکر اللہ کا مرتبہ بھی اکبر ہے۔ سو اکبر کے ہوتے ہوئے اصغر کی کیا حاجت ہے۔ صاحبو! یہ صریح الحاد ہے۔ ایک موٹی بات تو یہی ہے کہ تمہارے پیشوا

۱۔ تعلیم الدین صفحہ ۹۵ پرچہ ۵ صفحہ ۱۱۲ ۲۔ طریق القلندر صفحہ

۳۔ حلیۃ الدین صفحہ ۹۹، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۳۴، ۱۰۰

پیروں نے اور سب پیروں کے پیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں نہیں سمجھا کیوں ایسے
نہیں کیا۔ تمام عمر اپنے نفل کے پابند رہے۔ دوسرے تمام قرآن و حدیث عموم فرضیت سے بھرا
پڑا ہے۔ اس میں نہ کسی آدمی کی تخصیص ہے نہ کسی حالت کا استثنا۔ پھر ان لوگوں کے جو
قاعدے تراشے ہیں سب مردود باطل ہیں۔ رہا استدلال آیاتِ مذکورہ سے، وہ محض تحریف ہے۔ اول تو یہ
کہنا کہ صلوٰۃ ظاہری دائمہ نہیں ہو سکتی غیر مسلم ہے۔ ہر چیز کا دوام اس کے مناسب ہوتا ہے
مثلاً اگر کہا جاوے کہ فلاں شخص ہمارے پاس ہمیشہ آتا ہے تو کیا ضرور ہے کہ وہ ہر وقت آنے ہی
میں مشغول رہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو وقت اس کے آنے کا متعین ہے اس میں بلا ناغہ
آتا ہے۔ اسی طرح نماز ظاہری کا دوام سمجھو کہ اپنے معین اوقات میں ناغہ نہ ہو یہی دوام ہے
دوسرے اگر تسلیم کیا جائے کہ نماز باطنی ہی مراد ہے تو چلو یہ بھی فرض سہی مگر اس سے نماز ظاہری
کا فضول ہونا کس طرح معلوم ہوا۔ نماز باطنی اس آیت سے فرض، نماز ظاہری دوسری آیت
سے فرض۔ دونوں ادا کیا کرو۔ اور یہ کہنا کہ ذکر اللہ نماز سے بھی بڑھ کر ہے تو اکبر کے سامنے اصغر
کی کیا حاجت۔ یہ بھی محض جہل تقریر ہے۔ اول تو ولذکر اللہ اکبر کی یہ تفسیر متعین
نہیں بلکہ ممکن ہے کہ نماز کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہو کہ نماز میں فلاں فلاں برکت ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر اللہ یعنی اللہ کی یاد ہے اور اللہ کی یاد بڑی چیز ہے اس لیے نماز
میں یہ برکت ہوتی۔ سو اس تقریر پر تو اس میں نماز کی ترغیب ہے نہ کہ تنقیص۔ اور اگر وہی
تفسیر مان لی جاوے تو یہ کیا ضرور ہے کہ اکبر کے ہوتے اصغر کی حاجت نہ ہو خصوصاً گر دونوں
فرض ہوں تو کیوں نہیں حاجت ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کے دو بیٹے ہیں ایک بڑا، ایک چھوٹا، تو بس
اسی قاعدے سے کہ اکبر کے ہوتے اصغر کی کیا حاجت ہے چھوٹے بیٹے کا گلا گھونٹ کر کام تمام کر
ڈالنا چاہیے۔ اللہ فہم سلیم عطا فرماویں۔

قرآن و حدیث کے ظاہری معنی کا انکار کرنا کفر ہے۔ البتہ ظاہر کو تسلیم کرنا اور اس کے باطن
کی طرف عبور کرنا محققین کا مسلک ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے
نہیں جاتے۔ اہل ظاہر نے تو کتا پالنے کو برا سمجھا، مگر دل میں صفات کلبیہ کو ہمیشہ جمع رکھا۔ ان

۱؎ تفسیر [illegible] ص ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۱، ۱۲۲۔

میں تو یہ کسر رہ گئی مگر ایمان موجود ہے جس سے مرید کو جنت تو مل جائے گی۔ منکرین ظاہر نے کتا پالنے کی اجازت دے دی اور کہا کہ مولوی لوگ حدیث کا مطلب نہیں سمجھے۔ حدیث میں کتے سے مراد غضب ہے اور ملائکہ سے مراد قوائے خبیثہ اور کلب سے مراد صفات سبعیہ وغیرہ۔ یہ لوگ شریعت کا انکار کر کے کافر اور مستحق جہنم ہوئے۔ محققین نے کہا کہ مطلب تو حدیث کا وہی ہے جو اہل ظاہر سمجھے۔ مگر اس میں غور کرنا چاہیئے کہ کتا گھر کے لئے کیوں نفرت ہے؟ صرف اس کے صفات ذمیمہ سبعیہ نجاست و حرص و غضب وغیرہ کی وجہ سے تو معلوم ہوا کہ یہ صفات مذموم ہیں۔ پھر جب ظاہری گھر میں کتا رکھنا جائز نہیں تو باطنی گھر میں ان صفات کا رکھنا کیسے جائز ہوگا۔ ان محققین نے ظاہراً کتا پالنے کو بھی حرام کہا۔ کیونکہ وہ مدلول مطابقی ہے اور باطناً ان صفات مذمومہ کے ساتھ متصف ہونے کو بھی حرام کہا کیونکہ وہ مدلول التزامی ہے۔

۲۔ احادیث کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاطی ہوتی ہے۔ حدیث کی تحقیق علمِ حدیث سے کرنی چاہیئے۔ یہ کسی طرح درست نہیں کہ کسی اردو فارسی کی کتاب یا کسی عربی کی غیر معتبر کتاب میں حدیث کا نام دیکھ لیا اور اس سے استدلال شروع کر دیا۔ بہت سی عجیب و غریب حدیثیں جن کا کہیں پتہ نہیں مشہور ہیں۔ جیسے انا عرب بلا عین اور مثل اس کے جن کے نہ الفاظ کا پتہ نہ معانی کا نشان۔ حدیث شریف میں اس بارے میں سخت وعید آئی ہے۔

من کذب علی متعمدا فلیتبوأ	جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ
مقعدہ من النار	باندھا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ بنا لے۔

اسی قبیل سے یہ دعویٰ کرنا کہ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کئی ہزار کلمات تصوف کے جو شب معراج میں آپ لائے تھے۔ سب علیحدہ تلقین فرمائے اور کوئی اس قابل نہ تھا۔ اس دعوے میں کتنے جھوٹ جمع ہو گئے ہیں۔ اول یہ کہ کئی ہزار کلمات تصوف کے معراج میں عطا ہوئے۔ مدعی کو اس کی اطلاع کس طرح ہوئی۔ وہاں تو اس قدر ابہام ہے کہ فرشتے تک کو اطلاع نہیں ہوئی۔ کہاں کہیں سے سنے تھے۔ وجود نے مقدم کا فلاں کو معلوم

سبحات وجهه ما انتهى اليه	اس کے انوار ذاتیہ حد نگاہ تک خلقت کو
بصره من خلقه، رواه مسلم	جلادیں۔ یعنی تمام خلقت کو

اب قرآن و حدیث کے بعد اور کونسی چیز ہے جس پر یقین آئے۔

قال الله تعالى فباي حديث	اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ پس کس بات پر اس کے بعد
بعده يؤمنون	ایمان لاویں گے۔

۶۔ بعض کا اعتقاد ہے کہ فقیری میں کوئی ایسا درجہ ہے کہ وہاں پہنچ کر احکام شرعی ساقط اور معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ اعتقاد صریح کفر ہے جب تک ہوش و حواس قائم ہیں ہرگز احکام شرعی معاف نہیں ہو سکتے۔ البتہ جنون میں معذور رکھا ہے۔ حضرت ابراہیم بن شیبان فرماتے ہیں۔

علم الفناء والبقاء يدور على	فنا و بقاء کا علم وحدانیت کے اخلاص
اخلاص الوحدانية وصحة	اور عبودیت و عبادت کی درستی پر منحصر
العبودية وما كان غير هذا	ہے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ اغلاط
فهو من المغاليط والزندقة	اور بددینی ہے۔

بعض جہلاء ایک عجیب دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ ہماری نسبت ایسی قوی ہے کہ گناہ سے بھی اس میں فتور نہیں آتا اور بعضے کہتے ہیں کہ ہم کو لونڈوں، رنڈیوں کے گھورنے سے ترقی ہوتی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نسبت جس کو معصیت سے ترقی ہو شیطانی نسبت ہے اور ایسی ترقی کو مکر و استدراج کہتے ہیں۔

شارح گلشن راز فرماتے ہیں کہ بعض اہل کمال کی تقلید سے بدون غلبۂ حال کے خلاف شریعت کلمات منہ سے نکال کر کافر مت ہو۔

ترا گر نیست احوال مواجید	مشو کافر بنادانی بہ تقلید

(یعنی اگر وجد کی حالت تجھ میں نہیں ہے تو جہالت سے تقلید کر کے کافر مت ہو۔)

۷۔ جس طرح اولیاء کے آداب میں تقصیر ممنوع ہے۔ اسی طرح افراط و غلو بھی بدتر ہے کہ اس میں اللہ اور رسول کی شان میں تفریط ہوتی ہے۔ مثلاً عالم الغیب سمجھنا اس سے کفر

سیدخلون جہنم داخرین — ہوکر داخل ہوں گے اور فرمایا جن کو تم
وقال و الذین تدعون من — پکارتے ہو اللہ کے سوائے وہ تمھارے
دون اللہ عباد امثالکم۔ — مثل بندے ہیں۔

مشائخ کی تعظیم و طاعت میں ایسا غلو کرنا کہ وہ خلاف شرع بات کا حکم کریں جب بھی ان کی طاعت کیا کرے یہ بھی ارشاد کے حق میں داخل ہے جو ایک مرض ہے۔

۸:۔ اگر شیخ کی مجلس میں کبھی نیند ہونے لگے تو فوراً اٹھ جاوے۔ جیسے بارش عمدہ چیز ہے۔ اس میں نہانا مفید بھی ہے۔ مگر اگر اولے پڑنے لگیں تو بھاگنا ہی چاہیے۔

۹:۔ فاسق و کافر صاحب نسبت نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ غلطی سے نسبت کے معنی خاص کیفیات کو (جو ریاضت و مجاہدہ کا ثمرہ ہوتا ہے) سمجھتے ہیں۔ یہ کیفیت ہر مرتاض میں ہو سکتی ہے مگر یہ اصطلاح باطل ہی ہے۔

۱۰:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو یہ جائز نہیں کہ وہ (میری نسبت) یوں کہے کہ میں حضرت یونس بن متی سے اچھا ہوں۔ حضرت یونس علیہ السلام کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ ان کے قصہ میں ظاہراً شبہ ترجیح کا ہوتا ہے جس سے مفضولیت کا حکم کیا جاتا ہے اور اس بنا پر مفضولیت کا حکم کرنا ظاہر ہے کہ موجب یا موہم تحقیر کو ہے۔ اس لیے منع فرمایا گیا ہے پس حدیث میں اس پر صاف دلالت ہے کہ بعض لوگوں کو جو عادت ہے کہ اپنے سلسلہ کو یا شیخ کو اس طرح بڑھاتے ہیں کہ دوسروں کی تنقیص لازم آتی ہے یا بخت اس کی تصریح کر دیتے ہیں۔ یہ عادت واجب الاصلاح ہے۔ ہاں نفس اعتقاد فضیلت جائز ہے مگر غیر منصوص میں ظن کی اجازت ہے۔ یقین جائز نہیں۔ اور اگر صرف محبت طبعی کا میلان قلب ایک طرف زائد ہے۔ تو وجہ اس کے امر طبعی ہونے کے خود دائرہ تکلیف سے خارج ہے اور موجب ملامت نہیں۔

۱۱:۔ اگر کوئی شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے قصہ سے استدلال کرے کہ انھوں نے باوجود حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے کے کہ دعا کرو دعا

۱ے انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۴ تا ۱۰۲ ۲ے ایضاً صفحہ ۲۹۶ ۳ے دعوات عبدیت صفحہ ۳۲۶ ج ۱

نہیں کی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کرنا، رضا بالقضا اور تفویض و تسلیم کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قصہ پہلی امت کا ہے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا نہیں جو ہم پر حجت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ صاحب وحی تھے، ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس وقت دعا کرنا خلاف منشا ہے۔ اس وقت غلبہ حال میں تفویض اور تسلیم کی فضیلت منکشف تھی اور دعا کی فضیلت مستور۔ خود ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر وقت تفویض و تسلیم اور رضا کو جمع فرمایا۔ اور اکثر بزرگوں سے غلبہ حال میں اس قسم کی باتیں واقع ہیں کہ جن کی تقلید درست نہیں نہ ان کی باتوں سے استدلال کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر انکار درست ہے، وہ معذور ہیں۔[1]

۱۲۔ ایک غلطی یہ ہے کہ زبان اور پیٹ کی احتیاط نہیں کرتے۔ بعض کی زبان سے جو کلمہ چلتے ہیں بے باک ہو کر نکال دیتے ہیں۔ خواہ اس سے کفر ہو جائے یا حق تعالیٰ کی جناب میں بے ادبی اور گستاخی ہو جائے۔ خصوصاً وحدۃ الوجود کے دعویٰ میں تو زبان کو لگام ہی نہیں۔ کہیں خود کو معبود بنا دیا۔ کہیں بندے کو خدا ٹھہرا دیا۔ اس سلوک کو ہوا بھی نہیں لگی۔ زبان تو خیر، پیٹ سے بے احتیاطی یہ ہے کہ حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ سود خوار، زانیہ بازاری، جو کوئی بھی ہو سب کی دعوت و نذرانہ قبول کر لیتے ہیں۔ بزرگوں نے صاف فرمایا ہے کہ بدون اکل حلال، انوار الٰہی نصیب نہیں ہوتے۔

۱۳۔ ذکر میں بعض جہر تو نصوص کثیرہ سے ثابت ہے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں۔ البتہ کلام جہر مفرط میں ہے۔ سو بعضے غالی اس کو قربت مقصودہ سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ نفع ذکر کا اسی پر موقوف ہے اور اسی وجہ سے ان کو کسی کی راحت و ایذا کی بھی پروا نہیں ہوتی اور بعض متشدد اس کو مذموم و بدعت سمجھتے ہیں۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ نہ قربت مقصود ہے نہ بدعت بلکہ اس کے قربت ہونے کا اعتقاد نہ کرے بلکہ اس کو معالجہ سمجھے۔ کیونکہ اس میں تجربے سے یہ خاصیت دیکھی گئی ہے کہ قلب میں رقت اور خاطر میں جمعیت حاصل ہوتی ہے۔ پس اس بنا پر جائز

---

[1] تعلیم الدین صفحہ ۴۲ [2] التکشف صفحہ ۳۶۱

باب سوم — تعلیمات

(۱) علمِ شریعت کو لازم پکڑو۔ کیونکہ شریعت ہی تمہاری وہ کشتی ہے کہ اگر اس میں رخنہ پڑ جائے تو تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے اور جتنے بھی اس میں سوار ہیں وہ سب ہلاک ہوں گے۔[۱]

(۲) اللہ تعالیٰ[۲] کے محبوب اور محب بننا چاہو تو اعمال میں ہمت کر کے شریعت کے پابند رہو۔

(۳) کمال مقصود یہ ہے کہ مقتضیات بشریہ سب بدستور کامل موجود ہوں پھر مستعمل ہو کر شریعت سے تجاوز نہ ہو۔

(۴) جاہ کی حرص کے (خلاف شریعت) مقتضیات پر عمل مت کرو تب تم کو عروج روحانی ہوگا۔

(۵) جب کبھی کوئی منصوبہ پیدا ہو جائے۔ اس کو فوراً نوٹ کر لیا کرو اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرو اور ایک ہفتہ تک دیکھو کہ وہ زائل ہوا یا نہیں۔ اگر زائل نہ ہو تو وسوسہ کا اور دھیان نہ دو۔ بلکہ مصلح کو اطلاع کر دو۔

(۶) اگر کوئی شخص[۳] ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو اسے چاہیے کہ دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے نہ کہ شیخ۔ لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو۔ ممکن ہے کہ وہ کامل مکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا۔ اسی طرح اگر شیخ کا انتقال قبل حصول مقصود کے ہو جاوے یا ملاقات کی امید نہ ہو تب بھی دوسری جگہ تلاش کرے اور یہ خیال نہ کرے کہ قبر سے فیض لینا کافی ہے دوسرے شیخ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ قبر

۱۔ سوانح و سلوک صفحہ [illegible] ۔ ۲۔ کمالات اشرفیہ صفحہ ۲۰، ۴۲، ۱۵ ۔ ۳۔ کمالات اشرفیہ صفحہ [illegible]

۴۔ [illegible] طریق صفحہ [illegible]

سے فیضِ تعلیم نہیں ہو سکتا۔ البتہ صاحبِ نسبت کو احوال کی ترقی ہوتی ہے سو یہ شخص تو ابھی محتاجِ تعلیم ہے دوسرے کسی کو بھی بیعت کی ضرورت نہ تھی اوکھوں تجربوں کا ملین بجز انبیاء کی موجود ہیں۔ اور جا ضرورت محض ہو سکتی ہے کہ کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے۔ اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے اور شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے اور نسبت قطع ہونیکا اندیشہ ہوتا ہے اور ہرجائی مشہور ہو جاتا ہے۔

(۷):۔ مشہور ہے کہ اپنے پیر کو سب سے افضل سمجھے بظاہر اس میں اشکال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وفوق کل ذی علم علیم[1] اتنا سمجھے کہ میری تلاش سے زندہ لوگوں میں اس سے زیادہ نفع پہنچانے والا شخص مجھ کو نہیں مل سکتا۔

(۸):۔ شیخ سے اگر کوئی فعل قابلِ اعتراض سرزد ہو جائے تو اعتراض نہ کرے۔ یا تو تاویل کرے۔ یا یوں سمجھ لے کہ اولیاء معصوم نہیں ہوتے ہیں اور توبہ سے سب معاف ہو جاتا ہے مگر ذکر شیخ کیلئے ہے جو شرع کا پابند صاحبِ استقامت ہو اور اتفاقی اس سے کوئی فعل ہو جائے اور اگر اس نے فسق و فجور کو عادت بنا رکھا ہو وہ ولی نہیں۔ اس کے قول و فعل کی تاویل کچھ ضرور نہیں اس سے علیحدگی اختیار کرے۔[2]

(۹):۔ ابوبکر وراق کا قول ہے کہ صالحین کی مجالست دوجا درست غنیمت ہے اگرچہ مجانست بھی نہ ہو۔ دیکھئے حق تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے ساتھ ان کے کتے کا کس طرح ذکر فرمایا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کے ساتھ تھا۔

(۱۰):۔ جس شخص کے اندر یہ تین باتیں ہوں اس کی صحبت کو غنیمت سمجھو۔ ایک یہ کہ فقیر ہو۔ دوسرے محدث ہو۔ تیسرے صوفی ہو۔[3]

(۱۱):۔ شیخ کے ماسوا دوسرے شیخ کی خدمت میں دو شرطوں سے جا سکتا ہے ایک تو یہ کہ اس کا مذاق اپنے شیخ کے خلاف نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سے تعلیم و تربیت میں سوال نہ کرے۔

---

[1] مسائل السلوک صفحہ ج ۲ [2] کمالاتِ اشرفیہ [3] انفاسِ عیسیٰ صفحہ ۱۹

اور امر اختیاری کا ہر شخص اہل ہے۔

(۲۵): اختیاری امور میں کوتاہی کا علاج بجز ہمت اور استعمال اختیار کے کچھ نہیں اس پر تمام اصلاحات کا مدار ہے اور یہی تمام کوتاہیوں کا اصل علاج ہے۔ بے ہمت سے اعمال شرعیہ اختیاریہ کا ہیں۔ یہ نصوص کی تکذیب لازم آتی ہے۔ پس جب اختیار کو استعمال کرے گا تو کامیابی لازم ہے۔ البتہ اول اول دشواری اور کلفت ضرور ہوگی۔ لیکن اس کا بھی علاج یہی ہے کہ باوجود کلفت کے ہمت سے اور اختیار سے برابر بہ تکلف اور بہ تکلیف کام لیتا رہے۔ رفتہ رفتہ وہ کلفت مبدل بسہولت ہو جائے گی۔ ہمارے بزرگ یہ بات کہتے آئے ہیں کہ ہمت دوام اور اجتناب گناہ میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اور اول اول تو سخت مشکل ہوتا ہے مگر کرتے کرتے مشق ہو جاتی ہے اور پھر نہایت سہولت سے صادر ہونے لگتا ہے۔ جیسے حفظ کا سبق شروع میں دشوار ہوتا ہے مگر رٹتے رٹتے یاد ہو جاتا ہے۔ اگر شروع کی کلفت اور تعب کو دیکھ کر ہمت ہار دی تو کوئی صورت ہی کامیابی کی نہیں۔

(۲۶): معصیت سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اول خود ہمت کرے اور اس کے ساتھ حق تعالیٰ سے ہمت طلب کرے، اور خاصان خدا سے بھی دعا کراتے۔ انشاء اللہ گناہوں سے بچنے کی ضرور ہمت ہوگی۔ کامیابی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ایک اپنی ہمت۔ دوسرے بزرگوں کی دعا۔ ان دونوں پہیوں سے گاڑی کو چلانا چاہیے۔ ایک پہیہ کافی نہیں۔

بندہ کو چاہیے کہ خود ہمت کرے۔ پھر اس کی تکمیل حق تعالیٰ خود کر دیتے ہیں۔ جیسے باپ جب دیکھتا ہے کہ بچہ دس قدم چلا اور گر گیا۔ تو خود ہی رحم کھا کر اس کی مدد کرتا ہے اور اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے تو جیسے باپ چاہتا ہے کہ بچہ اپنی طرف سے کوشش کرے چلنے کی اسی طرح حق تعالیٰ ہماری طلب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

(۲۷): محققین مجاہدہ میں غلو کرنے سے منع کرتے ہیں۔ حدیث میں اس کی صریح تعلیم ہے۔ اس غلو میں طبیعت بھی رک جاتی ہے اور اصل عمل بھی متروک ہو جاتا ہے اور صحت یا خراب ہو جاتی ہے یہی سبب تعطل کا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات جنون تک کی نوبت پہنچ

[illegible]

حالت ہے۔ اسی لیے ائمہ سلوک نے اتفاق کیا ہے کہ مجاہدہ و ریاضت میں اس قدر افراط و غلو نہ کرے کہ طبیعت تنگ ہو جائے یا صحت میں فتور پڑ جائے اور جن حضرات سے اس کی کثرت اور مبالغہ منقول ہے ان پر شبہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ غلبۂ شوق و قوتِ محبت میں ان کو فتور و سستی و تنگی عارض نہ ہوتی تھی۔

(۱۸)۔ بعض اوقات ذکر اور عبادت میں حلاوت اور لذت محسوس نہ ہونے سے سالک تنگدل ہو کر اس کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ یا افسردہ خاطر ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ میرا یہ عمل محض عبث اور بے سود ہے اور اس گمان سے ترقی باطنی رک جاتی ہے۔ کیونکہ اس کا بڑا مدار یقین پر ہے محققین نے تصریح فرمایا ہے کہ ذکر مقصود ہے۔ لذت مقصود نہیں۔ بلکہ لذت نہ ملنے پر برابر مشغول رہنا۔ اس میں بہ نسبت مجاہدہ کے نفع زیادہ ہے۔

باب چہارم ۔ توجہات

عن ابی ہریرۃ انہ مر بالسوق فقال اراکم ھھنا و میراث محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقسم فی المسجد فذھبوا وانصرفوا وقالوا ما رأینا شیئا یقسم رأینا قوما یقرءون القرآن قال فذلک میراث نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ رزین)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ بازار میں آئے بیٹھے ہوئے اور لوگوں سے فرمایا کہ میں تم کو یہاں دیکھتا ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث مسجد میں تقسیم ہو رہی ہے۔ یہ سن کر لوگ ادھر چلے اور پھر لوٹ آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے تو کچھ بھی تقسیم ہوتے نہیں دیکھا۔ صرف ایک قوم کو دیکھا کہ قرآن کے پڑھنے میں لگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہی تو تمہارے نبی کی میراث ہے۔

---

۱ الکشف ص ۲۴۹

اکثر بزرگوں کی تقریر و تحریر میں بعض مضامین خلافِ ظاہر پائے جاتے ہیں جن کی توجیہ و مراد سننے کے بعد بالکل صحیح و مطابقِ واقعہ کے ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی ان کا سبب غلبۂ حال ہوتا ہے۔ کبھی قصدِ اخفائے عوام سے، کبھی تشویق و ترغیبِ طالب کی، کہ ابہام سے شوقِ تعیین ہوتا ہے اور بعد شوق جو تعیین ہوتی ہے وہ اوقع فی النفس ہوتی ہے۔ اس حدیث میں اس عادت کا اثبات ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مصلحتِ تشویق کیلئے اول ابہاماً فرمایا جس سے ایہامِ معنی غیر مقصود کا ہوا حتی کہ واپسی کے بعد لوگوں نے تکذیب بھی کی۔ مگر بعد تفسیر معلوم ہوا کہ کلام صادق ہے۔ پس عبارت موہمہ دیکھ کر کسی صاحبِ کمال یا صاحبِ حال پر جرح قدح نہ کرے کہ موجبِ حرمان (یعنی باعثِ محرومی) ہے۔

(اسی طرح ایک حدیث بخاری و ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچ کر اس کی نسبت فرمایا کہ یہ انسان ہے اور ایک خط اس کے قریب کھینچ کر فرمایا کہ یہ اس کی موت ہے اور ایک خط اس سے دور کھینچ کر فرمایا کہ یہ انسان کی آرزو اور امنگ ہے۔ پس انسان اسی حالت میں رہتا ہے (کہ آرزو و پوری کر دوں) دفعتاً یہ پاس والی چیز یعنی موت آپہنچتی ہے۔

بہت سے بزرگوں کے کلام میں خصوصاً نظم میں ذات و صفاتِ حق پر کہیں دریا کا اطلاق آیا ہے کہیں آفتاب و ماہتاب کا، اور توجیہ اس کی یہ ہے کہ مقصود تمثیل و تشبیہ ہے نہ اتحاد اور تشبیہ میں کچھ محذور (ممانعت) نہیں۔ کَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ (مثل قندیل کے کہ اس میں چراغ ہو) خود قرآن مجید میں ہے۔ غایت ما فی الباب (اس باب میں زیادہ سے زیادہ) یہ کہ کوئی کلمہ دال علی التشبیہ (تشبیہ پر دلالت کرنے والا) کلام میں مذکور نہیں لیکن حذف کر دینا اس کا کلامِ فصحاء میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ سو یہ حدیث اس حذف کی تائید و تقویت میں صریح ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط کی طرف اشارہ کر کر ان کو انسان، اجل (موت)، امل (آرزو) بتلا دیا۔ کالانسان (مثل انسان) کالاجل (مثل موت)

کا اطلاق و تمثیل کہ در دو نہیں فرمایا حالانکہ مقصود یہی ہے۔ پس صحت اطلاق یقیناً ثابت ہوئی نیز بخاری و مسلم و ابوداؤد و نسائی میں بالفاظ بخاری و مسلم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دعاء نبوی میں منقول ہے کہ اے اللہ مجھ کو میرے گناہوں سے پاک کر دے پانی اور برف اور اولے سے۔

اس حدیث سے بھی اس تمثیل کا جواز ثابت ہوتا ہے کیونکہ ماء و ثلج و برد (پانی اور اولے) سے مقصود صفت رحمت ہے بجامع التطہیر (پاک کرنے میں شامل ہونے کی وجہ سے) اور چونکہ ذات اور صفات میں انفکاک و غیریت نہیں۔ جب صفات کی تمثیل کا جواز ثابت ہو گیا تو ذات کی تمثیل کا جواز بھی ثابت ہو گیا۔

اکثر صوفیہ[1] کرام کے کلام میں بعض آیتوں کے خلاف ظاہر معانی پر محمول ہونا پایا جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر ناظرین کو دو غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ بعض لوگ تو ان کا اعتقاد کر لیتے ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر یہی ہے اور علماء ظاہر نے جو تفسیر کی ہے وہ غلط ہے۔ حالانکہ یہ اعتقاد بالکل باطل اور مستلزم نار دتہ (زندیقوں) کا ہے اور اس سے تمام شریعت ناقابل اعتبار اور منہدم ہوئی جاتی ہے اور بعض لوگ ان حضرات پر طعن کرنے لگتے ہیں کہ انہوں نے قرآن میں تحریف کر دی اور تفسیر بالرائے کرتے ہیں۔ اس لیے اس کی تحقیق ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر تو وہی ہے جو علمائے مفسرین نے کی ہے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو مضمون مدلول و مقصود بالقرآن ہے۔ اس کے مشابہ کوئی دوسرا مضمون ہوتا ہے۔ تو مدلول قرآنی سے ذہن اس مشابہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جیسا زید اور عمرو میں مناسبت ہو اور زید کا حال بیان کرتے ہوں اور عمرو یاد آجائے اور اس انتقال ذہنی کی وجہ سے اس مدلول قرآنی پر اس مضمون مشابہ کو قیاس کر کے اس کے لیے بھی وہی حکم جو مدلول قرآنی کے متعلق ہے ثابت کرنے لگتے ہیں تو مقصود ان کا اس نص میں اس مضمون کا داخل کرنا نہیں ہوتا بلکہ محض قیاس و تمثیل کا قصد ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت طہر بیتی کی تفسیر ہے کہ تطہیر کعبہ سے ذہن منتقل ہوا کہ انسان میں بھی ایک چیز مشابہ کعبہ کے ہے اور وہ قلب ہے کیونکہ یہ

---

[1] التکشف ص

طرح کہ جب انوار الٰہی نازل ہوتے ہیں قلب پر بھی منعکس ہوتے ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا کہ جس طرح آئینہ کا صیقل ضروری ہے کیونکہ وہ مورد تجلیات ہے اسی طرح چونکہ قلب بھی مورد تجلیات ہے اس کی تطہیر بھی ضروری ہے اور مورد تجلیات علت مشترکہ ہے۔ اس کو علم اعتبار کہتے ہیں جس کی اجازت فاعتبروا یا اولی الابصار میں موجود ہے اور جمیع مجتہدین احکام میں اسی کا استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر اس معنی مقیس کو کوئی شخص بطنا مدلول نص کہہ دے یا یہ سمجھے کہ قیاس مظہر ہے نہ مثبت تو اس میں کوئی بات قابل مواخذہ نہیں۔ امر محقق اس باب میں یہ ہے۔ امام غزالیؒ نے بعض تصانیف میں اس کی تصریح فرمائی ہے اور بعض نے جو ان توجیہات کی تصحیح کے لیے یہ تکلف کیا ہے کہ ہر آیت کا ایک ظہر اور ایک بطن ہوتا ہے۔ جیسا علماء ظاہر نے جو کہا ہے وہ ظہر ہے اور صوفیہ نے جو فرمایا ہے وہ بطن ہے یہ تکلف نہایت بعید ہے کیونکہ ظہر اور بطن دونوں کا اس آیت کے وجوہ مختلفہ تو ہونا ضرور ہے اور ایسے نکات واعتبارات یقیناً آیت میں محتمل نہیں ہوتے۔ جب کہ ماہرین قواعد شرعیہ و عربیہ پر مخفی نہیں۔ اس لیے ان کو بطن قرآن کہنا نہایت امر مستنکر ہے بلکہ بطن سے مراد وہ معانی دقیقہ و مستنبطات غامضہ ہیں جن کو حضرات مجتہدین سمجھتے ہیں جیسا کی تفصیل اہل اصول نے وجوہ دلالات میں لکھی ہے اور ان بطون میں مراتب مختلف ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کو علماء راسخین و مجتہدین سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کو صرف حضرات انبیاء علیہم السلام سمجھتے ہیں۔ و ہکذا و فوق کل ذی علم علیم۔

خلافت و سجادہ نشینی

اکثر مشائخ کی عادت ہے کہ ابقاء فیض اور اجراء سلسلہ کے لیے اپنے اتباع میں سے کسی کو اپنا خلیفہ و جانشین کر دیتے ہیں۔ ایک کو یا متعدد کو۔ کبھی حیات میں اور کبھی بعد وفات کے۔ گو مقصود ان سب صورتوں کا مشترک و متحد ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ شخص اہل ہو۔ حدیث شریف سے اس کی اصل ثابت ہوتی ہے۔ ایک عورت حضور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور کسی امر میں گفتگو کی۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ پھر آنا۔ اس نے عرض کیا کہ اگر اس وقت آپ کو نہ پاؤں۔ مراد اس کی یہ تھی کہ اگر آپ کی وفات ہو جائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھ کو نہ پائے تو ابوبکر کے پاس چلی جانا۔ اس کو بخاری و ترمذی و مسلم نے روایت کیا ہے اور اب جو خلافت و سجادہ نشینی کا طریق متعارف ہو گیا ہے کہ کبھی شیخ کی حیات میں اور کبھی بعد وفات سلسلہ کے لوگ جمع ہو کر شیخ کے اقارب یا خدام میں سے جس کو زیادہ اختصاص دیکھا۔ گو وہ اختصاص دنیوی ہی کا ہو اور گو اس میں اس کی اہلیت نہ ہو۔ دستاربندی کر دیتے ہیں۔ یہ بالکل طریقہ کا افساد اور طالبین کی رہزنی اور عوام کی اضاعت دنیا و دین ہے۔ امام مالک نے روایت کیا کہ حضرت عمر رض نے فرمایا کہ میں اس عہدہ (خلافت) کو ایسے شخص کے حوالے نہیں کرتا جو اس کا اہل نہ ہو۔ البتہ ایسے شخص کے لیے تجویز کرتا ہوں جس کو رغبت اہلِ اسلام کی توقیر کی طرف ہو۔ سو یہ لوگ بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس حدیث سے نااہل کو خلیفہ بنانے کا ابطال ثابت ہوتا ہے۔

تعظیم منتسبینِ مشائخ

حضرت عائشہ صدیقہ رض سے روایت ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت فاطمہ رض کی حیات تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وجاہت لوگوں کی نظر میں زیادہ رہی۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو لوگوں کا رخ ذرا بدل گیا۔ اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا۔

اہل طریق کی عادت طبعیہ ہے کہ بزرگوں کے منتسبین کو محض اس انتساب کی وجہ سے معظم سمجھتے ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر حضرات صحابہ کرام میں بھی طبعاً پایا جاتا ہے۔

مہاجرت مرید برائے زجر

اکثر بزرگوں کی حکایتیں منقول ہیں کہ مرید کی کسی خلاف وضع حرکت پر اس کو نکال دیا یا اس سے بولنا چھوڑ دیا یا اور کوئی مناسب سزا دی۔ اور مقصود اس سے محض تنبیہ ہوتی ہے۔ عداوت منشا نہیں ہوتا۔ سو حدیث سے اس عمل کا مستحسن ہونا ثابت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب اور دوسرے دو صحابیوں کے غزوۂ تبوک سے رہ جانے پر مسلمانوں کو ان تینوں کے ساتھ کلام کرنے سے منع فرما دیا تھا۔

بیعت صغیر

بخاری نے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن ہشام رضہ کو ان کی ماں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی تھیں اور عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ اس کو بیعت کر لیجیے۔ آپ نے فرمایا یہ بچہ ہے پھر آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لیے دعا کی۔

بعض بزرگوں کا معمول یہی ہے (کہ بچوں کو بیعت کرنے میں عذر فرماتے ہیں) اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ بیعت احکام لازمہ کا التزام ہے اور صغیر پر احکام التزام سے بھی لازم نہیں ہوتے تو بیعت کی حقیقت ان میں متحقق نہیں ہو سکتی۔ اور بعض اوقات جو ایسا کر لیتے ہیں وہ برکت کے لیے محض صورت بیعت ہے۔

اختلاف تعلیم حسب استعداد

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روزہ دار کے لیے عورت سے ملنے کے متعلق دریافت کیا تو اس کو اجازت دے دی۔ پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے پوچھا تو اس کو منع فرمایا۔ اور ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوا کہ جس کو اجازت دی وہ بوڑھا تھا اور جس کو منع کیا وہ جوان تھا۔ (ابوداؤد)

اہل ارشاد کی عادت ہے کہ ہر شخص کو اس کی استعداد اور حالت کے مناسب تعلیم و تربیت فرماتے ہیں۔ یہ حدیث اس عادت کی اصل صریح ہے اور اخفائے تعلیم کا یہ بھی ایک نکتہ ہے تا کہ دوسرا اس کے جوش کے مارے دکھاوا کرنے لگے اور دوسرا نکتہ یہ ہے کہ مخفی تعلیم کی وقعت زیادہ ہوتی ہے اور وقعت سے اہتمام اتباع کا امر مظنون ہے۔

امتحان طالب بعنوان موحش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو عورتیں حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک بچہ کے حصول کیلئے مقدمہ لے گئی تھیں۔ آپؑ نے فرمایا کہ چھری لاؤ میں چیر کر دونوں کی تقسیم کر دوں۔ چھوٹی عورت نے عرض کیا۔ کہ اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے ایسا نہ کیجئے۔ (بڑی نے) چھوڑ دیا یہ اسی کا ہے۔ لیکن آپ نے اس چھوٹی عورت ہی کو دے دیا۔ بخاری و مسلم و نسائی نے اس کو روایت کیا۔

بعض بزرگوں کی بعض مواقع ضرورت پر عادت ہوتی ہے کہ طالب کی ارادت و اعتقاد کا اس طریق پر امتحان کرتے ہیں کہ کوئی قول یا فعل ایسا کہتے اور کرتے ہیں جس کا ظاہر باطن کے خلاف ہوتا ہے یعنی واقع میں تو وہ شریعت کے موافق ہوتا ہے اور ظاہر میں خلاف ہوتا ہے۔ جیسا شیخ ابن صدوق گنگوہی نے ایک طالب کے سامنے کہہ دیا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ صادق رَّسُوْلُ اللّٰہِ مقصود تو یہ تھا کہ رسول اللہ صادق ہیں۔ اور ظاہر میں شبہ ہوتا تھا کہ یہ ترمیم ہے رسالت میں۔ اگر طالب کم سمجھ ہوا تو بھاگ جاتا ہے اور اگر سمجھدار ہوا تو اس کا اعتقاد امتحان کا ہوتا ہے اور وہ دوسرے اقوال و افعال کو بھی دیکھتا ہے۔ اگر علامات سے کمال ثابت ہو تو ایسے امور کی اجمالاً یا تفصیلاً تاویل کر کے طلب میں ثابت رہتا ہے۔ یہ حدیث اس عادت کا ماخذ ہو سکتی ہے کہ باطن میں مقصود چیرنا نہ تھا۔ مگر غیر والدہ کے امتحان کے واسطے ایسا امر موہم ظاہر فرمایا۔

تیز مزاجی

مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کہ تیزی (بدولت حدت طبیعت کی وجہ سے) زیادہ صرف میری امت کے صلحاء و ابرار میں ہوتی ہے۔ اور اسی سند سے یہ لفظ بھی روایت ہے کہ کوئی شخص (ان مذکورہ) تیزی کا صاحب ان سے زیادہ شایاں نہیں بسبب عزت قرآن کے جو اس کے جوف میں ہے۔

بعض بزرگ زیادہ لطیف مزاج ہوتے ہیں اور اس لطافت کے سبب ان کو

۱؎ دیکھئے صفحہ ۳۹۰، ۳۵۹، ۳۵۱، ۳۷۹، ۲/۱۷۰، ۲۳۳، ۲۹۰

نامناسب امور زیادہ ناگوار ہوتے ہیں اور یہ ناگواری ان کے بشرہ یا گفتگو سے ظاہر ہو جاتی ہے
اور بعض اوقات یہ تغیر مزاج حد غضب تک پہنچ جاتا ہے جس سے بعض تنگ نظروں کو ان
پر بدخلقی کا شبہ ہوتا ہے، سو بدخلقی وہ ہے کہ حد شرعی سے تجاوز ہو جاوے ورنہ نفس حدت
(وشدت و تیزی) کا حدیث مذکور سے خلاف مصلحت نہ ہونا ظاہر ہے اور صحاح ستہ کی روایات
میں ہے کہ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے موقع بات پوچھنے تک پر غضبناک ہوتے
تھے۔ سو بزرگوں پر اعتراض کرنے میں مبادرت (وسبقت) نہ چاہئے۔

ترک مباحثہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ناحق پر ہو اور بحث
مباحثہ چھوڑ دے (اور حق کو قبول کر لے) اس کے لئے جنت
کے کنارے پر ایک گھر بنایا جائے گا۔ اور جو شخص حق پر ہو اور پھر بھی بحث و مباحثہ چھوڑ دے
(یہ سمجھ کر کہ مخاطب تو تسلیم نہیں کرتا وقت برباد ہوتا ہے اور احتمال ہے کہ شاید اپنے اندر کوئی
نفسانیت پیدا ہو جاوے) اس کے لئے وسط جنت میں گھر بنایا جائے گا (جو کہ کنارہ جنت والے
سے اچھا ہے) اور جس کے اخلاق اچھے ہوں گے۔ اس کے لیے اعلیٰ جنت میں گھر بنایا جاویگا اس کو
ترمذی نے روایت کیا۔

اکثر بزرگوں کو دیکھا گیا ہے کہ مکالمات و مخاطبات میں جب کوئی ان سے الجھتا ہے تو
باوجود اپنے حق پر ہونے کے کھلے ... سکوت فرماتے ہیں جس میں وہی مصلحت ہوتی ہے۔
جس کی طرف ترجمہ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث سے اس کا پسندیدہ ہونا معلوم
ہوتا ہے۔

تمام لباس رنگین پہننا

ترمذی و ابو داؤد و نسائی نے روایت کیا کہ حضرت ابو رمثہ
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دو سبز کپڑے (لنگی
اور چادر) دیکھے ہیں۔

بعض بزرگوں کی عادت ہے کہ سر سے پاؤں تک رنگین کپڑے پہنتے ہیں۔ سو اگر یہ
ریا ہو تب تو ظاہر ہے کہ مذموم ہے اور اگر کسی مصلحت سے ہو، مثلاً یہ کہ رنگین کپڑے میلے کم
ہوتے ہیں اور بار بار دھلوانا بھی مشغولی الی غیر اللہ مطلوب ہے تو مضائقہ نہیں۔ اس حدیث

میں بھی پورے کپڑوں کا رنگین ہونا مذکور ہے، گو ظاہر یہاں دوسرا ہو۔ مگر مصلحت پر نظر ہو تو امر مشترک ہے اور قیاس کیلئے اسی قدر کافی ہے۔

صوف پہننا

بخاری و مسلم، ترمذی و ابوداؤد نے روایت کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے ایک کمبل بہت پیوند دار اور ایک تنگی موٹے کپڑے کی نکال کر دکھائی اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی دو کپڑوں میں وفات پائی۔

بعض درویشوں کی عادت میں کمبل وغیرہ اوڑھتے رہتے ہیں اور احقر کے نزدیک عجب نہیں کہ صوفی کا لقب اسی سے ہوا ہو۔ گو اس میں دوسرے اقوال بھی ہیں اگر یہ براہ تصنع و ریا نہ ہو تو یہ حدیث اس کی اصل ہے۔

چلہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص چالیس روز تک اللہ کے لیے خلوص کے ساتھ عبادت اختیار کرے علم کے چشمے اس کے قلب سے زور شور سے جوش زن ہو کر اس کی زبان سے ظاہر ہوتے ہیں روایت کیا اس کو رزین نے۔

اکثر بزرگوں سے چلہ نشینی کا اہتمام منقول ہے۔ یہ حدیث اس کی اصل ہے۔

ضبط اوقات و اہتمام مجلس خاص و خلوت اور دربان کا مقرر کرنا

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تمہارے لئے آنے کی یہی اجازت ہے کہ تم پردہ اٹھا دیا کرو اور میری مخفی بات سن لیا کرو جب تک میں منع کروں۔

روایت ابن ماجہ۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے گھر میں تشریف لاتے تو اپنے اندر آنے کے حصہ کو تین حصے فرماتے، ایک حصہ وقت کا اللہ کے کام کے لئے (مثل نوافل وغیرہ) اور ایک حصہ اپنے گھر والوں کے حقوق ادا کرنے کیلئے اور ایک حصہ اپنے نفس کی (آرام) کیلئے، پھر اپنے حصہ کو اپنے (ضروری کاموں) اور لوگوں کے نفع پہنچانے کے درمیان تقسیم فرماتے

یہ تمام شبہات ناواقفی سے ہوتے ہیں۔

شیطان سے عدمِ امن

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے کھڑے ہوئے۔ اور اسی حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن خدا یعنی ابلیس آگ کا ایک شعلہ لایا تاکہ اس کو میرے منہ میں لگا دے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا۔ اسی حدیث میں ہے کہ اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خواہ کوئی کتنا ہی بڑا کامل کیوں نہ ہو جائے مگر اس کو شیطان سے بے فکر نہ ہو لینا چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ ہوشیار و بیدار رہے کہ کسی موقع پر اس کو لغزش نہ ہو جاوے۔ اس خبیث کی جرأت دیکھئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ عالی تک پہنچنے کا اس کو حوصلہ ہوا مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام سے گناہ نہیں کرا سکتا۔ اس لیے اضرار جسمانی ہی کی جرأت ہوئی۔

توریہ بوقت خوفِ فتنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن صیاد (دجال) سے مدینہ کے کسی رستہ میں ملے آپ نے اس سے فرمایا کیا تو میری رسالت کی شہادت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ کیا آپ میری رسالت کی شہادت دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ پر اور اس کے سب فرشتوں پر اور اس کی سب کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لایا ہوں۔ (پس جو رسول نہیں۔ اس کی رسالت کی شہادت نہیں دیتا۔ مگر آپ نے دفع فتنہ کی مصلحت سے مبہم فرمایا۔) اچھا یہ بتلا کہ تجھ کو کیا نظر آتا ہے۔ کہنے لگا کہ ایک تخت پانی پر نظر آتا ہے۔ آپ نے فرمایا تجھ کو شیطان کا تخت پانی پر نظر آتا ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا۔

بعض بزرگ کسی حاکم یا جاہل کے فساد سے بچنے کے لیے بعض باتیں مبہم فرما دیتے ہیں۔ جس سے ظاہر پرستوں کو اخفاءِ حق کا شبہ ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی مصلحت معتد بہا عند اللہ پر مبنی ہے تو وہ بالکل اسی حدیث کے موافق ہے۔

له التکشف ص ۳۷۰، ۴۴۹، ۳۴۳، ۴۶۵، ۴۹۶

کشف خلافِ شرع

حدیث (متصلہ بالا) سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ باطل کو بھی کشف ہو سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر کشف مقبول و محمود نہیں۔ چنانچہ عرش ابلیس کے انکشاف کو معرضِ مذمت میں فرمایا گیا ہے پس جو لوگ کشف کو ولایت کی علامت سمجھتے ہیں۔ یا ہر کشف پر اعتماد کرتے ہیں۔ ان پر یہ حدیث دیکھ کر دونوں امر کی اصلاح واجب ہے۔

ادبِ مردہ مثل زندہ

حضرت عائشہ رضی سے روایت ہے کہ میں اپنے اس حجرہ میں (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی مدفون تھے بے تکلف) چلی جایا کرتی تھی۔ جب حضرت عمر رضی دفن کیے گئے۔ پھر میں وہاں بدوں اس کے کہ میرے کپڑے مجھ پر خوب لپٹے ہوں (یعنی بلا پردہ) حضرت عمر رضی سے شرم کی وجہ سے کبھی نہیں گئی۔ احمد نے اس کو روایت کیا (مشکوٰۃ شریف)۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ ہر مردہ کی قبر پر حاضر ہو کر اس کا اتنا ادب کرے جتنا حالتِ حیات میں کرتا تھا۔ بشرطِ عدم تجاوز عن الشرع۔ مثلاً قبر سے اتنے فاصلہ پر بیٹھے جتنے فاصلہ سے حیات میں اس کے پاس بیٹھتا تھا۔ ونحو ذلک۔ اس حدیث سے اس کا اثبات ہوتا ہے دیکھو حضرت عائشہ رضی اگر حضرت عمر رضی کے پاس ان کی حالتِ حیات میں کسی ضرورت سے تشریف لے جاتیں تو خوب پردے میں لپٹ کر جاتیں۔ اسی طرز کی رعایت ان کی قبر پر جانے کے وقت بھی کی یہ وجہ تھی اس طرح جانے کی اور یہ معنی ہیں حیاءً من عمر کے۔

فکرِ اصلاحِ خود

حضرت ابوامامہ رضی سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تیز گرمی کے دن میں بقیع کی طرف چلے اور لوگ آپ کے پیچھے چلتے تھے۔ جب آپ نے جوتیوں کی آواز سنی تو آپ کے قلب پر یہ امر گراں گزرا پس آپ بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو اپنے آگے کر دیا۔ تاکہ کوئی اثر بڑائی کا آپ کے قلب میں خدانخواستہ نہ ہو جائے۔ اس کو ابنِ ماجہ نے روایت کیا۔

اس حدیث میں غور کرنے سے ناقص تو ناقص کاملین کی بھی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوتی ہے۔ جو زعمِ کمال کے بعد اپنی نگرانیٔ حال سے بےفکر ہو جاتے ہیں خود

سمجھ لینا چاہیے کہ ایک بار کر کے فارغ ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے بلکہ مثل مبتدی کے اہتمام اصلاحِ اعمال اور ملاحظۂ تغیرِ حال میں لگا رہنا چاہیے۔ اور اسی میں نجات ہے۔ (اللہ تعالیٰ نے فرمایا)

فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ — خدا کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آگئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔

(شعر) ما قیل (کیا خوب کہا گیا ہے) ؎

غافل مرو کہ مرکبِ مردانِ مرد را — در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندانِ بادہ نوش — ناگہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل ہو کر نہ چل کیونکہ بڑے بڑے شہسواروں کے گھوڑوں کے پاؤں سنگلاخ وادیوں میں قلم کر دیئے گئے ہیں۔ اور ناامید بھی نہ ہو کہ کبھی رند بادہ نوش ایک ہی نالہ میں منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ اپنی ہمت اور عبادت پر زیادہ ناز نہ کر کہ کبھی بڑے بڑے عابد بھی کسی ناز کے باعث راندۂ درگاہ ہو گئے ہیں۔ اور بالکل ناامید بھی نہ ہو کہ بعض دفعہ بے حد گنہگار بھی اللہ کی عنایت سے ایک ہی آہ میں منزلِ مقصود کو پا لیتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ انسان کو ہر وقت خوف اور امید کے بین بین رہنا چاہیے۔)۱؎

اسی مضمون پر (اصل) کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ خاتمہ تنبیہ ہی کے مضمون پر مناسب ہے۔ تاکہ (یہ کتاب) جن علوم و اعمال کو متضمن ہے یہ تخویف ان کی موافقت و امتثال کے لیے بیدار کر دے۔ نیز اس میں تأسی۲؎ و اقتدا قرآن مجید کا بھی ہے کہ سب سے آخر آیت اس کی یہ ہے۔

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ — اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے

اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ — جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا پورا

مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ — بدلہ ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔

۱؎ خوف کا بیان ص ۱۳۱ پر اور رجاء کا ص ۱۴۳ پر ملاحظہ ہو۔

۲؎ مشتق — اسوہ سے — اتباع۔

۱۱۔ وصایائے جامعہ

پہلی فصل۔ وصایائے غوثیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم: یہ قطب ربانی، غوث صمدانی، شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز کی وصیتیں ہیں جو آپ نے اپنے صاحبزادہ کو فرمائیں۔[1]

بیٹا! میں تجھے وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے اور خائف رہنے کی اور اپنے والدین اور جملہ مشائخ کا حق سمجھنے کی۔ کہ اس سے اللہ اپنے بندے سے راضی ہوتا ہے۔ چپکے اور کھلے ہر حال حق کی حفاظت کر اور قرآن مجید کی تلاوت مت چھوڑ۔ زبان سے اور دل سے۔ پوشیدہ اور علانیہ جس کے تدبر اور حزن و بکا کے ساتھ۔ اور سب احکام میں آیات محکمہ کی طرف رجوع کر۔ کہ قرآن مخلوق پر خدا کی حجت ہے۔ اور علم شریعت سے قدم نہ ہٹا۔ علم فقہ پڑھ۔ اور عامی اور جاہل صوفیوں میں نہ بن۔ ان بازاریوں سے جدا رہ کہ وہ مسلمانوں کے حق میں دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔ اہل توحید و سنت کے عقیدہ کو لازم پکڑ اور نئی باتوں سے بچ کہ ہر نئی بات بدعت اور گمراہی ہے۔ لڑکوں، عورتوں، بدعتیوں، دولتمندوں اور عام آدمیوں کے ساتھ صحبت نہ رکھ کہ اس سے تیرا دین جاتا رہے گا۔ قلیل دنیا پر قناعت کر اور خلوت نشینی اختیار کر۔ اور خوف سے رویا کر۔ حلال غذا کھا کہ وہ خوبیوں کی کنجی ہے اور حرام کو ہاتھ نہ لگا۔ ورنہ قیامت کے دن تجھ کو آگ لگے گی۔ حلال کپڑا پہن کہ ایمان اور عبادت کی حلاوت پائے گا۔ ہر وقت اللہ سے ڈرتا رہ اور اللہ کی بخشش میں لگا رہ۔ موت مت بھول۔ شب میں نماز اور دن میں روزوں کی کثرت رکھ۔ جماعت نہ چھوڑ۔ حکومت کا طالب مت ہو کہ جو شخص حکومت کو پسند کرتا ہے وہ فلاح نہیں پاتا۔ دستاویز پر دستخط نہ کر۔ حکام و سلاطین سے میل جول مت رکھ اور دولتمندوں کے تذکرے سے دل مردہ ہوتا ہے اور لوگوں سے بھاگ جیسے تو شیر سے بھاگتا ہے اور یکسوئی اختیار کر تاکہ تیرا

---

[1] فتوحات غوثیہ مترجم مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی ص ۱۵

دین برباد نہ ہو۔ سفر کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ سفر کیا کرو۔ تندرست رہو گے
اور مال غنیمت ہاتھ آوے گا۔ مشائخ کے قلوب کا محافظ بن اور اپنی تعریفوں پر پھول مت۔
اور جو تیری مذمت کرے اس کی بات پر رنجیدہ نہ ہو۔ مدح اور ذم تیرے نزدیک برابر ہے۔
ساری مخلوق سے کے ساتھ خوش خلقی اور تواضع برت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے
جو جھکتا ہے اللہ اسے اونچی کرتے ہیں اور جو بڑا بنتا ہے اللہ اسے نیچا دکھاتا ہے۔ ہر حالت
میں نیک و بد کے ساتھ مہذب برتاؤ کر اور ساری مخلوق کو خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے اپنے
سے افضل سمجھ اور ان کو نگاہ شفقت دیکھ۔ مخصوص کہ ہنسنا غفلت کا اثر ہے اور
اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اگر تم کو معلوم ہوتا جو
مجھے معلوم ہے تو یقیناً تم کم ہنستے اور زیادہ روتے۔ اللہ کے مکر اور تدبیر سے مطمئن نہ ہو اور
اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور خوف اور امید کے درمیان زندگی گزار۔

بیٹا: دنیا چھوڑ کہ اس کی طلب میں تیرے دین کی بربادی ہے اور نماز روزہ کا پابند
رہ۔ اور جس دن روزہ نہ ہو اس دن صاف ستھرا، پاکدامن، مائل بحق، مہذب، خدا رسیدہ،
دانشمند، صاحب علم، جاہل صوفیوں سے دور اور مال و جسم اور قدر و منزلت سے مشائخ کا
خادم بن رہ اور ان کے قلوب، اوقات اور عادات کا لحاظ رکھ اور ان کی کسی بات پر اعتراض
نہ کر۔ ہاں اگر وہ خلاف شریعت ہو تو ان میں ان کا اتباع مت کر۔ اگر ان پر اعتراض کرے گا تو کبھی
فلاح نہ پائے گا۔ لوگوں سے سوال نہ کر اور نہ ان کا مقابلہ کر۔ کل کے لیے بچا کر نہ رکھ۔ کیونکہ
رزق جتنا قسمت میں ہے اللہ دے گا اور جو تجھے اللہ نے دیا ہے اس میں نفس اور دل کا سخی
بن۔ بخل اور حسد سے دور رہ کہ بخیل اور حاسد دوزخ میں جائیں گے۔ اپنی حالت کسی مخلوق
پر نہ کھول اور اپنا ظاہر زیادہ نہ سنوار کہ یہ باطن کی ویرانی کا ثمر ہے۔ رزق کے متعلق اللہ کے
وعدوں پر اعتماد رکھ کہ ہر جاندار کے رزق کا اللہ ضامن ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے
اور کوئی زمین میں چلنے والا نہیں مگر اس کی روزی اللہ پر ہے۔ ساری مخلوق سے ناامید بن جا
اور ان سے دل نہ لگا۔ حق بات کہہ اگرچہ تلخ ہو۔ ہر ایک معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر۔ اور مخلوق
میں کسی کا آسرا نہ لے ورنہ اللہ تجھے اپنے آستانہ سے دھکے دے گا۔ اپنے نفس سے بچا۔ جو

اور سب معاصی سے توبہ خالص کرے۔ اہل حقوق کو راضی کرے۔ مال و جاہ کے نفقات کو ترک کرے۔ اپنے شیخ کی مخالفت نہ کرے۔ نہ اس پر کوئی اعتراض کرے۔ اپنے باطنی حالات شیخ سے پوشیدہ نہ کرے۔ اور کسی سے ظاہر نہ کرے۔ اگر کچھ مقصود شیخ کا ہو جائے۔ تو اس کو [illegible] کرے اور اس کا اخفا کرے [illegible] نہ کرے۔ بلا ضرورت شدیدہ سفر نہ کرے۔ بہت [illegible] نہیں کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ اپنے پیر بھائیوں پر حسد نہ کرے۔ لڑکوں اور عورتوں کی صحبت سے بچے۔ کھانا [illegible] سے زیادہ نہ کھائے [illegible] نہ کرے۔ جب تک صاحب اجازت نہ ہو کبھی کسی کو مرید نہ کرے۔ آداب شریعت کا بہت پاس کرے۔ مجاہدہ و عبادت میں سستی نہ کرے۔ تنہائی میں رہے اگر مجمع ہو [illegible] کا تعلق [illegible] کی خدمت کرے۔ اپنے سے کم [illegible] کو بزرگ سمجھے دنیاداروں کی صحبت سے پرہیز رکھے۔

تیسری فصل حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی وصایا کا خلاصہ

بلا ضرورت مصلحت دینی اغنیاء سے صحبت نہ رکھے۔ صوفیان جاہل اور جاہلان عابد اور علماء زاہدان خشک اور جو محدثین اہل فقہ سے عداوت رکھیں اور جو لوگ کہ [illegible] میں [illegible] ہیں ان سب کی صحبت سے بچے اور ایسے شخص کے پاس بیٹھے جو عارف صوفی ہو دنیا کا تارک ذکر اللہ اور اتباع سنت کا عاشق ہو۔ اور مذہب میں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دے کہ حنفیوں کا مذہب سب سے اچھا ہے یا شافعیہ کا سب سے بڑھ کر ہے۔ جیسے مذہب پر عمل کر رہا ہے۔ نہ صوفیوں کے طرق میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے کہ چشتیہ کی نسبت بڑے زور کی ہے۔ دوسرا کہے نقشبندیہ میں اتباع سنت زیادہ ہے اور اسی قسم کے خرافات سے بچے۔ جو لوگ مغلوب الحال ہیں یا کسی تاویل سے کوئی امر کرتے ہیں جو اس شخص کے نزدیک خلاف سنت ہے ان کو برا بھلا نہ کہے اور خود وہی کرے جو قواعد شرعیہ کے موافق ہے۔

چوتھی فصل حضرت سیدنا و مرشدنا شیخ العرب والعجم الشیخ الحافظ الحاج محمد امداد اللہ صاحبؒ (مہاجر مکی) کی وصایا کا خلاصہ

طالب حق پر لازم ہے کہ اول مسائل ضروری و عقائد اہل سنت والجماعت سیکھے حاصل کرے۔ پھر ان رذائل سے ترک کرے۔ حرص، بخل، غضب، جھوٹ، غیبت، بخل، حسد، ریا، کبر اور کینہ اور یہ اخلاق پیدا کرے۔ صبر، شکر، قناعت، علم، یقین، تفویض، توکل، رضا، تسلیم اور شریعت کا پابند رہے اور اگر گناہ ہو جائے جلدی کر کے نیک عمل سے تدارک کرے۔ نماز باجماعت وقت پر پڑھے۔ کسی وقت یاد الٰہی سے غافل نہ ہو۔ نعمت کا شکر بجالائے۔ کشف و کرامات کا طالب نہ ہو۔ اپنا حال یا کشف تصوف غیر قوم سے نہ کہے۔ دنیا و مافیہا کو دل سے ترک کرے۔ خلاف شرع فقراء کی صحبت سے بچے۔ لوگوں سے بقدر ضرورت خلق کے ساتھ ملے۔ اپنے آپ کو سب سے کمتر جانے۔ کسی پر اعتراض نہ کرے۔ بات نرمی سے کرے۔ سکوت و خلوت کو محبوب رکھے۔ اوقات منضبط رکھے۔ تشویش دل میں نہ آنے دے۔ جو کچھ پیش آوے حق کی طرف سے سمجھے۔ غیر اللہ کا خطرہ نہ آنے دے۔ دنیا کاموں میں نفع پہنچاتا رہے۔ نیت خالص رکھے۔ خورد و نوش میں اعتدال رہے۔ نہ اتنا زیادہ کھائے کہ کسل ہو اور نہ اس قدر کم کہ عبادت سے ضعف ہو جائے۔ کسب حلال افضل ہے۔ اگر توکل کرے تو بھی مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ کسی سے طمع نہ رکھے۔ نہ کسی سے امید و توقع کرے۔ حق تعالیٰ کی طلب میں بے چین رہے۔ نعمت پر شکر بجالائے۔ فقر و فاقے سے تنگ دل نہ ہو۔ اپنے متعلقین سے نرمی برتے۔ ان کی خطا و قصور سے درگزر کرے۔ ان کا عذر قبول کرے۔ کسی کی غیبت و عیب جوئی نہ کرے۔ عیب پوشی کرے۔ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے۔ کسی سے تکرار نہ کرے۔ مہمان نواز و مسافر پرور رہے۔ غرباء و مساکین و علماء و صلحاء کی صحبت اختیار کرے۔ قناعت و ایثار کی عادت رکھے۔ بھوک پیاس کو محبوب سمجھے۔ کم ہنسے، زیادہ روئے۔ عذاب الٰہی اور اس کی بے نیازی

۱۳۔ شجرۂ طیبہ چشتیہ صابریہ

نظمہا مولانا ذو الفقار علی الدیوبندی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰہم صل علی سیدنا و مولانا محمد و علی آل
سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم

یا ذا الکرم الانعام و الاحسان	ارحم علی العبد الفقیر الجانی
بالشیخ ناظم عصرنا اشرف علی	داعی طریقتک حامل القرآن
فبمرشدہ غوث الوری شمس الہدی	مقدام اهل العشق و الایمان
الشیخ امداد اللہ القطب العلی	الحاج ذی التمکین و العرفان
وبکاشف الظلمات نور محمد	وبسیدی عبد الرحیم الغانی
وبعبد باری ذالک شیخ شیوخنا	وبعبد هادی للزمان امان
وبحق عضد الدین حق محمد	وبمحمدی ظاهر البرهان
وبحق مولانا محب اللہ من	اعیت مدائحہ وسیع بیان
بابی سعید مادحہ متوسل	بنظام دین عارف ربانی
بجلال دین ذی المکارم والعلی	وبعبد قدوس عظیم الشان
بمحمد قطب الوری بعارف	هم للوری کالماء للظمآن
وبحق عبد الحق قدس سرہ	بجلال دین ذا کبیر اوان
بالشیخ شمس الدین قدوۃ عصرہ	بعلاء دین صابر حقانی

۔ یہ شعر جناب مولانا حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری رح نے اضافہ کیا ہے ۱۲۔

ہے منصوب بنزع الخافض ۱۲

شجرہ مختصرہ منظومہ حضرت شاہ حاجی امداد اللہ صاحب
مہاجر مکی قدس سرہٗ

حمد ہے سب تیری ذات کبریا کے واسطے
اور درود و نعت ختم الانبیا کے واسطے

اور سب اصحاب و آل مجتبیٰ کے واسطے
رحم کر مجھ پر الٰہی اولیاء کے واسطے

بالخصوص ان اولیاء باصفا کے واسطے
مولوی اشرف علی شمس الہدیٰ کے واسطے

حاجی امداد اللہ ذوالعطا کے واسطے
حضرت نور محمد پرضیا کے واسطے

حاجی عبدالرحیم اہل غنا کے واسطے
شیخ عبدالباری شہ بے ریا کے واسطے

شاہ عبدالہادی پیر حق نما کے واسطے
شاہ عضد الدین عزیز دوسرا کے واسطے

شیخ محمد اور محمدی اتقیا کے واسطے
شہ محب اللہ شیخ باصفا کے واسطے

بوسعید اسعد اہل ورا کے واسطے
شہ نظام الدین بلخی مقتدا کے واسطے

شہ جلال الدین جلیل اصفیا کے واسطے
عبد قدوس شہ صدق و صفا کے واسطے

نوٹ: یہ شعر ایک مخلص سلسلہ نے بہ تحسین حضرت حکیم الامت مجدد الملت قبلہ و کعبہ ام مولانا شاہ اشرف علی صاحب کے پڑھنے کے لیے بڑھا دیا ہے۔ شبیر علی عفی عنہ

الٰہی بحق شیخ محمد راہنما کے واسطے
شیخ احمد عارف صاحب عطا کے واسطے
احمد عبدالحق شہ ملک بقا کے واسطے
شہ جلال الدین کبیراولیا کے واسطے
شیخ شمس الدین ترک باصفا کے واسطے
شیخ علاؤالدین صابر بارضا کے واسطے
شہ فریدالدین شکر گنج بقا کے واسطے
خواجہ قطب الدین مقرب ولا کے واسطے
شہ معین الدین حبیب کبریا کے واسطے
خواجہ عثمان باشرم وحیا کے واسطے
شہ شریف زندنی باالتقا کے واسطے
خواجہ مودود چشتی پارسا کے واسطے
شاہ بویوسف شہ شاہ و گدا کے واسطے
بومحمد محترم شاہ ولا کے واسطے
احمد ابدال چشتی باسخا کے واسطے
شیخ ابواسحاق شامی خوش ادا کے واسطے
خواجہ ممشاد علوی بوالعلا کے واسطے
بوہبیرہ شاہ بصری پیشوا کے واسطے
شیخ حذیفہ مرعشی شاہ صفا کے واسطے
شیخ ابراہیم ادہم بادشاہ کے واسطے
شہ فضیل بن عیاض اہل دعا کے واسطے
خواجہ عبدالواحد بن زید شاہ کے واسطے

شیخ حسن بصری امام اولیاء کے واسطے
ہادیٔ عالم علی شیرِ خدا کے واسطے

سرورِ عالم محمد مصطفےٰ کے واسطے
یا الٰہی اپنی ذاتِ کبریا کے واسطے

بہرِ حق اپنے عاشقانِ باوفا کے واسطے
یا رب اپنے رحم و احسان و عطا کے واسطے

کر رہائی کا سبب اس مبتلا کے واسطے
کون ہے تیرے سوا مجھ بے نوا کے واسطے

ہے عبادت کا سہارا عابدوں کے واسطے
ہے عصا تیرے آہ مجھ بے دست و پا کے واسطے

بخش دے نعمت جو کام آوے سدا کے واسطے
اپنے لطف و رحمتِ بے انتہا کے واسطے

شجرۂ امدادیہ ختم شد

شجرۂ منظومہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ

یاالٰہی بہر جاہ ہر نبی و ہر ولی — بہر حضرت مرشدی اشرف علی تھانوی[1]

بہر امداد و بنور حضرت عبدالرحیم — عبد باری و عبد ہادی عضد دین مکی ولی

ہم محمدی و محب اللہ و شاہ بوسعید — ہم نظام الدین جلال و عبد قدوس احمدی

ہم محمد عارف و ہم عبد حق شیخ جلال — شمس دین ترک و علاء الدین فرید جودنی

قطب دین و ہم معین الدین عثمان و شریف — ہم بہ مودود و ابو یوسف محمد احمدی

بو اسحاق و ہم مشاد و ہبیرہ نامور — ہم حذیفہ و ابن ادہم ہم فضیل مرشدی

عبد واحد ہم حسن بصری علی مخدوم دین — سید الکونین فخر العالمین بشریٰ نبی

پاک کن قلب مرا تو از خیالِ غیر خویش
بہر ذات خود شغلم دہ ز امراض دلی

---

[1] یہ شعر ایک معتقد نے منتسبین حضرت مجدد الملت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی کے لئے بڑھا دیا ہے۔ ۱۲ محمد دین چشتی اشرفی